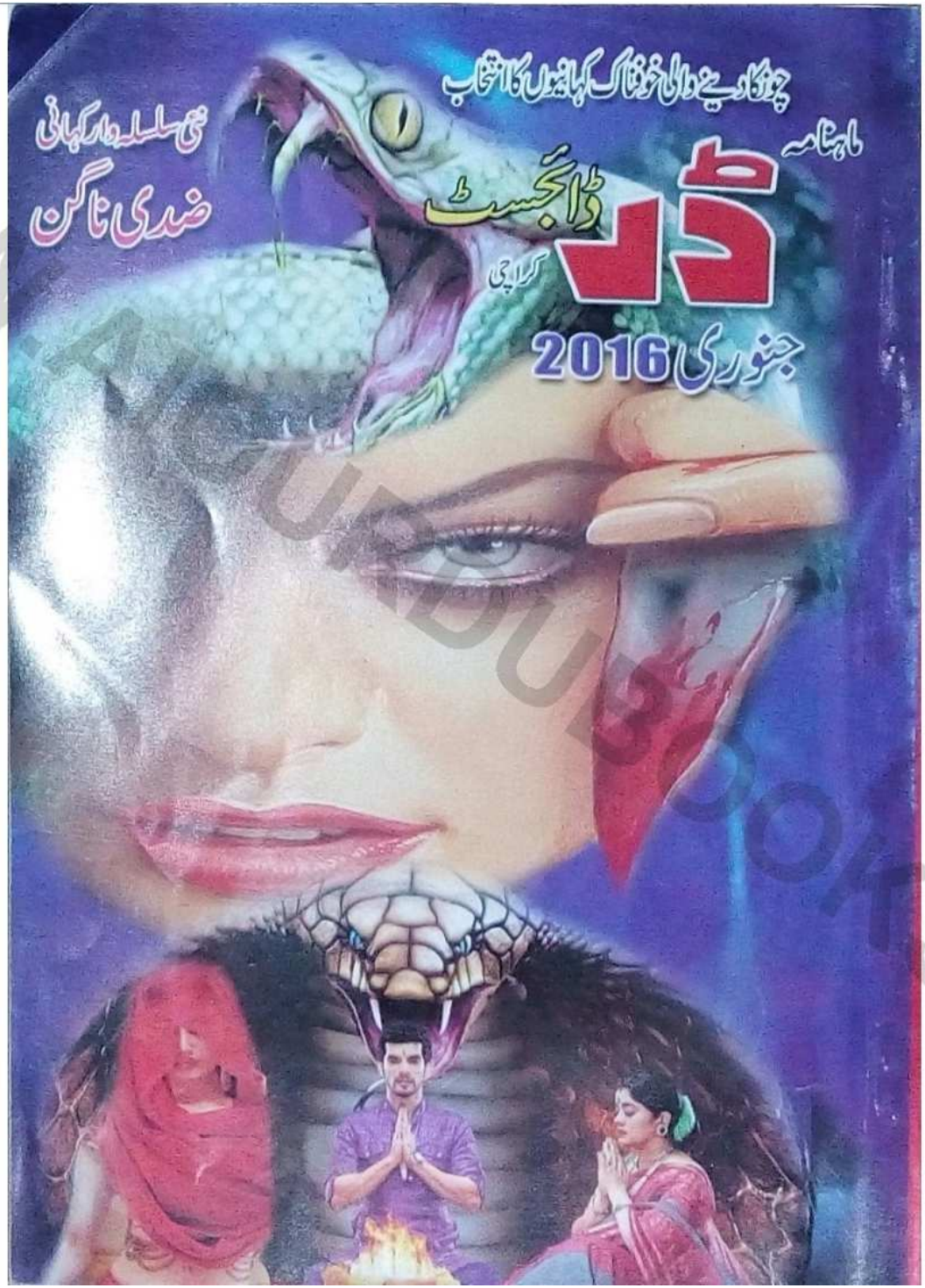

WWW.PAKURDUBOOKS.NET

Medora

Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو بھائے

تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish

میڈورا پرفیومڈ ٹالک
کی تازگی جگاتی
خوشبوؤں سے
ملے آپ کو مہکتا فریش
احساس جو رہے دن بھر
آپ کے ساتھ

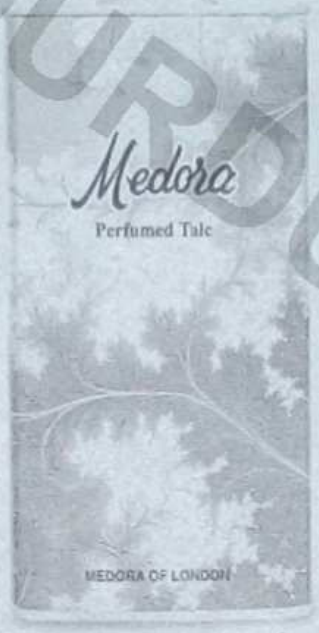

8 مختلف دلفریب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Chersih, Joy, Season, Passion جن میں

Salute اور Dignity, Greetings شامل ہیں

MEDORA OF LONDON

Medora

Matte, Semi Matte,
Glitter and Glossy
Lipsticks
with matching
Nail Polish

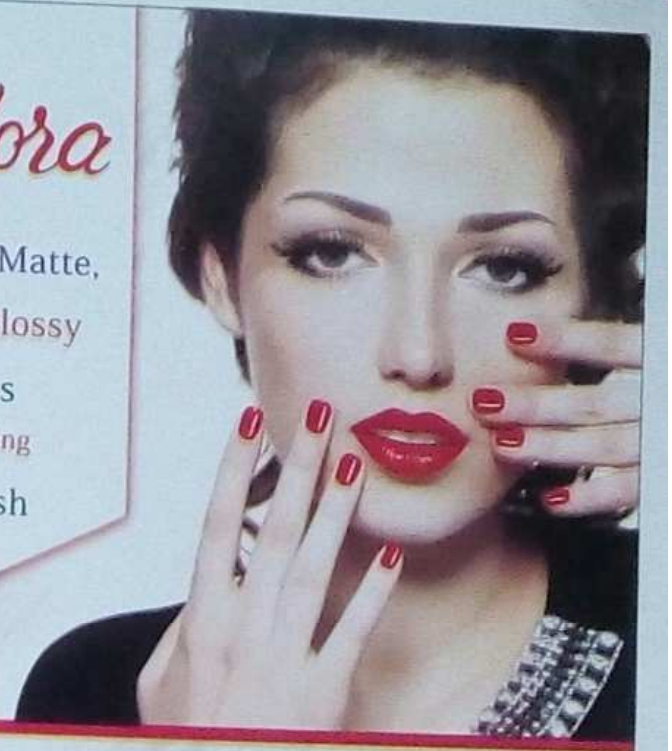

MATTE	SEMI MATTE	GLITTER	GLOSSY
IN 91 COLOURS	IN 25 COLOURS	IN 21 COLOURS	IN 28 COLOURS

Get a look that compliments your overall style with
Medora's extensive range of lip and nail colours.

MEDORA OF LONDON for a more beautiful you

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دہشت سے بھرپور پراسرار کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
خوفناک کہانیاں
کراچی

بہت جلد منظر عام پر

بہت جلد منظر عام پر

خوفناک، دہشت ناک، حیرت ناک اور خونچکاں بھونچکاں کہانیوں کے متلاشی قارئین کی پسند کے عین مطابق نیا رسالہ

ماہنامہ ''خوفناک کہانیاں''

☆اس میں خوف و دہشت کی سرد لہر پیدا کرتی، دل دہلاتی خون آشام کہانیاں

☆ارواح خبیثہ کا نشانہ بننے والوں کی کہانیاں

☆خوف و ہراس اور سطر سطر سسپنس پر مبنی، ناقابل فراموش کہانیاں جو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

ایسی کہانیاں جو کہ اسرار کے لبادے میں لپٹی، دل و دماغ پر سکتہ و لرزہ طاری کر دیں۔

کہانیوں کے علاوہ من پسند تحریر، شعر و شاعری، پھول کلیاں اور دل پسند پیغامات بھی ہوں گے۔

محترم قارئین جلد از جلد آپ اپنی اچھی تحریریں ارسال کریں تاکہ آپ کی تحریریں ماہنامہ خوفناک کہانیاں میں جلوہ گر ہو سکیں۔

تحریر پر ''خوفناک کہانیاں'' لکھنا نہ بھولئے گا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ خوفناک کہانیاں اردو بازار کراچی

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
ڈر ڈائجسٹ
کراچی

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 04 جنوری 2016ء

ای میل ایڈریس: Dardigesto1@gmail.com

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.URDUBOOKS.NET

میلانی — عمران قریشی — 16
دلکش، عجیب و غریب، اچھوتی، انوکھی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی نوعیت کی بے مثال کہانی

آسیبی آئی لینڈ — ایس امتیاز احمد — 41
قدم قدم پر لرزہ براندام کرتی موت کی دستک نے جسم و جاں کو ساکت کر دیا، خونی کہانی

مظلوم روح — محمد ابو ہریرہ بلوچ — 47
رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی دل شکستہ اور خونچکاں بھونچکاں روداد

رولوکا — اے وحید — 54
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

لکشمی — ساحل ابڑو — 87
کیا یہ حقیقت ہے کہ جانور بھی ذہین ہوتے ہیں، ثبوت کے لئے کہانی پڑھ کر دیکھیں

روح کا عشق — مدثر بخاری — 91
لفظ لفظ سے خوف ٹپکتا اور جسم و جاں کے رونگٹے کھڑے کرتی خوفناک اور حیرت انگیز ڈراؤنی کہانی

عفریت — ایس حبیب خان — 101
خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی خونی کہانی جس نے قرب و جوار کے لوگوں کو تھرا کر رکھ دیا

خونی مقابلہ — ضرغام محمود — 110
دل و دماغ کو لرزا دینے والا عجیب اور انوکھا واقعہ جو کہ پڑھنے والوں کو سہما کر رکھ دے گا

ضدی ناگن — ملک این اے کاوش — 128
خود غرضی، اور مطلب پرستی کی ناقابل یقین دل و دماغ کو تھرا دینے والی خونی کہانی

خمیازہ — مہر پرویز احمد دولو — 153
جو اپنی نفسانی خواہشات پر قابو نہیں رکھتے نشان عبرت بن جاتے ہیں۔ سبق آموز کہانی

پراسرار آواز — رضوان علی سومرو — 161
ظلم و زیادتی اور خوف کے خمیر میں گندھی ہوئی پراسراریت کے لبادے میں لپٹی کہانی

آسیبی چکر — محمد ذاکر — 175
کیا نادیدہ قوتیں بھی دل میں نرم گوشہ رکھتی ہیں...... حیرت سے دوچار دل فریفتہ کہانی

طلسم کی رات — عامر زمان عامر — 189
جسم و جاں کو تھراتی ہوئی رگوں میں خون منجمد کرتی لرزیدہ لرزیدہ حیرت انگیز کہانی

موذی بدروح — محمد خالد شاہان لوہار — 202
خیر و شر کی عجیب و غریب دل فریفتہ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دے گی

قوس قزح — ادارہ — 217
قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں......

نوے کروڑ — قاسم رضا چنیوٹ — 224
سوچ کے افق پر جھلمل کرتی رائٹر کے زور قلم کی اپنی مثال آپ شاہکار کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔ خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

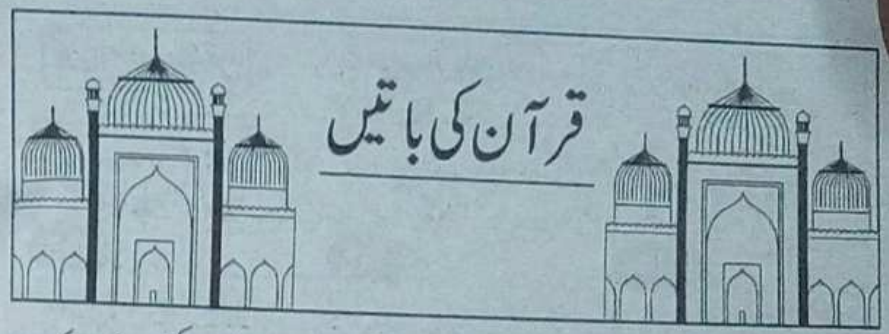

☆ اور ہم نے انسان کو، جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف برداشت کر کے پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اور آخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے، اپنے نیز اس کے والدین کے بارے میں تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے والدین کا بھی کہ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا ہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اس کے رستے پر چلنا پھر تم کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے تو جو کام تم کرتے رہے، میں سب سے تم کو آگاہ کروں گا۔ (سورۃ لقمان 31 آیت 14 سے 15)

☆ اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو یعنی پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں غلام ہوں، سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 36)

☆ اور دیکھو نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 2)

☆ اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو اور اپنے غلاموں اور کنیزوں کے بھی جو نیک ہوں نکاح کر دیا کرو اگر وہ مفلس ہونگے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا اور اللہ بہت وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو، وہ پاکدامنی کو اختیار کئے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے۔ (سورۃ نور 24 آیت 32 سے 33)

☆ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر پانی کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے۔ پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے لچھے پیدا کئے اور جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور اور زیتون کے۔ اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں، اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو ان چیزوں میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔ (سورۃ انعام 6 آیت 99)

☆ اگر ناشکری کرو گے تو اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر شکر کرو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے پسند کرے گا اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تم کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے پھر جو کچھ تم کرتے رہے، وہ تم کو بتائے گا وہ تو دلوں کی پوشیدہ باتوں تک سے آگاہ ہے اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارتا اور اس کی طرف دل سے رجوع کرتا ہے پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دیتا ہے تو جس کام کے لئے پہلے اس کو پکارتا ہے۔ اسے بھول جاتا ہے اور اللہ کا شریک بنانے لگتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کے رستے سے گمراہ کرے۔ کہہ دو کہ اے کافر نعمت اپنی ناشکری سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالے پھر تو تو دوزخیوں میں ہوگا۔ (سورۃ زمر 39 آیت 7 سے 8)

☆ اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔ وہ اگر صلح کرا دینی چاہیں گے تو اللہ ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا اور سب باتوں سے خبردار ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 33)

☆ بے شک متقی بہشتوں اور چشموں میں عیش کر رہے ہوں گے اور جو جو نعمتیں ان کا رب انہیں دیتا ہوگا، ان کو لے رہے ہوں گے بے شک وہ اس سے پہلے نیکیاں کرتے تھے رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے تھے اور اوقات سحر میں بخشش مانگا کرتے تھے اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا ہے (سورۃ ذاریات 51 سے آیت 15 سے 19)

☆ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لئے بہشت تیار کی ہے۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے جاتے بھی ہیں یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے، اس سے خوش رہو۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا امر کرنے والے، بری باتوں سے منع کرنے والے اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے یہی مومن لوگ ہیں اور اے پیغمبر مومنوں کو بہشت کی خوشخبری سنا دو۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 111 سے 113)

☆ اور کاش تم ان ظالم یعنی مشرک لوگوں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے ان کی طرف عذاب کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولا کرتے تھے، اور اس کی آیتوں سے سرکشی کرتے تھے اور جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا، ایسا ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے اور جو مال و متاع ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا۔ وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے شفیع اور ہمارے شریک ہیں آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے اور جو دعوے تم کیا کرتے تھے سب جاتے رہے۔ (سورۃ انعام 6 آیت 93 سے 94)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

www.UrduBooks.net

خطوط

محترم قارئین کرام! السلام علیکم! آپ سب کو نیا عیسوی سال مبارک ہو، صدیوں سے یہ سلسلہ چلتا آرہا ہے اور چلتا رہے گا، نئے سال کی آمد پر کچھ لوگ بہت زیادہ خوشیاں مناتے ہیں، نئے سال کی آمد میں آدھی رات یعنی بارہ بج کر چند منٹ جب اوپر ہوجاتے ہیں، تو خاص طور پر دھوم دھڑکا کے شوقین حضرات پیش پیش نظر آتے ہیں، نئے سال کے لئے کئی الفاظ بولے جاتے ہیں مثلاً ہیپی نیو ایئر، موسٹ ویلکم یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہتے سنا جاتا ہے کہ یہ نیا سال ہمارے لئے خوشیاں لائے، یہ سال ہماری خوشیوں کو دوبالا کردے، نئے سال سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، کچھ امید بندھ گئی ہیں کہ نئے سال میں ہماری ترقی کی راہیں کھل جائیں۔ جانے والا پرانا سال بہت ہی پریشان کن رہا، پرانے سال میں جان لیوا پریشانیاں رہیں، پرانے سال نے ناکوں چنے چبوائے، پرانے سال میں بہت بدحالی رہی، ناقابل یقین اور ناقابل برداشت خون خرابے سے واسطہ پڑا وغیرہ وغیرہ تو قارئین کرام!! اس قسم کی باتوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نئے آنے والے سال پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ نیا سال ہماری خوشیوں کو دوبالا کردے، ہماری زندگی کی ترقی کو دن دوگنی رات چوگنی کردے، ہمیں ہر طرح کے آرام و آسائش میں مبتلا کردے بلکہ ہم کوئی عملی قدم نہ اٹھائیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور سب کچھ نیا سال کردے، تو کیا نئے سال سے نئی امیدیں وابستہ کرنا ٹھیک ہے۔ تو اس معاملے میں ہر باشعور شخص یہی کہے گا کہ نیا سال ہمیں کیا دے گا، بلکہ نئے سال کا آنا اور پھر گزر جانا صدیوں سے چلتا آرہا ہے، اور یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔ نئے سال کا آنا اور گزر جانا یہ تو ایک واقعہ ہے جو کہ ہر قوم میں رائج ہے یعنی کسی بھی مشہور و معروف واقعہ سے وابستہ ہے اور ہر قوم کا نیا سال کسی نہ کسی ماہ میں آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ قارئین کرام! نئے اور پرانے سال میں کوئی بھی فرق نہیں، بلکہ تمام حالات واقعات، اچھائی برائی، ترقی و تنزلی، خوشی وغمی، آرام و آسائش، بدحالی و خوش حالی، ساری چیزیں ہمارے اپنے عمل سے وابستہ ہیں، ہم تمام لوگوں کا جو عمل ہوگا اس کا نتیجہ اور پھل ہمارے سامنے آئے گا۔ یعنی ہم جو بوئیں گے وہی تو کاٹیں گے ناں، اگر ہم تمام اہل وطن ملکی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنی اپنی جگہ اور اجتماعی طور پر کوششیں کرنے لگیں تو ہمارے لئے ہر دن اور ہر مہینہ نیا سال بن سکتا ہے..... نیا سال نہ ہمیں کچھ دے سکتا ہے اور نہ ہم سے کچھ لے سکتا ہے، نیا سال آجاتا ہے اور پرانا سال چلا جاتا ہے، بقول لوگوں کے ہم 31 دسمبر کی رات میں احکام خداوندی کے خلاف بہت کچھ کرتے ہیں جبکہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنی ذات کے متعلق سوچیں کہ پورے سال میں ہم نے کیا اچھا کیا اور کیا برا کیا۔ کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے اور نہ ناری

تو قارئین کرام! نئے اور پرانے سال میں کچھ نہیں بلکہ سب کچھ ہمارے اپنے عمل سے ہے۔

خالدہ علی، مینجنگ ایڈیٹر

بیناخ ایے ڈی کھڈیاں خاص سے، السلام علیکم! ڈرڈائجسٹ کی محفل میں شامل ہورہی ہوں، اپنی شاعری کے ساتھ! میں نے بہت کم عمر میں ہی لکھنے کی ابتدا کردی! اب تک چار سو کے قریب غزلیں اشعار لکھے، لیکن کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ملا! جو کچھ بھی لکھا خود لکھا! اصلاح کی ضرورت ہے! آپ نے شامل محفل کیا تو آئندہ بھی اپنی نگارشات ارسال کرتی رہوں گی!

☆☆ بیناخ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ تحریریں بھیجتی رہیں، ہمارا تعاون آپ کے ساتھ رہے گا، کوشش ہے آدمی کامیابی کی منزل پالیتا ہے، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی اب آئندہ ماہ حسب وعدہ خط ضرور لکھئے گا۔

آستر کراچی سے، السلام علیکم! بک اسٹال پر دسمبر کے ڈائجسٹ پر نظر پڑتے ہی دل خوشیوں سے اچھلنے لگا، خرید کر گھر لائی اور سرسری ورق گردانی کے لئے بیٹھ گئی، اس کے ٹھیک دو گھنٹے بعد ڈر میرے ہاتھ میں اور میں بستر پر ڈر لے کر بیٹھ گئی۔ قرآن کی باتوں کو مفصل پڑھا اور اس کے بعد ان باتوں پر غور کرنے لگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم انسان کے لئے کتنی آسانیاں پیدا کر رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ہم پر کس قدر کرم ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں ہمارے لئے پیدا کی ہیں مگر ہم انسان میں سے کچھ تو بالکل بھی احکام خداوندی سے بہت دور ہیں، چند روزہ زندگی کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رکھا ہے اور ہم یکسر بھول بیٹھے ہیں کہ انسان ہونے کے ناطے ہم پر کیا ذمہ

داریاں عائد ہوتی ہیں، زیادہ تر لوگ اپنی طاقت اور بساط کے مطابق دوسروں کو اذیت اور پریشان کرنے میں لگے ہوئے ہیں، سامان سو برس کا ہے اور پل کی خبر نہیں، کاش! کہ ہم انسان دنیا میں اپنی چند روزہ زندگی کے متعلق غور کریں تو ہماری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اور ہمیں دونوں جہان میں فلاح ملے۔ بہرحال قرآن کی باتیں بہت ہی اچھا اور ہماری زندگی کے لئے سبق آموز سلسلہ ہے اسے ہمیشہ جاری وساری رہنا چاہئے۔ ویسے دیکھا جائے تو تمام کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ انگارے اور زندہ صدیاں کا اختتام ہوا۔ اب انتظار ہے کہ ان دونوں کی جگہ کس رائٹر کی کون سی کہانی جلوہ گر ہوتی ہے۔ میری نظر میں رولا کا ازدی بیسٹ کیونکہ اب اس کی 127 ویں قسط چھپی ہے اور میں اے وحید صاحب کو مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ہاں میں تو یہ بتانا ہی بھول گئی کہ میں ایک طویل عرصہ بعد حوصلہ افزائی کی امید لئے خط لکھ رہی ہوں اور قوی امید ہے کہ میرے خط کو ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا جائے گا ماضی میں میری کئی کہانیاں ڈرڈائجسٹ میں چھپ چکی ہیں، آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے، خیر میں ڈرڈائجسٹ کے لئے دعا گو ہوں کہ ڈرڈائجسٹ کئی گنا ترقی کرے۔

☆☆ آستر صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ایک طویل عرصہ بعد ڈرڈائجسٹ کو اچھا سمجھتے ہوئے خط لکھا اور اب قوی امید ہے کہ ہر ماہ اپنا تجزیہ ارسال کرتی رہیں گی، اب ردی کی ٹوکری دفتر سے باہر پھینک دی گئی ہے، اب تو خوش ہیں ناں، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

اقراء تبسم بستی فتے والی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر سے منسلک تمام افراد خوش وخرم ہوں گے اللہ تعالیٰ ڈر کو ہر موڑ پر کامیابی عطا کرے، ڈر کی محفل میں پہلی بار شریک ہورہی ہوں مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے، ڈر سے متعارف کرانے والی میری بیسٹ کیلی اور پڑوسن رابعہ عباس ہے، ڈر ایک سال سے پڑھ رہی ہوں کیونکہ مجھے بہت ہی اچھا لگا کیونکہ اس کی تمام کہانیاں اچھی ہوتی ہیں، دیری نا کیں، ڈرڈائجسٹ کو کسی کی نظر نہ لگے اور اللہ تعالیٰ ڈرڈائجسٹ کے تمام لکھاریوں کو مزید کامیابی سے ہمکنار کرے، اگر حوصلہ افزائی ہوگئی تو آئندہ بھی اپنی تحریریں بھیجتی رہوں گی۔

☆☆ اقراء صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی، امید ہے کہ آپ حسب وعدہ آئندہ بھی ہر ماہ خلوص نامہ ارسال کرتی رہیں گی۔

وثیقہ زمری سمندری سے، السلام علیکم! 2015، جاتے ہوئے بہت بڑا دکھ دے گیا جو ساری زندگی ختم نہ ہوگا، 19 نومبر کو میری سب سے بڑی بہن کا انتقال ہوگیا جس کے چھوٹے چھوٹے چھ بچے ہیں، آپ سے اور تمام ڈر پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ پلیز! باجی کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو صبر دے اور باجی کی غلطیوں، کوتاہیوں کو معاف کرکے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، کہانیوں میں انگارے اور زندہ صدیاں کی آخری قسط ہی پڑھ سکی جو کہ میرے دل کو نہیں بھائی، اس کے علاوہ کوئی اور کہانی نہیں پڑھ سکی، آئندہ ماہ مفصل تجزیہ کے ساتھ خط ارسال کروں گی۔

☆☆ وثیقہ صاحبہ: بہن کے انتقال کا سن کر بہت دکھ ہوا، ہماری اور تمام ڈر پڑھنے والوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن پر اپنا فضل و کرم کرتے ہوئے جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور بچوں سمیت تمام اہل خانہ و قلبی رشتوں کو صبر جمیل عطا کرے، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

ثوبیہ شہزادی کھڈیاں خاص قصور سے، آداب! شمارہ نومبر ڈرڈائجسٹ ملا، ابھی پڑھ رہی ہوں! آپ نے میری کہانی مل جانے پر اطلاع دے دی بہت شکریہ! میرے خط کو بھی شامل اشاعت فرمایا اس کا بھی شکریہ! پہلی کہانی خوشبو بہت پسند آئی، اس سے نوعمر بچیوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے! بڑوں کا کہنا غور سے سن کر عمل کریں تو پریشانی سے بچ سکتے ہیں! باقی کہانیاں بھی خوب ہیں تمام خط لکھنے والوں اور آپ کو سردی کی آمد آمد اور شمارہ دسمبر کا انتظار اور پھر نئے سال کی آمد سے کو مبارکباد! ہم سب کے لئے اچھا اور خوشیوں بھرا سال لائے!

☆☆ ثوبیہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، آپ بھی نئے سال کی مبارکباد قبول کریں، اللہ کرے کہ ہم اپنی زندگی کا ہر عمل درست کرلیں اور اس طرح ہماری پریشانیاں دور ہوجائیں اور ہم بھی خوشحال قوموں میں شمار ہونے لگیں۔ آئندہ ماہ بھی آپ خط لکھنا بھولئے گا نہیں۔

رابعہ عباس بستی فتے والی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں سب خیریت سے ہوں گے اور ڈر کے انتظار میں ہوں گے، نومبر کا

www.paksociety.com

ذرمیرے ہاتھوں میں ہے، جس میں تمام کہانیاں اچھی ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام رائٹروں کو اور زیادہ زورِ قلم دے تاکہ وہ اچھی اچھی کہانیاں لکھتے رہیں۔ سارے رائٹرز خوب محنت کر رہے ہیں، قوسِ قزح میں سب اچھا لکھ رہے ہیں، اس دفعہ قدیر رانا غائب تھے، خیر میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: کہانیوں کی تعریف اور نوازش نامہ بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، اس وقت میرے سامنے 2015ء کا آخری شمارہ پڑھا ہے جو مجھے کل ہی موصول ہوا ہے، سرورق بہت جاذب نظر ہے اور کہانیاں بھی یقیناً اپنی روایت کے مطابق دلچسپ اور شاندار ہوں گی۔ کہانی پر تبصرہ توفی الوقت ممکن نہیں کیونکہ ابھی یہ تازہ شمارہ پڑھا نہیں۔ دو کہانیاں مکمل تھیں وہ اس خط کے ہمراہ عجلت میں روانہ کر رہا ہوں تاکہ وقت پر آپ تک پہنچ کر 2016ء کے اولین شمارہ میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ میں شکرگزار ہوں آپ کا...... اور سب قارئین کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔ جو میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً ذکر کروں گا ''ایس امتیاز صاحب'' کا جنہوں نے پورے ڈائجسٹ پر جامع تبصرہ کیا۔ امتیاز صاحب نے اپنے تبصرے میں میری تحریر میں جس کمی کا ذکر کیا ہے میں ان سے اس بارے میں سو فیصد متفق ہوں۔ خود مجھے یہ کمی محسوس ہو رہی ہے اور انشاء اللہ آپ سب کے پرخلوص مشوروں کی روشنی میں یہ کوتاہی دور کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ قارئین کے سامنے بہتر اور دلچسپ کہانیاں پیش کر سکوں۔ دو کہانیاں بھیج رہا ہوں امید ہے پسند آئیں گی ان میں سے ایک بعنوان ''ہم آہنگی'' انگریزی کے مشہور ادیب ''اسٹیفن کنگ'' کی ایک کہانی سے ماخوذ ہے جسے میں نے اپنے مشرقی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس میں درپیش مسئلہ ارضی حدود سے ماورا ہے اور اس کی نوعیت مشرق و مغرب میں یکساں ہے۔ ان کہانیوں پر بھرپور اور تعمیری تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ کوشش ہوگی کہ آئندہ ہر ماہ آپ سے رابطہ رہے کیونکہ پچھلے کچھ عرصہ سے میں بچوں کے عالمی ادب کی ''تین ہزار سالہ'' تاریخ مرتب کرنے میں مشغول ہوں۔ اس کا سارا مواد میں جمع کر چکا ہوں اب اس کی ترتیب و تدوین کا کام جاری ہے۔ اس کام کی تکمیل اور کامیابی میں مجھے آپ اور سب ڈر قارئین کی دعاؤں کی ضرورت ہے کیونکہ کام بہت بڑا اور نازک ہے۔

☆☆ ناصر صاحب: کہانی بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ، ویسے بھی آپ کی تمام کہانیاں پڑھنے والوں کے لئے پسندیدہ ہوتی ہیں، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب و کامران کرے اور آپ جو تین ہزار سالہ تاریخ مرتب کرنے میں لگے ہیں وہ بااحسن وخوبی مکمل ہو۔ کہانیاں لیٹ ملیں آئندہ شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے، مدیر محترم السلام علیکم! آپ اور آپ کے رفقاء کی صحت و تندرستی اور کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں، یہ میرے لئے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آپ میرے خط کا انتظار فرماتے ہیں، رب کریم آپ لوگوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ ''آمین'' ماہ دسمبر کا ڈر ڈائجسٹ پیش نظر ہے۔ ٹائٹل نہایت ہی خوب صورت ہے۔ قرآن کی باتیں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں رب العزت کے احکام پڑھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملتا ہے اور فلاح پانے کا موقع بھی میسر آتا ہے۔ خطوط کا سیکشن سب بہن بھائیوں کے مل بیٹھنے کا سیکشن ہے جس میں ہر کوئی اپنی اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرماتا ہے۔ مثبت تنقید ہوتی ہے اور لکھنے والوں کی اصلاح کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ اس ماہ میں ہر قاری نے اپنی اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ خصوصاً محترمہ آمنہ سحر نے شعر کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے نوازا ہے۔ ان کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے بارے میں خاص علم رکھتی ہیں لیکن ان کی یہ بات روا نہیں کہ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی شاعری میں شعر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ گزشتہ ماہ چھپنے والی غزلوں میں محترمہ فریدہ خانم، حکیم خان حکیم، محمد اسلم جاوید، مریم شاہ بخاری کا کلام معیاری تھا، حکیم خان حکیم جو ڈر ڈائجسٹ میں مستقل چھپنے والے شاعر ہیں ان کا کلام بہت معیاری ہوتا ہے، اس ماہ چھپنے والے کلام میں بھی حکیم خان حکیم، محمد اسلم جاوید، ایس امتیاز احمد، ماہی راجپوت کا کلام کافی معیاری ہے۔ محترمہ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوفہ شعر و شاعری ضرور فرماتی ہوں گی اگر ایسا ہے تو میری گزارش ہے کہ وہ اپنے اچھے کلام سے ہم قارئین کو ضرور مستفیض فرمائیں۔ ان کا پیغام ان لوگوں کے لئے ہے جو لفظوں کو بے ترتیب لکھ دینے کو شاعری سمجھ لیتے ہیں بڑا واضح ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنا کلام اپنے شہر کے کسی اچھے شاعر کو دکھا کر ڈر ڈائجسٹ کو بھیجا کریں اس سے ان کا اور قارئین ڈر ڈائجسٹ کا بھلا ہوگا، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب کہیں بنتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

وہ اگر اپنے پورے کلام کے لئے چھانگوں خون بھی خشک کر لیا کریں تو شاید غزل تر کی صورت بن جائے، کسی نوخیز شاعر نے میری ان باتوں کا برا نہیں منایا، انگارے کی آخری قسط نے بڑا مزا دیا، کہانی کا انجام بہت ہی اچھا تھا اور مثبت تھا۔ باقی چھپنے والی کہانیاں بھی بہت معیاری ہیں اور ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ وابستہ کہانی نگار بہت اچھا لکھتے ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

☆☆ ریاض صاحب: اچھے سوجھ بوجھ والے ہمیشہ دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اپنی اچھی باتوں سے، یہ حقیقت ہے کہ ایک دانے کی حقیقت پر ذرا غور کر...... کن کن مراحل سے گزرا ہے یہ شجر ہونے تک، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھولئے گا مت۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ دسمبر 2015ء کا خوبصورت شمارہ سامنے ہے، دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے، آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، میٹرز آپ کے پاس ہیں، پلیز دیکھئے گا! پلیز! قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے و یورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔ تمام قارئین اور تمام اسٹاف کو نیا سال مبارک۔

☆☆ امتیاز صاحب: خلوص نامہ بھیجنے کا شکریہ، کہانی مل گئی ہے، آئندہ ماہ ضرور جلوہ گر ہوگی۔

گلاب خان سولنگی راولپنڈی سے، السلام علیکم! میں ماہنامہ ڈر کا نیا قاری ہوں، پچھلے ماہ کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا، جس کی ہر تحریر سحر انگیز اور دلچسپ تھی۔ ویسے تو میں نے بچوں کے ادب کے لئے کافی سارا کام کیا ہے اور بچوں کے رسائل میں میری ڈراؤنی کہانیاں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اب ڈر ڈائجسٹ کے لئے یہ میری پہلی کاوش ہے جو کہ ڈراؤنی اور تجسس سے بھرپور دلچسپ کہانی ہے، مجھے قوی امید ہے کہ ''ڈر'' کے قارئین کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی اور آپ اسے شائع کر کے میری حوصلہ افزائی ضرور کریں گے، میری دعا ہے کہ ''ڈر ڈائجسٹ'' خوب ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ گلاب صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، کیا خوب نام ہے آپ کا، زبان سے لفظ گلاب ادا ہوتے ہی گلاب کی خوبصورتی، رعنائی، دلکشی اور تمام کی تمام پسندیدگی ذہن میں آجاتی ہے، آپ کی کہانی آئندہ ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ اب آپ دوسری کہانی جلد ارسال کریں۔ Thanks۔

محمد اسحاق انجم کنگن پور قصور سے، جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے، شمارہ دسمبر ماہنامہ ڈر ملا، 2015ء کا آخری شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ اس وقت ملا جب ادھر سردی کی آمد آمد اور کراچی میں الیکشن کی! نئے سال کی آمد کے ساتھ ہمیں جنوری 2016ء کا ڈر ڈائجسٹ جب ہمیں ملے گا اس وقت سردی تو خوب ہوگی، اور اس کے ساتھ ہی آپ نے اعلان کر دیا ہے کہ آپ ایک اور ماہ نامہ ''خوفناک کہانیاں'' لے کر آرہے ہیں خوش آمدید! موجودہ شمارہ خوبصورت کہانیوں کے ساتھ ہمارے پاس! قرآن کی باتیں کے بعد خطوط کی محفل میں بہت سارے نئے اور پرانے دوست شامل محفل ہیں! ایک ہم ہیں کہ محفل سے غائب ہو جاتے ہیں! ماہی راجپوت، پیا سحر، رابعہ علی، فلک زاہد، آسیہ سحر ایک لمبے خط کے ساتھ ایس امتیاز احمد، ساحل ابڑو اور بہت سے دوسرے ساتھی جان محفل رہے! کہانیوں میں اماوس کا شیطان، خونی بدروح، سفلی عمل، حاضرات ایس امتیاز احمد، ''مرہم'' بھی ایک خوب صورت تحریر رہی۔ زندہ صدیاں آخری قسط کے ساتھ اختتام کو پہنچی اور شہزادہ چاندزیب کی انگارے بھی! خونی نیکلس، ملک این اے کاوش کی نئی تحریر پڑھنے کو ملی بہت خوب لکھتے ہیں مبارکباد! چھوٹی چھوٹی کہانیاں پراسرار تاریکی، ہوائی وجود، آسیب کا وجود، بری آنکھیں، حویلی کی بدروح بھی پسند آئیں رولوکا، اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے! سب کو نیا سال خوشیوں سے بھرا ملے اس دعا کے ساتھ اجازت! پھر حاضر محفل ہوں گے۔

☆☆ اسحاق صاحب: اور سنائیں، آپ کی طبیعت کیسی ہے، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے، اور خوشیوں سے نوازے، آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا، اب آئندہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ۔

بابر علی رند بلوچ بھوئے دی جھوک ساہیوال سے، السلام علیکم! دسمبر 2015ء کا ڈر ڈائجسٹ پڑھا، بہت اچھا لگا، ڈر ڈائجسٹ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، میں ایک طویل عرصہ سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں، مگر خط پہلی مرتبہ ارسال کر رہا ہوں، نئے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سال کی مبارکباد کے ساتھ، میری طرف سے ڈر کے تمام اسٹاپ اور تمام قارئین کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم تمام پاکستانیوں کو خوشیوں سے نوازے اور ہمارے وطن سے تمام پریشانیاں! تمام خرابیاں دور کردے اور ہمارے پاکستان کو خوشحال بنادے، ہمارے ملک سے ہر طرح کی دہشت گردی، خون خرابہ ختم کردے تاکہ ہم سکھ کا سانس لے سکیں اور یہ بھی میری دعا ہے کہ ڈرڈائجسٹ خوب ترقی کرے۔ (آمین)

☆☆ بابر صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، آپ کی ارسال کردہ تحریریں شامل اشاعت ہیں، آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو اور اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی دعا قبول کرے اور ہمارے ملک میں خوشیوں کا راج ہو۔

سید عبادت کاظمی ڈیرہ اسماعیل خان سے، السلام علیکم! ڈرڈائجسٹ کے تمام چاہنے والوں کو میرا سلام، سرورق بہت شاندار تھا سب کے خط بہترین تھے قاسم کا خط اچھا لگا، اماوس کا شیطان، ایمان کامل، خونی بدروح، سفلی عمل، رد لوکا، حاضرات، مرہم، سنسان قبرستان اچھی لگی، انگارے کی آخری قسط بہترین رہی، غزل کی اشاعت کا شکریہ، ایک کہانی اذیت بھیج رہا ہوں، پہلی دفعہ لکھنے کی جسارت کی ہے۔

☆☆ عبادت صاحب: خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور کہانی بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں، کوشش جاری رکھیں، ایک دن آپ بھی لکھاری بن جائیں گے۔

نعیم اللہ بڈالی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ ڈرڈائجسٹ دسمبر کا شمارہ 23 نومبر کو ملا۔ تمام کہانیاں ابھی پڑھی نہیں امید ہے اچھی ہوں گی، میں نے اب ایک نئی کہانی ''آسیب زدہ مسافر خانہ'' ارسال کی ہے۔ مہربانی فرما کر اسے قرعہ شمارے میں جگہ دیں۔ یہ فل ہارر ہے اور اصلاح طلب بھی نہیں۔ پلیز! اس کہانی کو قرعہ شمارے میں جگہ دیں۔ امید ہے کہانی قرعہ شمارے میں شائع کرکے حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆☆ نعیم صاحب: خط لکھنے اور کہانی بھیجنے کا شکریہ، محترم آپ نے اپنی رائٹنگ میں ایک لائن چھوڑ کر ساڑھے پانچ صفحات کی کہانی بھیجی ہے جو کہ ڈر کے دو صفحات بھی نہیں بنیں گے، کہانی بڑی کرکے ارسال کریں، کم از کم پندرہ صفحات ہوں۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، کچھ دنوں بعد شہر گیا تو بک اسٹال پر ماہ دسمبر 2015ء ڈرڈائجسٹ کا پرچہ ہمارے انتظار میں تھا۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنا اس مہنگائی کے دور میں آپ ہی لوگوں کا کام ہے میں اس کا بہت پرانا قاری ہوں۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا جسے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی پرچے کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہتر تھے خط، شعر، غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، ہر ماہ پرچے کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ آپ کا خلوص اور نظر عنایت ہی سے سرشار ہو کے ہم آپ کو خط تحریر کرتے ہیں، اپنی مصروفیات سے وقت نکال کے آئندہ بھی نئے سال 2016ء میں آپ کا میرے ساتھ بھرپور تعاون ہوگا۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ غزل ارسال کر رہا ہوں، کسی قرعہ شمارے میں جگہ دے دیں۔ اس گزرتے ہوئے سال نے ہمیں وہ زخم دیئے کہ دکھا نہیں سکتے، دامن میں خوشیوں کے بجائے آنسو ہی تھے زندگی کی داستان کیا سنائیں، پس چپ ہی بھلی کسی پل بھی کوئی راحت نہیں سکھ کوئی نہیں، ہر طرف مہنگائی کا سماں ہے، معاشی حالات بھی کچھ اچھے نہیں، ویسے آج کل زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہوگیا، جاتے ہوئے سال میں کھویا بہت کچھ ہے مگر پایا کچھ نہیں۔ نیا آنے والا سال 2016ء قارئین اور ہم سب کے لئے خوشگوار یادیں لے کے آئے، ہم سب کو نیا سال 2016ء مبارک ہو، ہر دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا نوازش نامہ پڑھ کر دل کو سکون ملا، پرانے سال کے متعلق آپ کی تمام باتیں درست ہیں، اللہ کرے کہ نیا سال سب کے لئے خوشیوں اور آرام و سکون اور مہنگائی سے جان چھوٹنے کا سال ثابت ہو، لیکن اصل میں ہم لوگ اور ہمارا ملک صرف ہمارے اپنے عمل سے ہی خوشیوں کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر نظر کرم کرکے خوشیوں سے نوازے۔

رضوان قیوم راولپنڈی سے، دسمبر 2015ء کا ڈر پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، طویل عرصہ بعد محفل دوستاں میں شامل ہو رہا ہوں۔ میں خیریت سے ہوں، امید کرتا ہوں آپ اور تمام قارئین بھی خیریت سے ہوں گے، دیگر احوال یہ ہے کہ کافی عرصہ بعد ڈرڈائجسٹ کے لئے کمپوز شدہ پراسرار نوعیت کی کہانیاں روانہ کر رہا ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

☆☆ رضوان صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ڈرڈائجسٹ کو عزت بخشی اور کمپوز شدہ کہانیاں ارسال کیں اور قوی امید ہے کہ ہر ماہ تجربہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں، کہانی اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ Thanks۔

قاسم رحمان ہری پور سے، دسمبر کے ڈر نے 27 نومبر کو اپنے درشن کروائے، ٹائٹل اچھا تو تھا مگر ہارر نہیں تھا۔ خوفناک کہانیاں کا اسکیچ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا ہم اس رسالے کے لئے کچھ تخلیق کر سکتے ہیں۔ حوصلہ افزائی ہوگی؟ خطوط میں جن لوگوں نے کہانی کو پسند کیا، ان کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں، آمنہ سحر کی تمام باتیں ٹھیک تھیں۔ زندہ صدیاں اور انگارے اختتام پذیر ہوئی۔ نئی کہانیوں کا شدت سے انتظار ہے۔ اماوس کا شیطان اور خونی ٹیکلس، سنسان قبرستان اور مرہم زبردست کہانیاں تھیں، اپنی کہانی ''ڈائن کی سرگوشی'' کا شدت سے انتظار ہے اور میں نے اس تحریر پر بہت محنت کی ہے، امید ہے کہ فروری کے ڈر کے شمارے میں کہانی ضرور شائع ہوگی۔ کیوں کہ 10 فروری کو میری برتھ ڈے ہے۔ اب اجازت۔

☆☆ قاسم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، فکر نہ کریں پوری کوشش ہوگی کہ فروری کے شمارے میں آپ کی کہانی شائع ہو جائے۔

اسد اللہ بھٹی بھکر سے، السلام علیکم! سب سے پہلے تمام رائٹرز و قارئین اور ایڈیٹر صاحب کو میری طرف سے نیا سال بہت بہت مبارک ہو، انشاء اللہ یہ سال ہمارے لئے خوشیوں کا گہوارہ ثابت ہو اور پاکستان ایک مرتبہ پھر خوشحالی کی طرف گامزن ہو۔ دسمبر کا شمارہ ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔ ٹائٹل خوبصورت تھا مگر ڈر کے مطابق نہیں تھا۔ اندر جھانکا تو آپ کی طرف سے ایک اور رسالے کی پیشکش تھی۔ خوفناک کہانیاں ہماری دعا ہے کہ جلد سے جلد مارکیٹ میں جلوہ گر ہو۔ قرآن کی باتیں پڑھیں جو دل کو اچھی لگیں اور کچھ پرسکون ہوئے اور اگلا صفحہ پلٹا تو فہرست تھی جس میں اپنے پیارے رائٹرز جن کی بدولت آج ہم ڈر پڑھ رہے ہیں، وہ محمد خالد شاہان جن کی کہانی ''حویلی کی روح'' پڑھی بہت اچھی کہانی تھی، باقی کہانیاں غیر مطالعہ ہیں ان کا تبصرہ اگلے ماہ کریں گے۔ خط کے ساتھ چند کہانیاں ارسال کر رہا ہوں، شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆☆ اسد صاحب: ارسال کردہ کہانیاں ابھی پڑھی نہیں، کوشش ہوگی کہ اصلاح کرکے شائع کردیں۔ خیر آپ اپنی کوشش جاری رکھیں یعنی نئی نئی کہانیاں لکھتے رہیں، ایک دن آپ بھی ایک اچھا رائٹر بن جائیں گے۔

محمد ابوہریرہ بلوچ بہاولنگر سے، السلام علیکم! بفضل خدا سلامت ہوں اور سب کی صحت کے لئے دعا گو ہوں، دسمبر کا شمارہ 23 نومبر کو موصول ہوا، ٹائٹل پر بیٹھی حسینہ لاجواب تھی، قرآن کی باتیں پڑھ کر سکون ملا، مگر آپ نے دو تین مزید کہانیاں لکھنے کا حکم صادر فرمادیا۔ ایک نئے لکھاری کے لئے اتنے کم وقت میں اتنی کہانیاں لکھنا جو اشاعت کے قابل ہوں یقیناً مشکل کام ہے۔ لیکن پھر بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اگلے ماہ تک آپ کا مطلوب پورا کردوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے نعیم بخاری آکاش کی اماوس کی رات پڑھی زبردست تھی عمدہ لکھا، طارق محمود کی ایمان کامل سبق موز تحریر تھی۔ طاہرہ آصف کی مرہم، خالد شاہان کی حویلی کی بدروح بھی کمال کی تھی۔ نئی قسط دار کہانی کا شدت سے منتظر ہوں۔ غزل اور شعر لگانے پر مشکور ہوں۔ رسالے کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ ابوہریرہ صاحب: خوش ہو جایئے آپ کی مظلوم روح جلوہ گر ہوگئی، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی، میرے کہنے کا اصل مقصد تھا کہ کہانی لکھتے رہیں، بیٹھ نہ جائیں، امید ہے آئندہ بھی نوازش نامہ ضرور ارسال کریں گے۔

اویس نور میر پور ماتھیلو سے، محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم!!! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ محترم! میں نے آپ کا رسالہ ''ڈرڈائجسٹ'' پہلی دفعہ پڑھا ہے، مجھے بہت اچھا لگا۔ اس رسالے کی پہلی خوبی جو مجھے اچھی لگی وہ یہ کہ رسالے کے شروع میں سب سے پہلے قرآن کی باتیں تحریر ہوتی ہیں۔ باقی پورا رسالہ زبردست رہا۔ مجھے خاص کر ''موت کا تعاقب'' ''بھیانک انجام'' اور ''اجر صبر'' کہانیاں بہت ہی اچھی لگیں۔ شاعری بھی سب زبردست تھیں۔ میں پہلی مرتبہ ''ڈرڈائجسٹ'' میں اپنی شاعری بھیج رہا ہوں۔ امید ہے میری شاعری ''ڈر'' میں شائع کرکے حوصلہ افزائی کریں گے۔ کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔

☆☆ اویس صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی، امید ہے آئندہ بھی اپنی تحریر ارسال کرکے شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔ Thanks۔

☆☆

www.Paksociety.com

میلانی

عمران قریشی-کوئٹہ

سورج کی شعاعوں کے سامنے بلند و بالا بھا سینہ تانے کھڑا تھا اس لئے اس کی شعاعیں بہت کم وقت کے لئے تالاب تک پہنچنے میں کامیاب ہورہی تھیں کہ اچانک ہی دل میں اترنے والی پائل کی روداد سنائی دی اور پھر.....

دلکش، دلفریب، اچھوتی، انوکھی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی نوعیت کی بے مثال کہانی

اس صبح میری آنکھ کچھ تاخیر سے کھلی۔ ناشتے کے دوران غیر متوقع طور پر شہر بابانا کی بنجر و بیابان پہاڑیوں کی طرف جانے والی سیاح پارٹی مکان کے دروازے پر علی الصباح وارد ہوئی۔ میں نے اپنی پہلی بیوی جوان دنوں سوتن کے رشتے سے قطع نظر میری اکلوتی بیوی کا اختیار رکھتی تھی۔ اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ۔ ''وہ سعدیہ کو اسکول چھوڑ آئے۔ میری واپسی مغرب سے کچھ پہلے ہی متوقع ہوگی۔'' اس کے خوب صورت اور صبیح چہرے پر میری متوقع آمد کی اطلاع کے متعلق سننے کے بعد خوشی کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ میں نے اسے یکسر نظر انداز کردیا یہ تو روز کا ہی معمول بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی خوشی ناخوشی میری عدم موجودگی میں پوشیدہ تھی۔

بہر حال مکان کے دروازے کے باہر سیاح پارٹی میری منتظر تھی۔ ان کی تعداد چھ کے ہندسے پر منحصر تھی۔ بات چیت کا آغاز اگر شروع سے کروں۔ تو ابتداء کچھ یوں ہوئی تھی۔ میں نے مرد سے استفہامیہ لہجے میں آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب اس نے باغیچے کے پاس کھڑی ہوئی میری جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تمہاری ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا تمہیں سفر کے لئے درکار ہے؟'' اس نے بھی اقرار میں سر ہلایا، اور ساتھ کھڑی اپنی ٹیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہماری مختصر ٹیم کو شہر بابانا کی پہاڑیوں تک کے لئے درکار ہے۔ اگر چلنا چاہو تو معاوضہ بتادو۔''

میں نے اسے معاوضہ بتادیا۔ انہوں نے ادائیگی کے بعد اپنے سفری تھیلے اور دیگر سامان وغیرہ جیپ میں منتقل کردیئے۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اپنا قصبہ جس کا نام مصری شاہ کے نام سے منسوب ہے اس سے باہر جانے والی سڑک کی طرف موڑ دی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا؟ اور روزگار زندگی کی ابتداء ہونے لگی تھی۔ سڑک نے گھومتے ہوئے مختصر پہاڑی علاقے کا رخ کیا۔ یہی سڑک شہر بابانا کی طرف پیش رفت کا ذریعہ تھی۔ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔

سیاح حضرات کی دلچسپی کا مرکز مصری شاہ کے مخالف جانب واقع پرانا میوزیم یا پھر وسیع و عریض کھنڈرات سے مزین علاقہ تھا۔ جسے ابوالذوق کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ موجودہ سیزن کے دوران شاید یہ پہلی پارٹی تھی۔ جس نے ابوالذوق کو نظر انداز کرتے ہوئے

شہر بابانا کی خشک و بنجر پہاڑیوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا تھا۔ شہر بابانا کی تاریخ ان بے راہ رویوں اور عیاشیوں سے منسوب کی جاتی تھی جو عذاب الٰہی سے قبل اس شہر کا خاصہ تھیں۔ یہاں عورتوں کی نیلامی کا سلسلہ عام تھا۔ گھر گھر شراب بنائی جاتی تھی اور سور کا گوشت سرعام بیچا جاتا تھا۔ یعنی بے راہ روی کا یہ عالم پایا جاتا تھا کہ وہ ان گناہوں کو گناہ سے تشبیہ نہیں دیتے تھے۔ جنہیں اسلام میں ممنوعہ قرار دیا گیا ہے۔ پھر عذاب الٰہی کے طور پر شہر پر زلزلہ نازل ہوا۔ تمام شہر نیست و نابود ہو کر رہ گیا۔ اگر کچھ باقی بچا تو وہ شہر کے مختصر آثار تھے۔ جنہیں سیاح عبرت کی نگاہ سے دیکھنے کی نیت سے کبھی کبھار شہر بابانا کے مختصر کھنڈرات کا رخ کرتے تھے۔ ورنہ عام حالات میں وہاں جانے سے سیاح بھی گریز کرتے تھے۔

بہرکیف جیپ میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ سیاحوں نے پچھلی سیٹوں پر براجمان ہونے کے فوراً بعد خرائے لینے شروع کر دیئے تھے۔ سفر نہایت بوریت کے دوران گزرنے لگا۔ دوپہر کے دو بجے ہم شہر بابانا کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں چیتل چٹانوں کا لامتناہی سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سیاحوں پر مشتمل ٹیم کے ارکان کو بیدار کرتے ہوئے وہ جگہ دریافت کی۔ جہاں انہیں اترنا مقصود تھا۔ ان میں سے ایک نے پہاڑی سلسلے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں کیمپنگ سائٹ کہاں دستیاب ہو سکتی ہے؟''

میں بے اختیار مسکرایا۔ پھر پہاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس چیتل ویرانے میں دور دور تک آبادی موجود نہیں ہے کہیں پر بھی کیمپنگ کر لو۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم لوگ یہاں کیسی سیاحت کے لئے آئے ہو۔ یہاں قابل دید مقامات یا قومی تہذیب سے متعلق آثار نہ ہونے کے برابر ہی موجود ہیں جسے دیکھنے کے لئے کوئی سیاح یہاں کا رخ کرے۔ آپ لوگوں کو ابوالذوق کی جانب رخ کرنا چاہئے۔''

مرد بولا۔ ''کیا شہر بابانا کے وہ مختصر آثار ان پہاڑیوں میں موجود نہیں ہیں۔ جسے دیکھنے کے لئے کوئی سیاح یہاں کا رخ کرے۔ ہمارے لئے وہ قابل دید ہیں۔''

میں نے جیپ سڑک کے کنارے لگے سیب کے درختوں کے پاس روک دی۔ پھر پہاڑوں پر اوپر کی جانب جاتے ہوئے مختصر اور کچے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہی راستہ شہر بابانا کے کھنڈرات کی طرف جاتا ہے۔ اگر واپسی کے لئے جیپ درکار ہو تو مجھے وقت سے پہلے مطلع کر دینا۔ میں لینے کے لئے آجاؤں گا۔'' مرد نے انکار میں سر ہلایا اور معاوضے کی ادائیگی کے بعد وہ سب اپنے سفری بیگ اٹھائے شہر بابانا کی طرف جانے والی پگڈنڈی کے اوپر چڑھنے لگے۔

میں نے جیپ کو موڑا اور مصری شاہ کی طرف واپسی کے سفر کا آغاز کیا۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ مصری شاہ اور شہر بابانا کا درمیانی فاصلہ ایک سو بیس کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا لیکن ان دونوں کے درمیان موسم میں نہایت تضاد پایا جاتا تھا۔ مصری شاہ میں موسم معتدل تھا جبکہ یہاں دوپہر کے دو بجے آگ برسنا شروع ہو جاتی تھی۔ سردی ہو یا گرمی یہاں موسم یکساں ہی رہتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میں نے متعدد سیاحوں کو اس شہر تک لانے کا ارادہ کیا تب مصری شاہ میں طوفانی بارش یا پھر برف باری جاری تھی۔ لیکن جب ہم شہر بابانا کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے تب سورج سوا نیزے پر چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ گرمی کی بدولت جسم پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے میں اس وقت بھی دوچار تھا۔ میرا جسم پسینے میں نہانے لگا، اور حلق سوکھ کر کانٹا ہونے لگا تھا۔

شہر بابانا کی ان طویل و عریض پہاڑیوں کے درمیان اندر جاتے ہوئے ایک مخدوش سے راستے کی طرف میں نے جیپ کو موڑ دیا۔ یہ راستہ کافی آگے جا کر ایک پہاڑی آبشار پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ یہاں

چند درخت کھجوروں کے پائے جاتے تھے۔ جس کی بدولت ایک مختصر نخلستان کی صورت نمایاں ہوتی تھی۔ یہ درخت جنگلی ہونے کے باوجود نہایت رس بھرے پھل کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ لیکن ان کے پھلوں سے استفادہ حاصل کرنے والا کوئی ذی روح اردگرد موجود نہیں تھا۔ کھجور کے ان درختوں کی بدولت اس تالاب نما چشمے کا نام کھجوری تالاب رکھ دیا گیا تھا۔

بہرحال جیپ نے دھول اڑاتے ہوئے کھجوری تالاب کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ سڑک کے دونوں جانب خشک جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ دور اس پہاڑی علاقے کے مختصر آثار دکھائی دیتے تھے۔ جہاں آبشار بہتی تھی میں نے جیپ کی رفتار کو تیز کرتے ہوئے جیب سے رومال باہر نکالا، اور ماتھے پر نمودار ہونے والے پسینے کو صاف کرنے کے بعد رومال کو واپس جیب میں رکھ لیا۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں کے درمیان میری جیپ ہچکولے کھاتے ہوئے آگے سفر کر رہی تھی وہ بنی ہی ایسے دشوار گزار علاقوں کے لئے تھی اس کے لئے پہاڑی دشواریاں کچھ خاص معنی نہیں رکھتی تھیں۔ صرف پندرہ منٹ میں جیپ نے وہ طویل راستہ عبور کر لیا۔ جسے عبور کرنے کے لئے عام گاڑی کو گھنٹے تک کا وقت درکار تھا ایک پہاڑی موڑ مڑتے ہی جیپ مختصر نخلستان نما علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں راستے کا اختتام ہو رہا تھا۔ سامنے آبشار کے ٹھنڈے پانیوں کا کنواں نما تالاب بنا ہوا تھا۔ جس کے گرد کھجوروں کے دس بارہ درخت ایسے ایستادہ تھے جیسے تالاب کی حفاظت پر انہیں مامور کر دیا گیا ہو۔ میں نے جیپ کو درختوں سے کچھ پہلے روک دیا۔ اور اتر کر تالاب کی طرف چلا آیا۔ یہاں گرمی کا زور کم تھا۔ سورج کی شعاعوں کے سامنے بلند و بالا پہاڑی سلسلہ سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس لئے اس کی شعاعیں براہ راست کھجوری تالاب تک پہنچنے میں بہت کم وقت کے لئے کامیاب ہوتی تھیں۔ تالاب کا پانی برف کی طرح سرد تھا میں نے جی بھر کر پانی پیا۔

تب مجھے اچانک ہی پائل کی جھنکار کی آواز سنائی دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا میں نے یہ سوچ کر خیال کو دماغ سے نکال دیا کہ شاید یہ میرا وہم تھا۔ اس ویرانے میں بھلا کون پائل پہن کر گھوم پھر سکتا تھا۔

بہرحال گرم علاقے سے سرد ترین نخلستان میں داخل ہونے کے بعد مجھ پر غنودگی کا عالم طاری ہونے لگا۔ اس لئے میں چند لمحے آرام کی نیت سے کھجوروں کے درختوں کی طرف چلا آیا۔ میری جیپ میں ایک موٹی دری ہر وقت موجود رہتی تھی۔ میں نے اسے نخلستان کی سرد زمین پر بچھا دیا۔ اور لیٹتے ہی سو گیا۔ لیکن میری نیند میں آسودگی نہیں تھی۔ بے چینی کا عنصر زیادہ تھا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے کوئی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہو۔ میں ابھی اٹھنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے دوبارہ پائل کی جھنکار کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا یا تھی۔ کیونکہ عموماً پائل لڑکیاں ہی پہننے کا شوق رکھتی ہیں میری طرف پیش رفت کر رہی تھی۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ پائل کی جھنکار یکدم رک گئی۔ میں نے اٹھنے کی کوششیں کی۔ لیکن ابھی اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے دو نہایت متناسب ٹانگیں اپنے سر کے قریب معلق دکھائی دیں۔ نہ جانے یہ میرا وہم تھا یا پھر حقیقت تھی وہ زمین سے کچھ نہ کچھ بلندی پر ضرور تھیں اور چونکہ میرے سر کے پیچھے تھیں اس لئے مجھے الٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سفید رنگ کے چست پاجامے میں ملفوف تھیں اور پائل ٹخنوں سے کچھ نیچے لٹک رہی تھیں۔ پھر مجھے نہایت مترنم ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

میں بوکھلا کر عجلت کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے پیچھے کی طرف مڑتے ہوئے اس کے سراپے پر نگاہ دوڑائی۔ وہ بے اختیار انداز میں ہنستی چلی جا رہی تھی۔ سفید کرتہ اور سر پر موجود سفید دوپٹہ اس کے چہرے کو ہالے کی صورت میں گھیرے ہوئے تھا۔ اس کے سیاہ ریشمی بال کمر سے نیچے تک لٹک رہے تھے۔

اور جسم کی بھینی بھینی خوشبو ماحول کو معطر کر رہی تھی۔

اس کی خوبصورتی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔

میں نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم......؟'' اور اس ویرانے میں اکیلی کیا کرتی پھر رہی ہو؟

جواب دینے کے بجائے وہ پیٹ کو تھام کر باقاعدگی کے ساتھ ہنسنے لگی۔

مجھے اب جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے یوں ہنستے چلے جانے کی وجہ میری عقل سے بالاتر تھی۔ بظاہر وہاں کوئی بھی ایسی بات دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جس کو دیکھ کر ہنسا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ متواتر ہنس رہی تھی۔

میں نے زمین پر بکھری ہوئی چادر کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ تبھی اس کی ہنسی میں کمی واقع ہونے لگی۔ لیکن اس نے ہنسنا اب بھی بند نہیں کیا تھا۔ اب اس کی آنکھوں سے پانی بھی بہنے لگا تھا۔ مجھے اب اس پر غصہ آنے لگا۔ میرے لئے ہنسنے کی وجہ دریافت کرنا ضروری نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا اور جیپ کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس نے ہنسنا بند کر دیا۔ پھر جیسے مندر کی جلترنگ گھنٹیاں بجتی ہیں کچھ ان گھنٹیوں سے مشابہ آواز نخلستان کے رومان پرور ماحول میں گونجی۔

''ہنسنے کی وجہ معلوم کئے بغیر جا رہے ہو؟'' لڑکی بولی۔

میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہاری ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی۔ وجہ کیا خاک بتاؤ گی۔''

اس نے دوبارہ ہنسنا شروع کر دیا میں نے گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھما دی گاڑی کے انجن نے غرا کر جھرجھری لی۔

وہ یکدم بولی۔ ''تمہاری حیرت بھری نگاہوں کو دیکھنے کے بعد مجھے وہ نومولود بچہ یاد آ گیا جو دنیا میں آنے کے بعد حیرت بھری نگاہوں سے اجنبی لوگوں کی طرف دیکھتا ہے۔'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نامکمل جواب اب بھی تشنگی کا باعث بن رہا ہے۔ تمہاری اس ویرانے میں موجودگی میری عقل سے بالاتر ہے۔'' اس دفعہ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''میں یہیں قریب رہتا ہوں۔ ان اونچی پہاڑیوں کے پیچھے ہماری آبادی ہے۔''

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ لیکن عام طور پر ان گھرانوں میں ایسا ہوتا ہے جن میں لڑکوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں پیدا ہونے والی اکلوتی لڑکی اپنے لئے مذکر کا صیغہ صرف اس لئے استعمال کرتی ہے کہ اسے اپنے ہم عمر لڑکے ایسا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ درپیش ہو۔ یہی سوچ کر میں خاموش ہو گیا۔

وہ دوبارہ بولی۔ ''تم احمد آباد کی طرف جا رہے ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں...... مصری شاہ...... لیکن اگر تم احمد آباد جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور جیپ کے آگے سے گھوم کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بے تکلفی کے ساتھ آ بیٹھی۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے گیئر ریورس میں ڈالا اور جیپ کو موڑ کر سڑک کی طرف روانہ ہو گیا...... وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے خاموشی کو توڑنے کے لئے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''میلانی۔''

''کچھ عجیب سا نام ہے۔'' اور شاید شہر بابانا کی ان پہاڑیوں میں آبادی کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری معلومات قابل فخر ہیں۔ لیکن انسانی آبادی کے علاوہ یہاں اور

بہت سی آبادیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک سے میرا تعلق ہے۔''

یہ سنتے ہی میرے ہاتھوں میں موجود اسٹیرنگ وہیل جھٹکے کے ساتھ گھوم گیا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جیپ لہرا کر کھائی میں گرتے گرتے بچی۔ میرے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔

اس نے دوبارہ کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھے اب اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کا پراسرار وجود اس بات کی سچائی کا ضامن تھا۔ کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی بلاشبہ حقیقت میں ویسا ہی تھا آپ خود سوچ سکتے ہیں ویران و بیابان پہاڑوں کے درمیان جہاں انسانی آبادی کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا وہاں خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکے کا بھلا کیا کام......؟ اس کے چہرے کی تازگی اس بات کا مظہر تھی کہ وہ اتنی بلند و بالا پہاڑیوں کو عبور کرنے کے باوجود بھی اگر تر و تازہ حالت رکھتی تھی تو پھر وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔

میں کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

''وہ کون سی آبادی ہے جس سے تمہارا تعلق ہے۔''

''ظاہر ہے انسانی آبادی نہیں ہوگی۔'' اس نے سر اثبات میں ہلایا اور بولی۔

''جنات اور ارواح سے بھی نہیں ہے۔ ایک درمیان کی آبادی ہے کبھی تمہیں اس کی سیر کے لئے لے جاؤں گا۔ لیکن ابھی ممکن نہیں ہے۔

جیپ نے پکی سڑک کو تھام لیا میرا خوف بھی کسی حد تک کم ہو گیا اور میں نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا مکمل دباؤ ڈال دیا۔ جیپ ہوا سے باتیں کرنے لگی اس کے سر پر موجود دوپٹہ ہوا میں اڑ کر جیپ کی پچھلی سیٹوں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''تم مردوں کی طرح بات چیت کیوں کرتی ہو؟ تمہاری بات چیت نہایت معیوب ترین محسوس ہوتی ہے۔ جب تم اپنے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کرتی ہو۔''

اس نے دوبارہ ہنسنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ ہنسی زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی۔ اور وہ چپ ہونے کے بعد بولی۔

''ہماری زبان فارسی سے مختلف ہے۔ اور اس میں مردوں یا پھر عورتوں کے لئے مخاطب کی تخفیف نہیں پائی جاتی...... سب کے لئے مذکر کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، اور خاموشی کے ساتھ ڈرائیونگ کرنے لگا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے جیپ میں باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری شادی ہو چکی ہے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''دو بچے بھی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''لگتا نہیں ہے۔ بہرحال مجھے افسوس ہوا۔ یہ جان کر کہ تم شادی شدہ ہو۔''

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا۔

''لیکن تمہیں میرے شادی شدہ یا پھر غیر شادی شدہ ہونے سے کیا مطلب......؟ کہیں تم انسانوں میں شادی تو نہیں کرنا چاہتی ہو؟''

اس نے بے تکلفی کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''بیشک میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔ ہماری آبادی میں بہت سے ایسے آباد کار موجود ہیں جنہوں نے تمہاری آبادی میں شادی کی۔ ایسا بلاشبہ ممکن ہے۔ میں جو آج تمہیں شہر بابانا کی پہاڑیوں میں گھومتا ہوا دکھائی دے رہا ہوں تو اس کا مقصد صرف اپنے لئے رشتے کی تلاش ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''ہمارا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ازدواجی زندگی کی شروعات میں ہمارا تعلق جس مذہب کے ساتھ منسلک ہوتا ہے ہم وہی مذہب بخیر و خوبی اپنے اندر ڈھالنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں۔"

میں نے دوبارہ پوچھا۔

"تم اپنی آبادی سے باہر کیوں شادی کرنا چاہتی ہو۔ اپنے ہم عصر لوگوں میں زیادہ مطمئن زندگی بسر کرسکتی ہو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں اپنی زندگی میں یکسانیت نہیں چاہتا ہوں۔ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا میری فطرت میں شامل ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے ازراہ مذاق پوچھا۔

"اگر شادی کے بعد بھی یکسانیت تمہیں شوہر بدلنے پر مجبور کردے۔ تب پھر تم کیا کروگی۔"

"بدل دوں گا۔" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"کیا مجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہمارے مذہب میں عورتوں کو دوسری شادی کی اجازت حاصل نہیں ہے۔"

وہ سنجیدہ لہجے میں میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"اور مردوں کو......" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"چار کی تو قانونی طور پر اجازت حاصل ہے۔"

میلانی کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ اور وہ چند لمحے کے لئے خاموش ہوگئی۔ پھر متزلزل لہجے میں بولی۔

"اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہو تو تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دینا ہوگی؟"

میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"میں اس کے ساتھ خوش ہوں۔ اس لئے مجھے دوسری شادی کی حاجت درکار نہیں۔"

وہ بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولی۔

"یعنی اگر تم اس کے ساتھ خوش نہ ہوتو دوسری شادی کرسکتے ہو۔"

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"شاید...... لیکن طلاق دینے کے لئے سبب کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بغیر وجہ کے طلاق دینے کو ہمارے مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ حتیٰ الوسع آخری حد تک معاملے کو درگزر کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔"

وہ دوبارہ گہری سوچ میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ نہ جانے وہ ایسے الٹے سیدھے سوال کیوں پوچھ رہی تھی۔ اور ان کا مقصد کیا تھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر مجھ سے پوچھا۔

"حتمی جواب دو۔ تمہارے مذہب میں طلاق کیونکر ممکن ہے۔"

میں نے زچ ہوجانے والے لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"آخر تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟" کیا تمہیں کسی کو طلاق دلوانی ہے۔ یا پھر طلاق کے موضوع پر کتاب لکھنا مقصود ہے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔ لیکن مجھے وہی وجہ درکار ہے جس کی بدولت یقینی طور پر طلاق ہوسکے۔"

"بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک وجہ کو طلاق کا سبب گرداننا ممکن نہیں ہے۔ پہلی وجہ عورت کا بے پردہ ہونا۔ کسی غیر مرد کے ساتھ راہ ورسم رکھنا۔ دوسری وجہ شوہر کی نافرمانی کرنا۔ اس کے حقوق پورے نہ کرنا۔ مثلاً وقت پر کھانا تیار نہ کرنا۔ بچوں کی نگہداشت میں کمی وبیشی کا باعث بننا۔ اور شوہر سے بات بے بات لڑنا جھگڑنا۔ تم مختصر بات چیت کے دوران جان چکی ہوگی کہ ہمارے مذہب میں حقوق کی پامالی کو اچھا نہیں جانا جاتا۔ ان کے لحاظ کے لئے بہت سے قوانین وضوابط مرتب ہیں۔" میں خاموش ہوگیا۔

وہ نہایت توجہ کے ساتھ میری بات چیت کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ جیپ میں گھمبیر خاموشی

طاری ہوتی چلی گئی۔ مصری شاہ سے کچھ پہلے عثمانیہ نامی چھوٹے سے ہوٹل کے پاس گاڑی روک کر میں نے اور میلانی نے ہلکا پھلکا کھانا تناول کیا۔ پھر دوبارہ منزل کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ مغرب سے کچھ پہلے ہم مصری شاہ میں داخل ہوئے۔ احمد آباد اس سے چند میل آگے واقع تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار کو تیز کردیا۔ کیونکہ مجھے میلانی کو احمد آباد چھوڑنے کے بعد دوبارہ مصری شاہ کی طرف آنا تھا اور شاید ایسا عشاء سے پہلے ممکن نہیں تھا۔

میلانی نے طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم مصری شاہ کے رہائشی ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"گھر اپنا ہے۔"

"ہاں...... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔" وہ بولی۔

"ناراض نہیں ہونا۔ لیکن میں تمہاری آبادی کو اپنانے سے پہلے مکمل تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری تمام دن کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں۔ کھانے میں کیا پسند کرتے ہو۔ اور کیا ناپسند کرتے ہو۔ تمہیں غصہ کن باتوں پر آتا ہے۔" میں نے بےزار لہجے میں جواب دیا۔

"جب تمہیں کسی ایسے آباد کار کے ساتھ نباہ کرنا ہو جس کے متعلق تمہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ تب عقلمندی اس امر میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ اس کی شخصیت کے سامنے حتمی طور پر سر جھکانے کی کوشش کرو۔ بعدازاں تمہیں خود ہی معلوم ہوجائے گا۔ کہ وہ کیا پسند کرتا ہے اور کیا ناپسند کرتا ہے۔"

جیپ میں ایک دفعہ پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ احمد آباد مصری شاہ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ میری طوفانی ڈرائیونگ نے وقت میں مزید تخفیف کردی۔ اور ہم آدھے گھنٹے میں احمد آباد پہنچ گئے۔ میں نے اسے پاسبان چوک پر اتار دیا۔ اور معاوضہ وصول کرنے کے بعد مصری شاہ چلا آیا۔ تمام دن کی ڈرائیونگ کرنے کے بعد اب میرا جسم تھک کر چکنا چور ہونے لگا تھا۔ بیوی بچے مصری شاہ میں میرے منتظر تھے۔ لیکن طویل ڈرائیونگ کی بدولت جیپ میں کچھ نقص پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے گھر جانے کے بجائے حاتم مسعود کے گیرج کا رخ کیا۔ وہ گیرج بند کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں نے اسے گاڑی کو چیک کرنے کے لئے کہا نقص مختصر تھا۔ لیکن غفلت کے باعث طویل اور گھمبیر صورتحال کا موجب بھی بن سکتا تھا۔ اس کی مرمت میں آدھا گھنٹہ مزید صرف ہوگیا۔ تھکن سے بےحال جسم کے ساتھ جب میں نے گھر جانے والی گلی میں جیپ کو موڑا۔

تب میں نے اسے اپنے گھر کے باغیچے کے پاس منڈلاتے ہوئے پایا۔ میرے ماتھے پر پرتفکر لکیریں نمودار ہونے لگیں۔ لیکن میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر میں میری بیوی حدیبہ میری منتظر تھی۔ لیکن دونوں بچے کھانا کھانے کے بعد سوچکے تھے۔ میرا کھانا کھانے کو دل نہیں کررہا تھا اس لئے نیم گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اس رات تقریباً دس سال کے طویل عرصہ کے بعد مجھے دوبارہ حدیبہ کی گردن پر چند ایسے تشدد بھرے نشانات دیکھنے کو ملے جن سے واسطہ میری ازدواجی زندگی کو تلخ بنانے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے ہمیشہ خاموش ہوجانے میں ہی عافیت جانی تھی۔ شاید کچھ چپقلش کی ابتداء شادی کے اوائل بھرے ایام میں ہوئی تھی۔ چند تلخیاں بھی پیدا ہوئیں۔ ان تلخیوں کا موجب میرا نادیدہ رقیب روسیاہ تھا۔ جس کے وجود سے میں ان دنوں ناآشنا تھا۔

یہ ہمارے ہنی مون کے دنوں کی بات ہے میں ان دنوں کی خوبصورت یادوں اور زہر گھولتی ہوئی تلخیوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔ ان دنوں میری محبت جوبن کی ان حدوں کو پھلانگتی چلی جارہی تھی۔ جن میں آدمی اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں حدیبہ کی محبت میں پاگل ہورہا تھا۔ اور وہ مجھے پاگل بنارہی تھی پاگل کہنا درست نہیں ہوگا۔ اگر بےوقوف کہوں تو بہتر رہے گا۔

ہنی مون کے دوران پہلی دفعہ میں نے ایک نوعمر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لڑکے کو اپنے اردگرد منڈلاتے ہوئے پایا۔ وہ پڑھا لکھا اور تہذیب یافتہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز حدیبہ کا وجود تھا۔ میں نے اسے متعدد بار کھانا تناول کرتے ہوئے اپنی مخصوص کردہ میز کے قریب والی میز پر براجمان دیکھا۔ کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ تفریحی مقامات پر وہ اچانک نمودار ہوتا۔ اور ہم سے چند گز پیچھے چلتے ہوئے تعاقب کرنے لگتا۔ پھر کچھ لمحات کے بعد جس طرح نمودار ہوا تھا ویسے ہی غائب ہوجاتا تھا۔ میں اس کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے اسے نظرانداز کردیتا تھا۔ میری خاموشی کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ حد سے زیادہ تجاوز کرنے لگا۔ ان خمار آلود راتوں کے دوران جب نیند ہمیشہ آنکھوں میں باقی رہتی ہے۔ اور ایک دوسرے کی معیت سے دل نہیں بھرتا۔

تب شروع کے ان چند ایام کے دوران حدیبہ نے کمرے سے فرار ہونا شروع کردیا۔ وہ ایسارات کے آخری پہر کے دوران کرتی تھی۔ جب مجھ پر تقریباً مدہوشی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ میں گزشتہ بالاسطور میں تحریر کرچکا ہوں کہ ان دنوں سونے کا دل نہیں کرتا تھا۔ مدہوش ہونے کے باوجود بھی میں حدیبہ کے وجود سے غافل نہیں ہوتا تھا۔ وہ رات کے کس پہر باہر جاتی تھی اور کس پہر واپس آتی تھی میں اس کی اس آمدورفت سے باخوبی آگاہی رکھتا تھا۔ لیکن میں نے اسے تبدیلی آب وہوا کی ضرورت جان کر فراموش کردیا۔

انہی دنوں پہلی دفعہ میں نے ان تشدد بھرے نشانات کو حدیبہ کے سرخ وسفید جسم پر مثبت پایا۔ جو میری چھٹی حس کو بیدار کرنے کے لئے کافی تھے۔ چند نشانات ایسے تھے جنہیں دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ کہ وہ سگریٹ کے ان دھبوں کے مرہون منت تھے۔ جو جذبات کی شدت سے مغلوب ہونے کے بعد داغے جاتے ہیں۔ ان نشانات کے علاوہ مجھے متعدد بار دانتوں کے ایسے نشان بھی اس کے جسم پر دکھائی دیئے جو جسم کو جھنجھوڑنے سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے استفسار پر حدیبہ نے اس تشدد کا ذمہ دار مجھے قرار دیا۔ لیکن جسم پر موجود سگریٹ کے داغ اور راتوں کو غائب ہونے والے معاملے کو وہ گول کرگئی۔ میرے پوچھنے پر وہ کچھ محتاط ہوگئی۔ لڑکے کا دکھائی دینا بھی بند ہوگیا۔ یہ وقتی خاموشی ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ایک صبح جب میں نیند سے بیدار ہوا۔ تب میں نے اسے کمرے سے غیر حاضر پایا۔ مجھے ان دونوں کے تیوروں کو مدنظر رکھتے ہوئے اندیشہ چند عرصے سے لاحق تھا۔ لیکن اتنی جلدی وقوع پذیر ہونے کی توقع نہیں تھی۔ میں نے عجلت کے عالم میں کپڑے تبدیل کئے اور نیچے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف چلا آیا۔ وہاں رات کے وقت تعینات منیجر چھٹی کی تیاری کررہا تھا۔ میں نے اس سے اپنے ساتھ والے کمرے میں رہائش پذیر لڑکے کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے رجسٹر کھولنے کے بعد فوراً ہی مجھے بتادیا کہ ''وہ کچھ دیر پہلے ہی ہوٹل کو چھوڑ کر جاچکا ہے۔''

میں نے سوچا۔ ''کہ یقیناً وہ دونوں ٹیکسی میں فرار ہوئے ہوں گے۔''

ہوٹل کے باہر چند ٹیکسیاں مسافروں کی منتظر تھیں۔ میرے پوچھ گچھ کرنے پر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا۔ کہ وہ انہیں اسٹیشن چھوڑ کر واپس آرہا ہے۔ اور وہ دونوں نو بجے والی ٹرین سے شہر جانے والے ہیں میں نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو اسٹیشن کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ میری گھڑی پونے نو بجے کا وقت بتارہی تھی۔ یعنی میرے پاس صرف پندرہ منٹ کا وقت موجود تھا۔ اسٹیشن کی عمارت ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی لیکن ٹریفک کا اژدھام رکاوٹ پیدا کررہا تھا۔

بہرحال جب میں نے اسٹیشن کی عمارت میں قدم رکھا تب ماحول ٹرین کی روانگی کی وسل سے گونج رہا تھا۔ میں نے چہرے کو مظفر کے ساتھ ڈھانپا اور ٹرین کے ڈبوں میں دونوں کو تلاش کرنے لگا۔ ٹرین نے دوسری وسل دی۔ تب میں آدھی ٹرین کو چھان چکا تھا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھے باقی کی آدھی ٹرین کو چیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹرین

پر چڑھ گیا گاڑی بآہستگی پلیٹ فارم کو چھوڑ رہی تھی لیکن اس کی رفتار ابھی تیز نہیں ہونے پائی تھی میں ایک دوسرے سے ملحق ٹرین کے ڈبوں میں انہیں تلاش کرنے لگا ڈبے فیملی اپارٹمنٹ پر مشتمل تھے۔ زیادہ توقع اس بات کی تھی کہ وہ دونوں انہی ڈبوں میں سفر کرنے کو ترجیح دیں گے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ ٹرین کے تیسرے نمبر کے اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ یہ اپارٹمنٹ خاص طور پر میاں بیوی کے سفر کے لئے مختص ہوتے ہیں جن میں ان دونوں کے علاوہ تیسرا بندہ سفر نہیں کرسکتا ہے۔ میں نے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے فوراً بعد دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کرکے کنڈی لگادی۔ ان دونوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

حدیبہ برقعے میں ملبوس تھی لیکن لڑکے کے چہرے کو میں باآسانی شناخت کرسکتا تھا۔ مجھے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں میں کوئی بھی سوال کئے بغیر حدیبہ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا وہاں کافی سے زیادہ گنجائش موجود تھی حدیبہ نے بات کرنے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ اور اپنی اوپر نیچے ہوتی ہوئی سانس کو درست کرنے کے بعد ہمکلام ہوا۔

''کیا میاں بیوی کا رشتہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ تم اس کی پرواہ کئے بغیر ایک اجنبی شخص کے ساتھ رشتے کو پامال کرکے بھاگ چلی آئی۔ کیا اس بات سے بھی تمہارا کوئی سروکار واسطہ نہیں۔ کہ ہم دونوں کے علاوہ ایک مزید وجود بھی تمہارے جسم میں سانس لے رہا ہے۔ اگر تمہاری نگاہوں میں ان رشتوں کی رتی برابر بھی حیثیت موجود نہیں تو کیا اس ذات سے بھی انحراف کروگی جو سب سے بالاتر اور افضل ہے کیا اس کی حیثیت بھی تمہاری نگاہوں میں اہمیت نہیں رکھتی۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔ لڑکا خاموشی کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ثبت تھے۔ چند لمحے دل کا غبار ہلکا کرنے کے بعد حدیبہ نے آنکھوں کو رومال کے ساتھ پونچھا اور کمزور لہجے میں بولی۔

''میری نگاہوں میں ہر رشتے کی اہمیت حرف آخر کی مانند موجود ہے۔ اور اس ذات پر دل وجان قربان..... لیکن میں نے اپنے اور آپ کے رشتے کو کبھی بھی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہیں کہ میاں بیوی کے اس رشتے میں بندھنے سے قبل میں اذلان علی سے محبت کرتی تھی شاید صدیوں پہلے سے..... یا پھر شاید اس سے بھی کچھ پہلے سے..... میں اس بات کا برملا اظہار کرتی ہوں کہ صرف آج ہی نہیں بلکہ صدیوں بعد بھی..... اور شاید اس سے بھی کچھ بعد تک میں اس سے محبت کرتی رہوں گی۔ پھر کیا ضرورت ہے میاں بیوی کے اس رشتے کو قائم رہنے کی۔ معاف کیجیے گا لیکن میں منافقت بھری سوچ کو قطعاً پسند نہیں کرتی ہوں۔ جو کچھ میرے دل ودماغ میں تھا میں نے حرف بہ حرف بیان کردیا۔ آگے آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے۔''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

''منافق تو تم کل بھی تھی۔ اور آج بھی ہو۔ حدیبہ..... اگر شادی سے پہلے مجھے اپنے اور اذلان علی کے رشتے کے متعلق صاف صاف بتادیتی۔ تب شاید مجھے اور تمہیں ان حالات سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ اب بتانے کا بھلا کیا فائدہ.....'' وہ پشیمان لہجے میں بولی۔

''منافق میں نہیں ہوں بلکہ میرے ماں باپ ہیں۔ جو اس بات سے آگاہی رکھتے تھے کہ میں اور اذلان بچپن سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اس کے باوجود بھی انہوں نے اذلان کے رشتے کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھے مجبور کیا۔ کہ میں آپ سے شادی کرلوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتادوں لیکن مجھے آپ سے ملنے نہیں دیا گیا اور شادی کے بعد کچھ بھی بتانا بے معنی تھا اس

لئے چپ ہو کر بیٹھی رہی۔

میں نے تنقیدی نگاہوں سے کونے میں سمٹ کر بیٹھے ہوئے اذلان کے سراپے کا جائزہ لیا وہ بیس سے پچیس سال کا نوجوان خوبصورت اور پڑھا لکھا لڑکا دکھائی دیتا تھا ہماری اس مختصر بات چیت کے دوران اس نے ایک دفعہ بھی دخل اندازی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی گونگا بنا بیٹھا رہا تھا۔ میں نے سرد لہجے میں حدیبہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے والدین نے اس پڑھے لکھے رشتے کو مسترد کر کے نہ صرف تم پر ظلم کیا ہے۔ بلکہ میری زندگی کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ کیا میں اس انکار کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں جس کی وجہ سے تین زندگیاں متاثر ہو کر رہ گئیں ہیں۔''

وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

''اذلان علی ناصرف پیدائشی گونگا ہے۔ بلکہ ایک ایکسیڈنٹ کے بعد اس قابل بھی نہیں رہا کہ وہ کسی لڑکی کی منحوس ازدواجی خواہشات کو پورا کر سکے۔''

میں نے چونکتے ہوئے اذلان کی طرف دیکھا۔ اس کے مسکین دکھائی دینے والے چہرے پر بے چارگی کے تاثرات ثبت تھے۔ مجھے اس پر نہ جانے کیوں ترس آنے لگا۔

اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے دروازے کو کھول دیا سامنے ٹی ٹی کھڑا استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''میرے پاس ٹکٹ موجود نہیں تھا۔'' ٹی ٹی نے جرمانے کی پرچی میرے ہاتھوں میں تھمادی۔ میں نے جرمانہ ادا کیا۔ اور وہ حدیبہ اور اذلان کے ٹکٹ چیک کرنے کے بعد دوسرے ڈبے کی طرف چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا پھر حدیبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

''سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کرنے کی کوشش کریں گے اس کے باوجود بھی کہ ہمارا رشتہ بے معنی ہے۔ میں اسے نبھانے کی کوشش کروں گی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اذلان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسے فارغ کرو، اور میرے ساتھ گھر چلو۔ اس مسئلے کا حل وہاں پہنچ کر تلاش کر لیں گے۔'' اس نے جواب نہیں دیا۔ اور میرے ہمراہ گھر واپس چلی آئی۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں کے مترادف ہمارے مسئلے کا کوئی مستقل حل موجود نہیں تھا اس کے باوجود بھی میں نے تمام کئے دھرے کے سرکردہ اپنے سسر اور ساس کو گھر میں مدعو کیا کہ وہی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے حدیبہ کو دوسرے کمرے میں لے جا کر آدھے گھنٹے کی مختصر ملاقات کے دوران نہ جانے ایسا کیا سمجھایا کہ وہ میرے ساتھ رہنے کے لئے تیار ہو گئی۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہئے۔ میں نے بھی درگزر کر دینے میں عافیت جانی..... اور سب کچھ بھلا کر نئی زندگی کی ابتداء کی۔

پہلے سعدیہ دنیا میں آئی اور پھر سعد..... ان دو زچگیوں کے دوران اذلان کہاں گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد آج ایک دفعہ پھر حدیبہ کے جسم پر وہی تشدد بھرے نشانات کو ثبت دیکھ کر میں نہایت پریشان ہو کر رہ گیا۔ یہ نشانات کسی کی بے چارگی اور بے بسی کی کہانی کی تفصیل بخوبی بیان کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان کے متعلق حدیبہ سے کچھ دریافت کرنا فضول تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہوئے میں اسے گھر کے گرد منڈلاتے ہوئے اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

دوسرے دن میں نے کام پر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور گھر سے کچھ دور لگے ہوئے پیپل کے درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر اپنے مکان کی نگرانی شروع کر دی وہ نو بجے کے قرب نمودار ہوا۔ اس کے طور اطوار دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں کہیں باہر جانے کے پروگرام سے وابستہ تھے۔ وہ

پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ اور کافی اہتمام سے تیار ہو کر آیا تھا حدیبہ اس کی منتظر تھی اذلان نے جب دروازے کی گھنٹی بجائی تب وہ سعد اور سامان سے بھری ہوئی ٹوکری کے ہمراہ باہر نمودار ہوئیں۔ اس نے سعد کو ہمسایوں میں موجود اپنی گہری سہیلی کے حوالے کیا اور پیدل چلتے ہوئے قریبی چوک کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں متعدد ٹیکسیاں موجود تھیں۔ انہوں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔

میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ دوسری ٹیکسی مجھ سے کچھ دور موجود تھی۔ میں نے اس میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو اگلی ٹیکسی کے پیچھے چلنے کے لئے کہا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دو بچوں کی ماں اس بے رحمی کے ساتھ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر آشنا کے ہمراہ پکنک منانے کی نیت سے باہر جا سکتی تھی۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے خیال کے مطابق دو بچوں کی موجودگی کے دوران وہ ایسے خرافات سے کنارہ کشی کی کوشش کرے گی لیکن اس نے ماں کے درجے کو بھی بالائے طاق رکھتے ہوئے اذلان کے ہمراہ باہر نکلنے کو معیوب نہیں جانا۔ ان کی ٹیکسی کا رخ شہر سے باہر ابوالذوق کے میوزیم سے ملحقہ اس پارک کی جانب تھا۔ جسے سفاری پارک کہنا بہتر ہوگا۔ یہاں منچلے نوجوان لڑکے لڑکیاں آزاد ماحول کی تلاش میں سرگرداں رخ کرتے تھے۔ اس پارک کے اندرونی حصے میں چند کاٹیج نما کمرے عیاشی کی غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے گئے تھے۔ جہاں عموماً شہر کے امراء یا پھر عیاش فطرت لونڈے لپاڑے بازاری عورتوں کے ہمراہ کمروں کو بک کرواتے تھے۔ ان کمروں کا معاوضہ نہایت مناسب اور سہولیات قابل قدر تھیں۔

مجھے اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ کہ حدیبہ اور اذلان کا وہاں جانے کا مقصد کیا تھا میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچنے لگیں نا جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا حالانکہ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں تھی وہ دس سال پہلے اس بے وفائی کی مرتکب رہ چکی تھی میں تو ان باتوں کا عادی تھا مجھے اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہئے تھا میری توقع کے عین مطابق ٹیکسی سفاری پارک کے قریب پہنچ کر رک گئی اور وہ دونوں سامان سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھائے اندرون پارک لکڑی کے کاٹیجوں کی طرف چل دیئے۔ یہ کاٹیج ایک ترتیب میں واقع نہیں تھے بلکہ گھاس سے مزین چھوٹے چھوٹے خطوں کے درمیان ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ ان کا مینجنگ اسٹاف ایک مختصر کمرے میں استراحت رکھتا تھا جس کے باہر بورڈ پر آویزاں تھا ''منتظمین پارک''

ان دونوں نے کمرے میں گھسنے کے بعد اپنے نام پر کمرہ بک کروایا۔ اور سامان کی ٹوکری کے ہمراہ وہاں منتقل ہو گئے میں دوپہر کے ڈیڑھ بجے تک باہر بیٹھا جلتا کڑھتا رہا لیکن انہوں نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔

سعدیہ کے اسکول کی چھٹی ڈیڑھ بجے ہوتی تھی اور سعد ہمسایوں کے گھر میں ماں باپ کی موجودگی کے باوجود بھی یتیم و لاوارث پڑا تھا۔ میں نے غصے اور لاچاری کے باعث پاؤں پٹخے اور ٹیکسی پکڑ کر واپس مصری شاہ چلا آیا۔

اس دن پہلی دفعہ میں نے سعدیہ کو اسکول میں اکیلے بیٹھے ہچکیاں لے کر روتے ہوئے پایا۔ وہ نہایت دلگرفتہ دکھائی دیتی تھی میں نے اسے چپ کرایا اور اپنے ہمراہ گھر لے آیا۔ سعدیہ سے ملتا جلتا کچھ حال سعد کا بھی تھا وہ تمام دن بھوک کی بدولت روتے رہنے کے بعد آخر کار تھک ہار کر سو گیا تھا اب میں حدیبہ کا منتظر تھا آپ یقین جانیں گے اس کی آمد شام سات بجے کے بعد متوقع ہوئی وہ نہایت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی میں نے جب گھر سے غیر حاضر رہنے کی وجہ دریافت کی تب وہ مسکین صورت بناتے ہوئے بولی۔

''میری طبیعت کچھ ناساز ہے ایک دوست کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اس نے چیک اپ کرنے کے بعد ڈرپ لگا دی شاید اسی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی۔''

میں نے تاسف بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''حدیبہ تمہیں تو بہانہ بھی نہیں بنانا آتا کچھ توڈھنگ کا سوچ لیتی اگر سوچنا ممکن نہیں تھا تو کم از کم ان نشانات کا ہی کچھ لحاظ کرلیتی جن کی موجودگی تمہارے ان گناہوں کا پردہ پاش کرنے کے لئے کافی ہے۔ جنہیں چھپانے کی خاطر تم نہایت بھونڈے بہانے بنانے کی ناکام کوشش کررہی ہو۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اذلان علی کو اپنے گھر کے اردگرد منڈلاتے ہوئے باخوبی دیکھ چکا ہوں میرے اس انکشاف کی بدولت حدیبہ کے چہرے پر موجود تاثرات میں تبدیلی رونما نہیں ہوئی وہاں پہلے بھی سرد پرچھائیاں رقص کررہی تھیں۔'' میری تقریر کے بعد بھی ان میں کچھ خاص تغیر رونما نہیں ہوپایا۔

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''میری طبیعت ناساز ہے۔ مہربانی کرکے مجھے اگر تنہا چھوڑ دیں تو آپ کی شکر گزار رہوں گی۔''

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اس کا رویہ اپنی گزشتہ عادات کے منافی تھا۔ آج سے قبل اس نے کبھی بھی ایسی سرد مہری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

بہرحال اس دن بھی میں نے اپنی فطرت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے خاموش رہنے میں ہی بہتری جانی اور کمرے میں چلا آیا۔ پھر یہ اس کا روزمرہ کا معمول بن کررہ گیا وہ صبح گھر سے نکلتی تو شام سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں ہوتی..... بچے دربدر ہونے لگے..... میرا کام بھی متاثر ہوا اس کی غیر موجودگی کے دوران میرا دماغ گھر کے دھندوں میں الجھا رہتا تھا میرے لاکھ منع کرنے پر بھی اس نے اپنی روش کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی ہاں اتنا ضرور ہوا کہ چند دنوں کی ذہنی چپقلش اور تو تو میں میں کے بعد اس نے ایک رات لمبی چوڑی گفت وشنید کے بعد مجھ سے طلاق کا مطالبہ کردیا۔

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا پھر خاموشی سے کروٹ بدل کر آنکھیں موندھ لیں اب اس کے علاوہ مزید چارہ کار باقی نہیں بچا تھا۔ کہ میں دوبارہ اس کے ماں باپ سے رابطہ کروں اور وہ آکر اسے سمجھا بجھا کر اپنے گھر کو برباد کرنے سے منع کریں میں نے دوسرے دن بچوں کے ہمراہ تہران جانے کا فیصلہ کیا اور سونے کی ناکام کوششیں کرنے لگا۔

دوسرے دن صبح جب میری آنکھ کھلی تب سر درد کے مارے پھٹا جارہا تھا رات کی نامکمل نیند درد کا موجب تھی ہلکی سی حرارت بھی محسوس ہورہی تھی حدیبہ کچن میں ناشتہ بنانے میں مصروف تھی اور سعدیہ اسکول کی تیاریوں میں مگن تھی میں نے بستر سے باہر نکلنے کے بعد کچن میں کام کرتی ہوئی حدیبہ کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں سکون ومسرت کا چشمہ پھوٹتا دکھائی دیتا تھا اسے گھر تباہ ہونے کی فکر نہیں تھی۔

کیا بچپن کی محبت میں اتنی طاقت موجود ہوسکتی ہے۔ کہ انسان اپنے شوہر اور بچوں سے بھی لاپرواہی برت سکے۔ مجھے اس پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا شاید ایسا پہلا دفعہ تھا۔ کہ میرے دل میں شدت سے ایسی خواہش سر ابھارنے لگی کہ میں اس بے وفا عورت کا گلا دبا کر اسے ختم کردوں میں نے سر کو جھٹک کر اپنے دل میں پیدا ہونے والے خیال کو مسترد کیا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔ منہ ہاتھ دھوکر جب میں نے کمرے کا رخ کیا تو دسترخوان پر ناشتے کو تیار پایا حدیبہ اور سعدیہ ایک جانب بیٹھے میرے منتظر تھے سعد ابھی سو کر نہیں اٹھا تھا۔

سر میں درد کی بدولت میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں میں نے دسترخوان کے کنارے پر رکھے ہوئے پانی کے گلاس کو اٹھایا تب گلاس میرے ہاتھوں سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ پانی چھلک کر میرے کپڑوں پر برسات کی صورت میں برسا۔ اور میرے چہرے پر زلزلے کے تاثرات ابھرتے چلے گئے ہماری دس سالہ ازدواجی زندگی کے دوران شاید ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا کہ حدیبہ نے قہقہہ لگا کر ہنسنا شروع کردیا میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا

وہ متواتر ہنستی چلی جارہی تھی حتیٰ کہ اس کی آنکھوں سے آنسو باہر نکلنے لگے۔

میں نے استفہامیہ لہجے میں ہنسنے کی وجہ دریافت کی لیکن اس کی ہنسی میں کمی واقع نہیں ہوئی تب جھنجھلائے ہوئے انداز میں، میں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ایک طرف رکھے ہوئے کپڑے سے اپنے ہاتھ صاف کرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اس نے بمشکل تمام اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے ندامت بھرے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے گا۔ لیکن آپ کے چہرے پر موجود زلزلے کے آثار نے مجھے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کردیا۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا کہ ناشتے کے دوران آپ کے لئے پریشانی کا باعث بنوں لیکن فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوں انسانی اشکال پر نمودار ہونے والے یہ تاثرات میرے لئے دلچسپی کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اور بھی نا جانے کیا کہتی چلی جارہی تھی لیکن میرا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہونے لگا تھا۔

وہ حیرت انگیز طور پر اپنی ذات کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کررہی تھی مجھے گزشتہ چند روز قبل کی وہ ملاقات یاد آنے لگی۔ جو شہر بابانا کے سنسان پہاڑوں کے درمیان واقع کھجوری تالاب کے پاس ہوئی تھی۔ جو میری اور میلانی کی آشنائی کا باعث بنی تھی۔ میلانی بھی اپنے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کرتی تھی لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آج سے پہلے حدیبہ نے ایسا کبھی بھی نہیں کیا تھا یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ ایسا کررہی تھی میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم.....؟ اور حدیبہ کہاں ہے؟'' اس نے تمسخرانہ نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں حدیبہ ہی ہوں لیکن آپ مجھے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں یا پھر میری شکل تبدیل ہونے کے بعد کسی جانور سے مشابہ ہونے لگی ہے۔''

میں نے چند لمحے تنقیدی نگاہوں کے ساتھ اس کے چہرے کا جائزہ لیتے رہنے کے بعد حتمی لہجے میں کہا۔

''تم حدیبہ نہیں ہو۔ شاید میلانی ہو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے تمہاری فطرت اور لب ولہجہ تمہاری پوشیدگی کا راز فاش کرنے کے لئے کافی ہے۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ حدیبہ اس وقت کہاں ہے۔؟''

وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''جہاں بھی ہے بہتر ہے۔ اطمینان رکھو۔ جسم اسی کا ہے صرف روح میری ہے۔ مجھے غلط نہ سمجھنا لیکن تم ان معمولات کے عادی ہو۔ آج سے پہلے بھی تم نے صرف حدیبہ کے جسم پر حکمرانی کی تھی روحانی طور پر وہ اذلان کی تھی تو پھر آج ایسا کیوں نہیں۔ آج کے بعد جسم حدیبہ کا ہوگا اور روح میری۔ یوں سمجھو کہ تمام کی تمام حدیبہ آج کے بعد تمہاری ہوگی۔'' اس کی ان باتوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا واقعی حدیبہ کبھی بھی میری نہیں تھی وہ ہمیشہ سے اذلان کی محبت میں گرفتار رہی تھی میرے لئے اس کی محبت نہ ہونے کے برابر تھی اگر میلانی اس کے وجود پر حاوی رہتی تو میں حدیبہ اور اذلان کی محبت میں باآسانی دراڑ ڈال کر کسی نہ کسی حد تک اس کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا تھوڑا سا دماغ استعمال کرنے کی ضرورت تھی اور وہ میں استعمال کررہا تھا۔ میں نے میلانی کی طرف دیکھا۔ وہ طلب گار نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے لیکن کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ تمہیں کھونا نہیں پڑے گا۔ لیکن بہت کچھ کرنا ضرور پڑے گا۔ اگر تیار ہو تو ہاں کردو یاد رکھو معاملہ نہایت پیچیدہ ہے۔''

وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں تیار ہوں۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا اگر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو تمام دنیا کے اطراف میری پہنچ سے باہر نہیں ہوگے میں جب چاہوں تمہیں باآسانی ایسی

www.Paksociety.com

اذیت سے ہمکنار کرسکتا ہوں جس کے متعلق تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔"

میں نے سر کو اثبات میں ہلایا اور سرگوشیانہ لہجے میں ہمکلام ہوا۔

"مجھے کسی کی موت درکار ہے تم اس کے متعلق اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ میرا رقیب روسیا اذلان علی ہے جب تک وہ زندہ رہے گا میری بیوی میری نہیں ہوگی وہ دو حصوں میں بٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوگی میں اس مجبوری کو ہمیشہ کے لئے ختم کردینا چاہتا ہوں میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن تم با آسانی کرسکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا کروں گا۔ لیکن تمہیں مجھے یقین دہانی کرانی ہوگی کہ اس کی موت کے بعد تم میرے ساتھ نکاح کروگے۔ اور تمام زندگی اس نکاح پر قائم رہنے کی کوشش کروگے۔"

میں نے زور زور سے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک میں ایسا کروں گا۔ لیکن اذلان کی موت کے بعد..... بصورت دیگر ایسا ممکن نہیں ہوگا۔" میں خاموش ہوگیا اس نے جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔

اگلا ہفتہ میرے حواسوں پر طاری رہا۔ میں نے ہمیشہ حدیبہ کے سرد اور جذبات سے عاری جسم پر حکومت کی تھی۔ اور دل و دماغ پر اذلان کا تسلط رہا تھا۔ ایسا پہلی دفعہ ہورہا تھا۔ کہ مجھے جسم اور دل و دماغ تینوں پر یکمشت حکمرانی کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے لگا۔ یہ کیفیت اگر ہمیشہ بھی طاری رہتی تب میں اس کے ہونے سے انکاری نہ ہوتا۔

"لیکن اتوار کی اس رات میلانی سنجیدہ لہجے میں بولی۔"

"میرے خیال میں وقت گزاری بہت ہوگئی۔ اب ہمیں کام کے متعلق بات چیت کرلینی چاہئے میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کچھ بدمزگی پیدا ہو۔ اس کا گھر یہیں قریب ہی موجود ہے۔ اگر مناسب سمجھتے ہو۔ تو میں اسے ختم کردینے کے بعد تمہاری بے وفا بیوی کو اس کے قتل کے الزام میں جیل کروا دیتا ہوں۔" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے صرف اذلان کی موت درکار ہے۔ حدیبہ کے لئے مشکلات کا باعث بننا مجھے گوارا نہیں۔"

میلانی نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ پھر سرد لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ اگر مہربانی کرکے مجھے نیند کی گولیاں مہیا کردو۔ تو آج کی رات فیصلہ کن رات ہوسکتی ہے۔"

میرے دراز میں نیند کی گولیاں وافر مقدار میں موجود تھیں شادی کے چند عرصے بعد میں نے ان کا استعمال محدود پیمانے پر شروع کردیا تھا۔ یہ گولیاں سرعام خریدنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لئے ڈاکٹر کی تجویز کرب پرچی کا ہونا لازم و ملزوم تھا۔ حالات و واقعات نے مجھے اس گولی کا عادی بنادیا تھا۔ اب میری یہی عادت حالات و واقعات کو میرے حق میں مفید ثابت کرنے کے لئے مددگار ثابت ہونے کا باعث بن رہی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی۔

بہرحال میں نے دراز میں سے نیند کی گولیوں کا پتا نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھمادیا۔ اس نے رات بارہ بجے مجھے اذلان کے گھر آنے کی تلقین کی۔ پھر خود نہایت اہتمام کے ساتھ تیار ہونے کے بعد گھر سے باہر نکل گئی۔

میں اس بات کا برملا اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری محبت حدیبہ کے ساتھ کی تھی۔ حالانکہ وہ باوفا نہیں تھی۔ اس کے باوجود بھی نا جانے کیوں مجھے اس سے نفرت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کتنی دفعہ اس نے میری تذلیل کی۔ کتنی دفعہ مجھے لوگوں کے سامنے رسوا کیا۔ لیکن آج بھی مجھے اس کی تذلیل منظور نہیں تھی۔ اسی لئے میں نے میلانی کو اسے قتل کے معاملات سے دور رکھنے کی تلقین کی تھی۔

رات کو میں نے سعدیہ اور سعد کو جلدی کھانا کھلانے کے بعد سلادیا۔ اور بارہ بجے سے کچھ پہلے

گھر سے نکل کر اذلان کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر ایسا کرسکوں۔ اذلان کے گھر سے کچھ پہلے میں نے اپنے چہرے کو مفلر کے ساتھ اچھی طرح ڈھک لیا۔

سردیوں کی راتیں تھیں۔ ایسے عالم میں رات کے وقت آوارہ گرد بھی اپنے پوشیدہ مقامات کی جانب رخ کرتے ہیں۔ اس رات تو چوکیدار بھی گشت پر موجود نہیں تھا۔ اذلان کا ایک کمرے پر مشتمل گھر کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں نے اسے کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا اس کے آگے پیچھے حدیبہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا مختصر صحن کے سامنے برآمدہ بنا تھا اور برآمدے کے آگے اکلوتا کمرہ تھا۔ جس کے ساتھ ہی کچن اور ٹوئلٹ کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا کمرے میں دو کرسیوں اور پلنگ کے علاوہ کرسیوں کے سامنے لکڑی کی ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میلانی پلنگ کے قریب رکھی ہوئی دونوں کرسیوں میں سے ایک پر براجمان تھی میز پر ری کا مختصر گچھا اور سفید کاغذ کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ اذلان بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ وہ نہایت مختصر کپڑوں میں ملبوس تھا۔

مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میلانی کرسی کو چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر فاتحانہ لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کام مکمل ہوگیا ہے۔" صرف اسے پنکھے پر لٹکانا باقی رہ گیا ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر میز پر رکھے ہوئے کاغذ کو اٹھایا اور پڑھنا شروع کردیا لکھا تھا۔

زندگی کی ناکامیوں اور مایوسیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خودکشی کررہا ہوں۔ اس کا ذمہ دار ظالم معاشرے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ کسی بھی انسان کا تعلق میری موت سے وابستہ نہیں ہے۔ اس لئے واقعہ کو درگزر کرتے ہوئے ختم کردینے کی کوشش کی جائے۔

اذلان علی۔

تحریر میں ربط نہیں پایا جاتا تھا۔ لکھائی میں بھی لڑکھڑاہٹ موجود تھی۔ لیکن یہ بڑی بات تھی کہ ہینڈ رائٹنگ اس کی اپنی تھی۔ لڑکھڑاہٹ کو ذہنی کشمکش اور بوکھلاہٹ جان کر نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ میں نے میز پر رکھی ہوئی ری کا معائنہ کیا۔ وہ مضبوط اور مناسب لمبائی تک محدود تھی کمرے میں پنکھا موجود نہیں تھا لیکن وہ ہک ضرور چھت پر نصب تھا جس کے ساتھ پنکھے کو لٹکایا جاتا ہے۔

میں نے میز کو ہک کے نیچے رکھنے کے بعد اوپر چڑھتے ہوئے ری کو ہک کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر دوسرے سرے کو پھندے کی صورت دینے کے بعد

پانچ چیزوں کے جوابات

حضرت شفیق بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ چیزوں کے متعلق سوال کیا تمام نے ایک ہی جواب دیا۔

1- میں نے پوچھا۔ "عاقل کون ہے؟" سب نے یہی جواب دیا کہ "عاقل وہ شخص ہے جو دنیا سے محبت نہیں رکھتا۔

2- میں نے پوچھا۔ "دانا اور ہوشیار کون شخص ہے۔" جواب ملا۔ "جسے دنیا دھوکہ نہ دے سکے۔"

3- میں نے پوچھا۔ "غنی کون ہے؟" جواب آیا۔ "جو اپنے لئے اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہوجائے۔"

4- میں نے پوچھا۔ "فقیہ کون ہے؟" جواب ملا۔ "جو زیادہ کی طلب نہیں رکھتا۔"

5- میں نے پوچھا۔ "بخیل کون ہے؟" جواب ارشاد ہوا۔ "جو شخص اپنے مال میں سے اللہ پاک کا حق ادا نہیں کرتا۔"

(ناصر علی۔ بھولے دی جھوک ساہیوال)

میلانی کے ساتھ مل کر اذلان علی کو میز پر کھڑے کرنے کے بعد پھندا اس کے گلے میں ڈال کر کس دیا۔ اور تنقیدی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد جھٹکے کے ساتھ میز کو اذلان علی کے پاؤں کے نیچے سے ہٹا دیا اس کے جسم کو جھٹکا لگا منہ سے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی مانند آواز نمودار ہوئی۔ میں نے بے اختیار اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔ اسے عالم فانی سے کوچ کرنے میں پانچ منٹ سے بھی کم عرصہ لگا۔ پھر جسم ساکت ہوکر رہ گیا۔ میں نے جلدی جلدی میز اور کرسیوں پر سے اپنے اور میلانی کے ہاتھوں کے نشانات مٹائے۔ کاغذ کے اس ٹکڑے کو جس پر اذلان علی کی جانب سے تحریر کردہ وہ مراسلہ موجود تھا۔ جو اس نے خودکشی کرنے کے متعلق تحریر کیا تھا۔ اسے کپڑے کے ساتھ اچھی طرح صاف کرنے کے بعد پلنگ کی سائیڈ پر رکھا پھر اپنا چہرہ مفلر میں چھپانے کے بعد میلانی کے ہمراہ گھر چلا آیا۔

بظاہر سب کچھ ہماری توقع کے مطابق ہی ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک ہمارے لئے اطمینان کا سانس لینا ممکن نہیں تھا۔ پولیس کی آمد اور رپورٹ کے اختتام کو سامنے رکھنے کے بعد مزید کچھ کہنا ممکن تھا۔

دوسرے دن میں نے قریبی مسجد کے مولوی صاحب اور چند گواہوں کے ہمراہ میلانی کے ساتھ نکاح کیا۔ اور اسے اپنی دوسری بیوی کی حیثیت کا اختیار دے دیا۔ ازدواجی زندگی کے گزشتہ دس سالوں کے بعد میری دماغی کیفیت پہلی دفعہ آسمانوں سے باتیں کرنے لگی۔ خوشیوں کی ناختم ہونے والی ایک آبشار تھی جو میرے سلگتے ہوئے جسم کو بگھوتی چلی جارہی تھی۔

جسم حدیبہ کا تھا اور روح میلانی کی۔ اس خوبصورت امتزاج نے میری زندگی کو دوآتشہ بنا دیا۔ وہ میری ہر قسم کی ضروریات کا مکمل خیال رکھتی تھی۔ بچوں کے ساتھ اس کے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ حیرت بھی ہوتی تھی سوتن کے بچوں کے ساتھ اتنا مشفقانہ رویہ مجھے کچھ غیر فطری محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اسے حدیبہ اور سعد کے علاوہ محلے میں موجود تمام بچوں سے جذباتی حدود کی آخری حدوں سے بھی زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ انہیں نہایت اہمیت دیتی تھی۔

بہرحال وقت اچھا گزر رہا تھا۔ اس لئے ہم نے اذلان علی کی خودکشی کو بھی یکسر نظرانداز کردیا۔ وہاں کیا ہورہا تھا اور کیا نہیں ہورہا تھا ہمیں کچھ بھی خبر نہیں تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا۔ کہ خودکشی کے ایک ہفتے کے بعد پولی کے ایک نہایت گھاگ قسم کے انسپکٹر نے ہمارے گھر کا رخ کیا اور میلانی سے نہایت تفصیلی ملاقات کی۔ جس میں اس نے حدیبہ اور اذلان کے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ سوالات پوچھے۔ جن کا جواب میلانی نے سچائی کے ساتھ مفصل بیان کی صورت میں لکھوادیا۔ انسپکٹر مطمئن ہوکر واپس چلا گیا۔

حادثے کو ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ کیس میں کیا پیش رفت مزید ہوئی۔ میں میلانی کے ہمراہ مطمئن تھا۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے تھا ان ڈیڑھ مہینوں کے دوران میلانی کا پاؤں بھاری ہوگیا وہ نہایت خوش تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کی نصیحت کی تھی۔ وہ نہایت اہتمام کے ساتھ ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کررہی تھی لیکن اب اس نے سعدیہ اور سعد کی جانب سے غفلت برتنا شروع کردی تھی اور وہ انہیں مناسب توجہ نہیں دے پارہی تھی۔ میں نے اسے ماں بننے کی خوشی جان کر درگزر کردیا ان دنوں کام بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے سعدیہ اور سعد کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لئے میں زیادہ اوقات گھر میں ہی گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔

یہ دوسرے مہینے کی شروعات کی بات ہے اس صبح جب میں نے اٹھنے کے بعد ناشتے کے دسترخوان کا رخ کیا تب میلانی کے چہرے پر سرد تاثرات کو ثبت پایا۔ یہ وہ تاثرات تھے جو کبھی حدیبہ کی شخصیت کا خاصہ ہوتے تھے۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ اور ناشتہ کرنے کے بعد گھر سے باہر چلا آیا۔ میں ان دنوں اپنی جیپ کو بیچ کر اسٹیشن ویگن لینے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جیپ اچھے داموں

فروخت ہوگئی۔ اور مجھے اسٹیشن ویگن کی خریداری کے لئے تہران جانا مقصود تھا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ وہاں چلا آیا۔ اسٹیشن ویگن ہمیں اچھے داموں میسر آئی۔ اس خریداری کے دوران دو دن کیسے گزرے ہمیں پتا نہیں چلا۔ لیکن سودا مناسب طریقے سے طے پایا۔ اس کی ہمیں بہت خوشی تھی۔ یہ خوشی وقتی ثابت ہوئی۔

اس رات جب میں نے اسٹیشن ویگن کے ہمراہ اپنی گلی میں قدم رکھا تب پولیس کے چند اہلکاروں کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے مجھے اپنے ہمراہ پولیس اسٹیشن چلنے کے لئے کہا۔ میں نے وجہ دریافت کی تب انہوں نے وجہ بتانے سے صاف انکار کردیا۔ مجھ کو شک ہوا کہ اذلان علی والے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں مجھے پولیس اسٹیشن بلایا جارہا ہے۔ اس لئے میں نے کوئی بھی بات چیت کئے بغیر ان کے ہمراہ چلنے میں ہی بہتری جانی۔ اگر مجھے وجہ معلوم ہوجاتی تو شاید میں ان کے ساتھ پولیس اسٹیشن جانے کے بجائے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔

تھانے میں کیس کا کرتا دھرتا انسپکٹر ایان میرا منتظر تھا۔ وہ پڑھا لکھا ہوا انسان دکھائی دیتا تھا۔ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ماتحتوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ میں نے پریشان لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں یہاں بلانے کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بے شک کیوں نہیں۔ آپ کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کروایا گیا ہے کچھ مدہم ثبوت دریافت ہوچکے ہیں۔ اور کچھ کے ملنے کی توقع ہے۔ ہم آپ کی باقاعدہ گرفتاری کا عمل ان ثبوت کی موجودگی کے دوران کریں گے۔ لیکن پرچہ کٹ جانے کی صورت میں اب آپ تھانے سے باہر نہیں جاپائیں گے۔''

میری دماغی کیفیت کا یہ عالم تھا۔ کہ سوچنے سمجھنے کی حس تقریباً مفقود ہونے لگی تھی۔ وہ میری ذہنی کیفیت کا باخوبی اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

''یقیناً آپ یہ جاننے کے لئے مشتاق ہوں گے کہ آپ کے خلاف پرچہ کس نے درج کروایا۔'' میں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''کل شام کو آپ کی بیوی حدیبہ نصیر ولد ملازم علی صدر تھانے میں شام پانچ بجے وارد ہوئی، اور انہوں نے قتل کا مقدمہ بنام اذلان علی کے درج کروایا ان کے کہنے کے مطابق آپ نے اذلان علی جو کہ حدیبہ نصیر کا قریبی رشتہ دار تھا اسے بوجہ رقابت ہلاک کیا ہے بعد قتل اس کو خودکشی کا بھونڈا روپ دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ہمیں شک تو پہلے ہی تھا لیکن ثبوتوں کی عدم موجودگی کے باعث کیس میں کچھ خاص پیش رفت نہ ہوسکی اذلان علی کی ہینڈ رائٹنگ میں خودکشی کرنے کی مناسب وجہ موجود نہیں تھی۔ علاوہ ازیں کسی قریبی رشتہ دار کی غیر موجودگی اس بات کو مشکوک بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے کہ وہ کاغذ پر خودکشی کے متعلق تحریر کرنے کے بعد کسی بھی شخص کو مورد الزام ٹھہرانے سے انحراف کرے، اور کیس کو ختم کرنے کی پیشکش خودکشی کرنے سے پہلے کرے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم نے اس کی گزشتہ زندگی کے متعلق تحقیق کی تو ہمیں یہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کے مشکوک تعلقات آپ کی بیوی کے ساتھ محدود عرصہ تک قائم رہے تھے۔

لیکن آپ کے سسرال والوں کے تنبیہ کرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے منقطع ہوکر رہ گئے۔ لیکن چند دنوں کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا شاید اسی سلسلے کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ خودکشی کے متعلق طرز تحریر کا بغور معائنہ کرنے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ وہ تحریر کے دوران ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ ہم نے پوسٹ مارٹم کے دوران اس کے معدے کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا۔ تب اس کے معدے میں نیند کی گولیوں کی بھاری مقدار کو موجود پایا۔ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔ اگر اسے گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کرنا مقصود تھا

تب پھر بھلا نیند کی گولیاں کھانے کی کیا تک بنتی تھی۔

ہم نے آپ کی بیوی حدیبہ کو شامل تفتیش کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا تب ہمیں کیس کو وقتی طور پر بند کردینا پڑا۔ اب آپ کی بیوی اسے دوبارہ کھلوانا چاہتی ہے۔ وہ آپ کو مورد الزام گردانتے ہوئے اذلان علی کا قاتل قرار دیتی ہے۔''

میں اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ گیا تھا مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ میلانی مجھے چھوڑ کر جاچکی ہے۔ اور اب میرا مقابلہ حدیبہ کے ساتھ اذلان علی کی محبوبہ کے طور پر ہونے والا تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے انسپکٹر ایان کی طرف دیکھا اور تلخ لہجے میں پوچھا۔

''کوئی عینی گواہ یا پھر ٹھوس ثبوت..... ان فرض کی ہوئی باتوں کی بدولت آپ یا پھر میری بیوی مجھ پر قتل کا مقدمہ دائر نہیں کرسکتے۔ مقدمے کے لئے گزشتہ بالا دونوں وجوہات کا ہونا میرے خیال کے مطابق ضروری خیال کیا جاتا ہے۔''

انسپکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ نے درست فرمایا۔ ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی کی بدولت آپ کو گرفتار کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن آپ کی بیوی کے کہنے کے مطابق جب ہم نے اذلان علی کے گھر کی دوبارہ تلاشی لی تب ہمیں کوڑا کرکٹ ڈالنے والی ٹوکری میں سے ان نیند کی گولیوں کا پتا دستیاب ہوا جو اذلان علی نے خودکشی سے پہلے کھائی تھیں اس پتے پر نہ صرف آپ کا نام لکھا ہوا تھا بلکہ آپ کی انگلیوں کے نشانات بھی فنگر پرنٹ کی رپورٹ کے بعد دستیاب ہوگئے۔ نیند کی گولیوں کا یہ پتا شہر کے مشہور ڈاکٹر کی زیر نگرانی آپ کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ اور گولیوں کے پتے پر نام بھی اسی نے تحریر کیا تھا۔ یہ وہ ثبوت ہے جس کی موجودگی نے ہمیں آپ کو گرفتار کرلینے پر مجبور کردیا اب اگر آپ کو مزید کچھ کہنا سننا ہے تو اس کے لئے آپ کو مقدمے کی کارروائی کا انتظار کرنا ہوگا۔''

مجھے حوالات میں بند کردیا گیا۔ دو دن گزر گئے مجھ سے ملنے کے لئے جیل میں کوئی نہیں آیا۔

میلانی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اور حدیبہ کا کچھ اتا پتا موجود نہیں تھا۔

مقدمے کی کارروائی سے قبل میری اور میرے سرکاری وکیل کی آدھے گھنٹے پر مشتمل ملاقات ہوئی۔ وکیل نے میرا تمام بیان توجہ کے ساتھ سنا اس کے چہرے پر پُرتفکر لکیروں کا جال تنا ہوا دکھائی دینے لگا۔ جس سے مجھے اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ کہ وہ میرے بیان سے مطمئن نہیں تھا۔ اس بیان میں موجود پراسرار واقعات کی بناء پر مقدمہ لڑنا سراسر حماقت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے چند جگہ جھوٹ کا سہارا لینے کے بعد باقی سب کچھ اسے سچ بتایا تھا لیکن آپ جان ہی سکتے ہیں کہ ان واقعات کا عدالت میں پیش کیا جانا نہ صرف وکیل کی رسوائی کا باعث بنتا۔ بلکہ میرے کیس پر بھی اثر انداز ہوتا۔ میں مندرجہ بالا سطور پر اپنا بیان تحریر کئے دیتا ہوں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہوسکے کہ مقدمے کی کارروائی کیا نوعیت اختیار کئے ہوئے تھی۔

مختصر تعارف کے بعد وکیل نے جب مجھے حالات کی تفصیل بتانے کے لئے کہا تو میں بولا۔

''وکیل صاحب بات ناقابل فہم ہے بتانے پر شاید آپ میری دماغی حالات کو بھی مشکوک قرار دے سکتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسے قتل میں نے نہیں کیا ہے۔ یہ قتل میری دوسری بیوی میلانی کے ہاتھوں سرزد ہوا۔ اس کا پراسرار وجود غیر مرئی صورت کا حامل ہے آپ یقین نہیں کریں گے کہ وہ انسانی آبادی سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ اس کی اور میری ملاقات شہر بابانا کے پہاڑی علاقے میں واقع کھجوری تالاب کے قریب ہوئی۔ مختصر ملاقات کے دوران وہ مجھ پر فریفتہ ہوگئی اور شادی کی پیشکش سامنے رکھ دی۔ میں نے انکار کردیا تب وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے مصری شاہ میں واقع میرے مکان تک چلی آئی۔ اور اس کی ہوا پر مشتمل روح نے میری بیوی کے وجود پر قبضہ کرنے کے بعد من مانی شروع کردی۔

وہ میرے ساتھ شادی کے تقاضے کی ضد پر اڑی ہوئی تھی میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن میری بیوی حدیبہ کی شخصیت بھی مشکوک زدہ تھی اس کے ناجائز تعلقات اذلان علی کے ساتھ ہماری شادی سے بھی کچھ پہلے پائے جاتے تھے جب میلانی نے حدیبہ کے جسم اور دماغ پر قبضہ کیا تب میری زندگی خوشیوں سے بھرپور ہوتی چلی گئی۔ اور سرشاری کے عالم میں، میں نے اسے اذلان علی کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اس نے فوراً ہی ایسا کر دکھایا۔

لیکن میں نہیں جانتا کہ نیند کی گولیوں کا وہ پتا وہاں سے کیونکر دستیاب ہوا جس پر میرا نام تحریر تھا۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میلانی کو نیند کی گولیوں کا پتا میں نے ضرور دیا تھا لیکن اس پر میرا نام درج نہیں تھا۔ آپ یقین جانیے کہ یہ مجھے پھنسانے کی کھلی سازش کا ایک حصہ ہے۔'' میں خاموش ہوگیا۔

میرے بیان کردہ واقعات کو غور سے سننے کے بعد وکیل گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

''تمہارے مضحکہ خیز بیان کی روشنی میں یہ کہنا حتمی ہے کہ تمہیں پھانسی پر چڑھنے سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا۔ ان فضول باتوں کی روشنی میں ہوسکتا ہے کہ تمہیں ذہنی مریض گردانتے ہوئے پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔ لیکن تمہارے رہا ہونے کے چانسز پھر بھی نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔ پاگل خانے کی تفصیلی رپورٹ کے بعد جب انہیں اس بات کا یقین ہوجائے گا کہ تم صحت مند ہو تب پھر فیصلے پر عملدرآمد کرتے ہوئے تمہیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ میرے دماغ میں کوئی بھی حکمت عملی ایسی موجود نہیں ہے جس پر عمل کرتے ہوئے تمہیں پھانسی کی سزا سے بچایا جاسکے۔ سوائے اس کے تم اپنی بیوی کو مقدمہ واپس لینے پر مجبور کرو۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو پھر عقلمندی اس اقدام میں پوشیدہ ہے کہ تم عدالت میں اس بات کا بہ خوبی اظہار کرلو کہ اذلان علی کو تم نے بوجہ رقابت ہلاک کیا ہے۔ اس صورت میں تمہاری پھانسی کی سزا کو منسوخ کرکے اسے عمر قید میں تبدیل کردیا جائے گا۔ ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری صورت میرے دماغ میں موجود نہیں ہے۔''

میں نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔ اور وکیل حوالات سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے اپنے وکیل کے ذریعے حدیبہ کے ساتھ آخری ملاقات کی درخواست عدالت کو بھجوادی۔ درخواست کی منظوری کے بعد حوالات سے منسلک مختصر کمرے میں ہماری ملاقات ہوئی۔ یہ کمرہ دو صوفہ سیٹوں کے علاوہ ہر قسم کے ساز و سامان سے مستثنیٰ تھا وہ میرے سامنے صوفے پر براجمان تھی۔ میں نے تاسف بھری نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھا وہ سرد لہجے میں بولی۔

''مجھے یہاں بلانے کا مقصد.....؟''

میں نے زخم خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا ایک غیر آدمی کی حیثیت تمہاری نگاہوں میں شوہر کے رشتے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔'' وہ زہر خندہ لہجے میں بولی۔

اذلان مظلوم تھا اور تم ظالم ہو۔ میں ظالم کا ساتھ دینا کبھی بھی پسند نہیں کروں گی کیونکہ ایسا خدا بھی پسند نہیں کرتا۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اس بے وفائی کو خدا پسند کرتا ہے جس کا ارتکاب تم اور اذلان متعدد بار کرچکے ہو۔ اس وقت ظالم کون تھا۔ اور مظلوم کون تھا؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ایک مظلوم اور معصوم انسان کو بے دردی کے ساتھ قتل کردو۔''

اس دفعہ میں نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔

اسے میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ تم خود سوچ سکتی ہو کہ اگر میں ایسا کرنا چاہتا تو آج سے پہلے کئی دفعہ کرچکا ہوتا لیکن جب میں نے اس وقت نہیں کیا تو بھلا اب کیوں کرنے لگا۔''

www.Paksociety.com

وہ زہر خندہ لہجے میں بولی۔

"تو پھر اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"میلانی نے..... یہ پراسرار واقعات تمہارے شعور سے منحرف ہونے کے بعد وقوع پذیر ہوئے تھے یقین جانو۔ میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔" اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ مرنے والا مر گیا لیکن ہم دونوں تو زندہ ہیں اگر میرے وجود کی حیثیت تمہاری نگاہوں میں بے معنی ہے تو کم از کم اپنے بچوں کے متعلق ہی کچھ سوچ کر فیصلہ کرو۔ وہ باپ کے بغیر بھلا کیسے اچھی زندگی گزار پائیں گے۔" میں خاموش ہو گیا۔

وہ دوبارہ زہر خندہ لہجے میں بولی۔

"میری محبت مر گئی۔ تو سمجھ لو کہ میں بھی مر گئی۔ بظاہر زندہ دکھائی دینے والا میرا وجود میرے اور میرے بچوں کے لئے ناکارہ ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہارے پھانسی پر چڑھ جانے کے فوراً بعد بچوں سمیت خودکشی کرلوں گی۔ مجھے تمہارے علاوہ اس زندگی سے بھی نفرت ہے۔ جس میں اذلان موجود نہیں ہے۔" وہ بات کے اختتام پر جذباتی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئیں تھیں میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اب مزید کچھ کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا اس لئے خاموشی کے ساتھ مقدمے کی تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔

حدیبہ کے چہرے پر نفرت کے تاثرات دیکھنے کے بعد مجھے اس بات کا بہ خوبی احساس ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ اذلان سے محبت کرتی تھی۔ مجھے اس محبت کا علم دس سال قبل ہو گیا تھا۔ جب اس نے اذلان کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن محبت میں اتنی شدت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی ان کاوشوں اور کوششوں کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ جو وہ اپنے محبوب کی موت کا انتقام لینے کے لئے کر رہی تھی۔

مجھے شدت کے ساتھ میلانی کی عدم موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی میری نگاہوں میں اس کے وجود کی حیثیت حدیبہ کی نسبت بڑھنے لگی۔ میں نے دل میں پکا تہیہ کرلیا۔ کہ اگر قتل کے اس مقدمے سے میری جان خلاصی ہو گئی۔ تب میں حدیبہ کو طلاق دے دوں گا اس کے ساتھ مزید گزارا کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی باشعور انسان وہی کرتا۔ جو میں نے کیا تھا پھر ڈرکس بات کا تھا۔ غلط تو حدیبہ تھی اس نے جان بوجھ کر نیند کی گولیوں کا وہ پتا اذلان کے گھر منتقل کیا تھا۔ جس پر میرا نام تحریر تھا۔ وہ ایسے اوچھے ہتھکنڈوں پر بھی اتر سکتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا نفرت کی لہر میرے تن بدن کو گھیرے میں لینے لگی اور میں نے اپنے دماغ میں موجود بیان کو بدل دیا۔ اب میں وہ کچھ کرنے والا تھا جو مجھے بہت پہلے کرلینا چاہئے تھا شاید اس کی تذلیل کو مدنظر رکھتے ہوئے میں خاموشی اختیار کئے رہا تھا لیکن اب مجھے بولنے سے کوئی بھی روک نہیں سکتا تھا اور بولنا ہی میرے حق میں مفید ثابت ہو سکتا تھا میں نے مطمئن انداز میں آنکھیں موند لیں۔

یہ اگلے سوموار کی بات ہے مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا حدیبہ کا وکیل قابل اور تجربہ کار تھا اس کے چہرے کی سنجیدگی اور متانت اس بات پر منحصر تھی کہ اس کی تمام زندگی ایسے مقدمات سے نپٹتے ہوئے گزر گئی تھی یقیناً اس کی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی فیس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ اگر حدیبہ نے اس کی خدمات حاصل کیں تھیں تو وہ میرے کمائے ہوئے پیسوں کی مرہون منت تھیں جو مجھے ہی پھانسی پر چڑھانے کا سبب بن رہے تھے۔

عدالت کے کمرے میں تماشائیوں کے درمیان حدیبہ کے علاوہ سعد اور سعدیہ بھی موجود تھے۔ مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ حدیبہ کا وکیل آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں میرے کوائف اور بیانات پر مختصر کردہ وہ مختصر فائل موجود تھی جس کا مطالبہ وہ کم و بیش دس پندرہ دنوں سے کر رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"نصیر علی ولد شبیر علی..... تم پر عائد قتل کے مقدمے کی موجب تمہاری بیوی کی بدولت مقدمے کی اس کارروائی کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے اذلان علی ولد محمد علی کو قتل کیا؟ اگر کیا تو اس کی وجہ کیا تھی؟ عدالت کے منتظرین تمہارے بیان کے منتظر ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے حدیبہ اور اپنے بچوں کی طرف دیکھا نہ جانے کیوں میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔ شاید ان کی وجہ میرے بچوں کی صورت سامنے موجود تھی۔ وہ یقیناً میرا آخری دیدار تھا۔ مقدمے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد شاید میں انہیں دوبارہ نہیں دیکھ پاتا۔ میں نے قمیض کی آستین کے ساتھ آنسو پونچھے اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"معزز عدالت..... میں خدا کو حاضر ناضر جانتے ہوئے اس بات کا برملا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اذلان علی ولد محمد علی کو گلے میں پھندا ڈالنے کے بعد کھینچے کے ہک کے ساتھ لٹکا کر ختم کیا۔ لیکن مجھے اس قتل کا اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی محسوس نہیں ہو رہی ہے کوئی بھی انسان آپے سے باہر ہونے کے بعد ایسا کر سکتا ہے شاید ہمارے مذہب میں غصے کو حرام اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرار دیا گیا کہ آنکھوں پر بندھ جانے والی پٹی کی بدولت وہ حوش و ہواس سے بیگانہ ہو کر وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جو عام حالات میں کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے اسے قتل کیا اور مجھے کرنا بھی چاہئے تھا اگر آج سے دس سال قبل کر دیتا تو زیادہ بہتر ہوتا اس صورت میں چار زندگیوں کے بجائے صرف دو متاثر ہوتیں آج چار ہو رہی ہیں ہم دونوں کے علاوہ ہمارے بچوں کی بھی.....

مشرق کی آدھے سے زیادہ شادیوں کی ناکامی کی وجہ لڑکیوں کی رضا مندی کو معیوب نگاہ سے دیکھنا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس بندھن میں بندھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں جن میں بندھنا نہیں چاہتیں۔ بعد ازاں وہ اپنے گھر کو بنانے کی کوشش کرنے کے باوجود بھی بنا نہیں پاتیں۔

میرے اور حدیبہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ شادی سے قبل اذلان سے محبت کرتی تھی اذلان علی ایک گونگا اور مریض انسان تھا حدیبہ کے والدین نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے حدیبہ کی شادی میرے ساتھ کر دی۔ لیکن وہ اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کر پائی اور چھپ چھپ کر اذلان علی کے ساتھ ملتی جلتی رہی۔ ایسی باتیں عام حالات میں چھپ نہیں پاتیں لیکن ان دونوں نے تو چھپانے کی کوشش ہی نہیں کی جو بھی کیا سر عام کیا متعدد بار مجھے اپنی بیوی کے جسم پر موجود ان تشدد بھرے نشانات کا سامنا کرنا پڑا جو کسی کی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت تھے اذلان علی شادی کے قابل نہیں تھا اس کے باوجود بھی ایک شادی شدہ عورت کی زندگی کو برباد کرنے پر تلا ہوا تھا شادی کے چند عرصہ بعد میری حاملہ بیوی نے اس کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کی میں نے بروقت پھرتی دکھاتے ہوئے انہیں رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا اور حدیبہ کو سمجھانے بجھانے کے بعد گھر لے آیا۔ معاملہ ہمارے گھر کی حدود سے نکل کر میرے سسرالیوں تک جا پہنچا۔ اس کے ماں باپ نے سمجھا بجھا کر اسے دوبارہ میرے گھر بھیج دیا۔

میری محدود سوچ کے مطابق شاید وہ اپنے کئے پر پشیمان تھی اس لئے اس نے وقتی طور پر اذلان علی کے ساتھ ملنا جلنا ترک کر دیا اس مختصر عرصے کے دوران ہمارے دو بچے سعدیہ اور سعد پیدا ہوئے ہم دونوں ان کے مسائل میں گم ہوتے چلے گئے۔

دس سال بعد ایک دفعہ پھر اس کی شادی سے پہلے کی محبت اچانک اور نہ جانے کس وجہ سے جاگ اٹھی۔ اور ان دونوں نے دوبارہ ملنا جلنا شروع کر دیا مجھے اپنی بیوی کے جسم پر موجود نشانات کی بدولت باخوبی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کن دنوں میں بے وفائی کی مرتکب ہوتی تھی اور کن دنوں میں نہیں ہوتی تھی میں نے اسے لاکھ منع کیا لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور اس نے اپنی روش کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ تب مجبوراً میں نے اذلان کو ہلاک کر دیا۔" وکیل نے طویل

سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

’’ہوش وحواس سے بھرپور انسان کو پنکھے کے ساتھ لٹکانا کوئی آسان بات نہیں ہے تم نے یہ کیسے کر دکھایا۔‘‘

میں نے جواب دیا۔ ’’یہ کوئی سوچی سمجھی پلاننگ نہیں تھی۔ جو میرے دل نے کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ مثلاً اسے بات چیت کے لئے راضی کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ ملاقات کے دوران میں نے اس سے چائے بنانے کی درخواست کی۔ اور دوران بات چیت اس کے کپ میں نیند کی گولیاں شامل کر دیں وہ چائے پینے کے فوراً بعد مدہوش ہوتا چلا گیا تب میں نے اس کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے ہک کے ساتھ لٹکا دیا۔‘‘

عدالت کا متحیر زدہ ماحول حدیبہ کی ہچکیوں سے گونجنے لگا۔ اور میں خاموش ہوگیا۔

چند لمحے بعد وکیل دوبارہ بولا۔

’’اگر تم مجھے چائے میں اتنی نیند کی گولیاں ڈال کر پلانے کی کوشش کرو تب اس کے کڑوے پن کی بدولت مجھے فوراً تبدیلی کا احساس ہو جائے گا۔ تمہارے بیان میں جھول موجود ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارے ساتھ قتل کے اس اقدام میں کوئی دوسرا وجود بھی موجود تھا۔ جو تمہاری مدد کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں وہ دکھائی نہیں دیتا لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ وہ بے شک ہے کہاں ہے؟ اس کے متعلق شاید تم باخوبی جانتے ہو۔ پوچھنا فضول ہے کیونکہ تم اعتراف جرم کر چکے ہو اس لئے میں مزید کارروائی کو ترک کرتے ہوئے تمہارے وکیل کو سامنے آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر وہ میرے موکل سے کسی بھی قسم کے سوالات پوچھنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے۔‘‘ وکیل خاموش ہوگیا۔

جج نے میرے وکیل کو سامنے آنے کا حکم دیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کٹہرے کے پاس چلا آیا۔ پھر متانت بھرے لہجے میں بولا۔

’’میرے موکل کے اعتراف جرم کر لینے کے بعد مزید کسی قسم کی پوچھ گچھ کی ضرورت باقی نہیں بچتی۔ لیکن میں عدالت سے یہ اپیل ضرور کروں گا کہ اس اعتراف جرم کو مدنظر رکھتے ہوئے موکل کی سزا میں نرمی کے عمل دخل کو ضرور سامنے رکھا جائے۔ شکریہ۔‘‘ بات مکمل کرنے کے بعد وکیل اگلی رو میں موجود اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ماحول میں گمبھیر خاموشی طاری ہوتی چلی گئی۔

جج نے سامنے رکھے ہوئے قلم دان میں قلم اٹھایا اور میز پر رکھے ہوئے صفحات پر نوٹس ترتیب دینے کے بعد عدالت میں بیٹھے سامعین و ناظرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

’’عدالت ایک گھنٹے کے لئے برخاست کی جاتی ہے۔‘‘ فیصلہ ایک گھنٹہ بعد کیا جائے گا۔ اس نے بآہستگی اپنی کرسی کو پیچھے کی طرف کھسکایا اور اٹھ کر عدالت سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

وہ ایک گھنٹہ نہایت اذیت کے عالم میں گزرا۔ میں اور عدالت میں موجود تمام تماش بین جج کے فیصلے کے متعلق باآسانی اندازہ لگا سکتے تھے اور کیا کہوں مجھے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا لٹکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں اتنے اذیت ناک پل یک لخت گزر گئے وہاں یہ گھنٹہ بھی بیت گیا اور مجھے دوبارہ عدالت میں پیش کر دیا گیا مختصر کارروائی کے بعد جج میرے اور حدیبہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہمکلام ہوا۔

’’آپ دونوں میں سے کوئی اگر اپنے حق میں مزید کچھ کہنا چاہتا ہے تو کٹہرے میں آ کر کہہ سکتا ہے آخری موقع آپ دونوں کے پاس محفوظ ہے۔‘‘

میں نے بے چارگی کے عالم میں سر کو نفی میں ہلایا۔

جج نے حدیبہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے رقص کرتے دکھائی دے رہے تھے جواب دینے کے بجائے اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

جج نے اپنے سامنے موجود کاغذ کے اس صفحے کی طرف دیکھا جس پر مختصر کارروائی کی تفصیل کے علاوہ وہ فیصلہ بھی درج تھا جو سراسر میرے خلاف تھا۔

جج نے میز پر رکھے ہوئے قلم دان میں سے قلم اٹھایا لیکن قلم اس کے بوڑھے ہاتھوں میں کانپتے رہنے

کے بعد ہلکی سی آواز کے ساتھ میز پر گر گیا ہال کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی قلم کی وہ ہلکی سی آواز بم کے دھماکے کی مانند سنائی دی کرسیوں پر براجمان تماشائیوں نے چونک کر جج کی میز کی طرف دیکھا جج نے ہلکی سی شرمندگی کے ساتھ قلم کو اٹھانے کی کوشش کی تب اچانک ہی عدالت کا ماحول حدیبہ کے بے اختیار قہقہے سے گونج اٹھا۔ میں نے چونکتے ہوئے حدیبہ کی طرف دیکھا۔ وہ پیٹ کو ہاتھوں سے دبائے بے اختیار ہنستی چلی جا رہی تھی ہال میں موجود تماشائیوں نے بھی جج کی طرف دیکھنے کے سلسلے کو منقطع کیا اور حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ حدیبہ کی طرف دیکھنے لگے۔

جج نے ایک طرف رکھا ہوا لکڑی کا مختصر ہتھوڑا اٹھایا اور میز پر ضرب لگاتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔

’’مہربانی کر کے عدالت کے تقدس کو مدنظر رکھتے ہوئے خاموش ہو جائیے۔‘‘

لیکن حدیبہ نے خاموش ہونے کی کوشش نہیں کی۔

میرا چہرہ خوشی کی بدولت چمکنے لگا۔

اور میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

فیصلہ تبدیل کرنے والی ہستی آ گئی ہے یقیناً یہ حدیبہ نہیں ہے بلکہ میلانی ہے۔ جج نے دوبارہ ہتھوڑے کو میز پر مارا۔

تب حدیبہ نے بمشکل تمام اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے معذرت بھری نگاہوں کے ساتھ جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’معاف کیجیے گا۔ لیکن آپ کے چہرے پر موجود مضحکہ خیز تاثرات نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا کہ مقدمے کے دوران آپ کے لئے پریشانی کا باعث بنوں لیکن فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ انسانی اشکال پر نمودار ہونے والے یہ تاثرات میرے لئے دلچسپی کا باعث ثابت ہوئے ہیں۔‘‘ وہ اپنی ذات کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ مجھے جس وقت کا شدت کے ساتھ انتظار تھا وہ وقت آ پہنچا تھا۔ اگر اسے واپس آنے میں چند لمحات کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

حدیبہ خاموش ہوگئی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

’’اگر اجازت ہو۔ تو میں کٹہرے میں آ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔‘‘ جج نے اسے کٹہرے میں آنے کی اجازت دے دی۔ وہ اٹھ کر وہاں چلی آئی۔

پھر سنجیدہ لہجے میں بولی۔

’’معاف کیجیے گا۔ میں اپنے گزشتہ بیان کی نفی کرتے ہوئے موجودہ اور حتمی بیان عدالت کے فیصلے سے قبل ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں جس کی رو سے میں قتل کے مقدمے کو یہیں معطل کرتے ہوئے اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ میرے پہلے بیان کو رد کرنے کی بدولت عدالت کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرے غیر شرعی آشنا کی موت کا باعث شرعی شوہر تھا۔ میرے شوہر کو اس کی سزا چند عرصہ جیل میں قید رہنے کی بدولت مل چکی ہے۔ لیکن میں اسے مزید سزا نہیں دینا چاہتا ہوں کیونکہ ایسا کرنے سے جہاں ہمارا گھرانہ متاثر ہوگا وہاں گھر میں موجود دونوں بچوں کی زندگیوں پر بھی یہ سزا اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں اپنے شوہر کو معاف کرنے کے بعد باعزت طور پر بری کرنے کی اپیل دائر کرتا ہوں۔ میرا حتمی اور فیصلہ کن بیان آپ کے سامنے ہے۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ سنا دیجیے۔ ہم سب آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔‘‘ حدیبہ خاموش ہوگئی۔

میں نے طنزیہ نگاہوں کے ساتھ جج کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں تھے۔ ظاہر کہ اسے حدیبہ کے آخری بیان کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے تمام بیانات کو مسترد کرنے کے بعد اس فیصلے کو تبدیل کرنا تھا جس کی تیاری وہ کر کے آیا تھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ ہمکلام ہوا۔

’’حدیبہ نصیر کے موجودہ بیان نے گزشتہ بیان کی نفی کرتے ہوئے فیصلے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے ایسا کیونکہ ہوا میری عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ لیکن اس بیان کے بعد اب مزید کارروائی یا پھر گفت و شنید ممکن نہیں رہی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں برملا اس فیصلے کا اعلان کرتا ہوں کہ موجودہ کیس کا ملزم نصیر احمد بوجہ رقابت اذلان علی ولد محمد علی کے قتل میں ملوث پائے جانے کے باوجود باعزت طور پر بری کیا جاتا ہے۔ اس پر قتل کا مقدمہ واپس دائر کرنا اس کی بیوی حدیبہ نصیر کی بدولت ہوا۔ اور حدیبہ نصیر کے ہی مقدمہ واپس لینے کی بدولت کیس کا قطعی طور پر اخراج کیا جاتا ہے۔ عدالت نصیر احمد ولد شبیر احمد کو باعزت طور پر بری کرنے کا حکم دیتی ہے۔" اس نے فیصلے کا اختتام کردیا اور اٹھ کر عدالت سے ملحقہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

میں نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے سامنے کٹہرے میں کھڑی ہوئی میلانی کی طرف دیکھا اور خاموشی کے ساتھ عدالت سے باہر نکل آیا۔

رات کو محبت کے عہد و پیمان اور جذباتی حدود کو پار کرنے کے بعد میں نے میلانی کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ بھرے لہجے میں چند دن غیر حاضر رہنے کی وجہ دریافت کی تب وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تمہارے ساتھ شادی کرنا۔ یا پھر تمہاری آبادی میں مستقل رہنا میرا عین مقصد نہیں تھا۔ میرا مقصد تو صرف اولاد کا حصول تھا۔ اگر تم مجھے پہلے دے دیتے تب میں کبھی بھی تمہارے ساتھ شادی نہیں کرتا تم یقین جانو ہوا پر مشتمل میرا وجود اس قابل نہیں تھا کہ ماں جیسا مقام حاصل کر پاتا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے حدیبہ کے وجود کا ہونا لازم و ملزوم تھا میں نے اسے بخوبی استعمال کیا میری اس خود غرضانہ سوچ کی بدولت تم دونوں کی خوشحال زندگی متاثر ہوئی میں اس کے لئے نہایت شرمندہ و پشیمان ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ بحالت مجبوری کرنا پڑا اگر نہ کرتا تو تم مجھے کبھی بھی منہ نہ لگاتے۔

میں حدیبہ نصیر کا بھی مجرم ہوں وہ سعدیہ کی پیدائش کے بعد اذلان کو فراموش کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا میں نے اسکے سرد پڑتے ہوئے جذبات کو دوبارہ بیدار کیا۔ اور اسے مجبور کیا کہ وہ دوبارہ محبت کے سلسلے کو وہیں سے جوڑنے کی کوشش کرے۔ جہاں سے یہ سلسلہ منقطع ہوا تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ تم دونوں کے رشتے میں دراڑ ڈالنا میرے لئے اس وجہ سے ضروری تھا تاکہ تم حدیبہ سے کنارہ کش ہو کر مجھے اس کے وجود میں رہتے ہوئے برداشت کرسکو۔ تم نے ایسا ہی کیا اب تمام کھیل ختم ہو چکا ہے میں تمہارے علاوہ حدیبہ سے بھی معافی کا خواستگار ہوں آج کے بعد تم دونوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے تمہاری آبادی سے میری اوقات سے زیادہ مل چکا ہے میں تمہارا اور تمہاری آبادی کا شکر گزار ہوں جس کی بدولت مجھے ماں بننے کا مقام حاصل ہوا۔

میرے واپس آنے کی وجہ تمہارا یہ احسان ہی ہے میں تمہاری زندگی برباد کرکے اس احسان کو فراموش نہیں کرسکتا تھا اس لئے میں نے واپس تمہاری آبادی میں آنے کا فیصلہ کیا اور نا صرف تمہاری مقدمے سے خلاصی کروائی بلکہ حدیبہ کے دماغ سے وہ چند نقوش اور یادیں بھی ختم ہو جائیں گی جن کی بدولت تمہاری آگے کی مزید زندگی متاثر ہوسکتی تھی۔ میں واپس اپنی آبادی میں جارہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ تم اور حدیبہ مجھے ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد رکھو گے۔

خدا حافظ۔

کمرے میں یکلخت خاموشی طاری ہوگئی۔ میں نے چونک کر حدیبہ کے وجود کی طرف دیکھا وہ آنکھیں کھولے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہاں پر اب سرد جذبات موجود نہیں تھے بلکہ پیار و محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دے رہا تھا میلانی نے اس کے دل و دماغ سے اذلان کی یادوں کو صاف کردیا تھا وہ یقیناً اسے بھلا چکی تھی اس نے میرے ہاتھ کو نرمی کے ساتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"رات زیادہ ہوگئی ہے۔ صبح آپ نے کام پر بھی جانا ہے۔ اب آپ کو سو جانا چاہئے۔" اور میں نے کروٹ بدل کر مطمئن انداز میں آنکھیں موند لیں میرے جسم کا رواں رواں میلانی کے وجود کا شکر گزار تھا۔ جس نے میری زندگی کو یکسر تبدیل کرکے رکھ دیا تھا۔

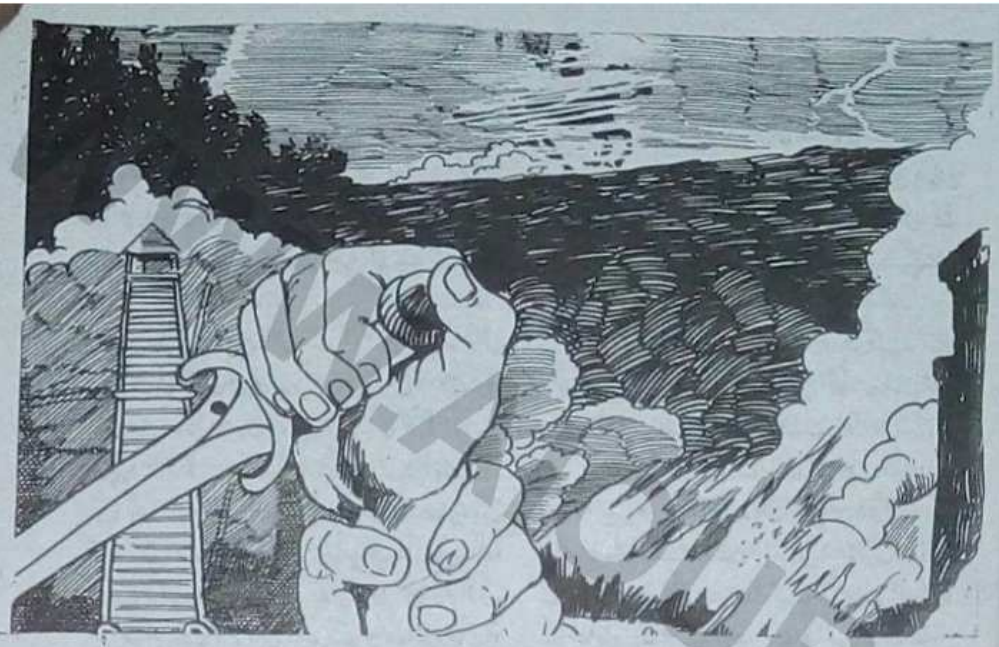

آسیبی آئی لینڈ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

خود اپنے دام میں صیاد آگیا اسی کے مصداق خود شکنجہ تھامے خونی شکاری آگے ہی آگے بڑھتا رہا اور جب شکار کی نظر اس پر پڑی تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا مگر اچانک وقت پلٹا اور شکاری خود شکار ہوگیا۔

قدم قدم پر لرزہ براندام کرتی موت کی دستک نے جسم و جاں کو ساکت کردیا، خونی کہانی

"**ہاں!** اس جزیرے پر کوئی بھی جہاز جا کر واپس نہیں آیا۔"

"سامنے دور دائیں طرف کہیں وہ جزیرہ ہے۔" ڈنی نے کہا۔ "جو قدیم نقشوں پر شپ ٹریپ آئی لینڈ۔" (جہاز پھانسنے والا جزیرہ) کے نام سے موسوم ہے۔ اس جزیرے سے ملاح عجیب قسم کا خوف کھاتے ہیں جو غالباً کسی توہم کا نتیجہ ہے۔"

رات کی گرم اور بھیگی ہوئی دبیز چادر سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے رینز فورڈ بولا۔

"نظر تو نہیں آرہا!"

"ہم جب چند روز میں برازیل پہنچ جائیں گے۔" ڈنی نے کہا۔ "تو روشنی کافی ہوگی اور ہم دریائے ایمیران کے اوپر والے حصے میں خوب شکار کھیلیں گے۔ شکار کیسا عظیم کھیل ہے۔"

کچھ دیر بعد ریز فورڈ کا ساتھی سونے کے لئے کشتی کے نچلے حصے میں چلا گیا مگر ریز فورڈ اپنا پائپ پینے کے لئے عرشے پر ہی ٹھہر گیا۔ جونہی اس نے کوشش لگایا اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہی آواز دو مرتبہ اور آئی۔ دور کہیں تاریکی میں کسی نے تین مرتبہ بندوق کے فائر کئے تھے۔

آواز کی سمت اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی کمبل میں سے دوسری جانب دیکھنے کی کوشش کرے چنانچہ ریز فورڈ چھلانگ لگا کر جنگلے پر چڑھنے لگا تاکہ اونچی جگہ سے وہ اس سمت دیکھ سکے جدھر سے بندوق کے فائر کی آواز آئی تھی۔ مگر اس کا پائپ رسے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ اسے پکڑنے کے لئے وہ جھپٹا تو توازن کھو بیٹھا اور نیچے گرم شرق الہند کے سمندر میں جا گرا، گہرائی سے فوراً سطح پر آ کر اس نے بہت زور سے پکارا مگر بے سود، شدید مایوسی کے عالم میں اس نے کشتی کے پیچھے بھاگتی ہوئی روشنیوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ جلد ہی رات کی تاریکی میں غائب ہو گئیں۔ بندوق کے فائر کی آواز چونکہ دائیں طرف سے آئی تھی، اس لئے ریز فورڈ نے مضبوط ارادے سے اسی سمت تیرنا شروع کر دیا جو بظاہر ایک نہ ختم ہونے والا سفر تھا مگر اسی دوران رات کی تاریکی میں اس نے کسی خوف زدہ جانور کی چیخ سنی جو پستول کے مسلسل اور کڑا کے دار فائر میں دب کر رہ گئی۔ ان آدمیوں پر نگاہ پڑنے سے پیشتر وہ چٹانوں پر پہنچ چکا تھا۔ اپنی بچی کھچی قوت سے اس نے اپنے آپ کو پانی کے گرداب سے باہر کھینچ لیا اور ہانپتے ہوئے خود کو نیچے گرا دیا۔ لیکن تھکن کی وجہ سے وہ فوراً ہی خواب کی دنیا میں پہنچ گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو جھٹپٹے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اسے سمندر کے کنارے سے اوپر کی طرف جنگل میں جانے والا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ لہٰذا آسان یہی تھا کہ کنارے کے ساتھ ساتھ چلا جائے۔ اس سے قبل کہ آگے نکل جاتا، ریز فورڈ کو سامنے اونچی کھڑی چٹان پر ایک بڑے مکان کی روشنیاں نظر آئیں، اندھیرے نے سمندر اور جنگل کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ اس نے مکان کی پتھر کی سیڑھیاں عبور کیں تو وردی میں ملبوس ایک ہٹے کٹے آدمی نے دروازہ کھولا جس کی سیاہ داڑھی اس کی ناک نیچے تک لٹک رہی تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" ریز فورڈ نے کہا۔ "میں ایک کشتی سے گر پڑا تھا۔ میرا نام سینگر ریز فورڈ ہے۔ اور میں نیویارک کا رہنے والا ہوں۔"

اسی دوران شام کے لباس میں ملبوس ایک دراز قد اور سفید بالوں والا آدمی وہاں آ پہنچا اور ریز فورڈ کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا نام جنرل زیراف ہے اور مجھے مسٹر سینگر ریز فورڈ جیسے نامی گرامی شکاری کا خیر مقدم کرتے ہوئے بہت خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ میں نے شکار پر آپ کی وہ کتاب پڑھی ہے جس کے اندر تبت میں برفانی تیندوے کے شکار کا ذکر ہے۔"

پھر اس نے کچھ اشارہ کیا اور باوردی آدمی نے اپنا ریوالور رکھ دیا۔ "آئی ون ناقابل یقین حد تک مضبوط آدمی ہے۔" جنرل بولا مگر تھوڑا سا وحشی ہے۔ یہ بھی قزاق ہے اور میں بھی قزاق ہوں۔"

"لیکن چلئے ہم یہاں باتیں نہیں کریں گے۔ آپ کو کپڑوں، کھانے اور آرام کی ضرورت ہے اب براہ کرم مسٹر ریز فورڈ آپ آئی ون کے ساتھ چلیں۔"

جب وہ مکان کے پروقار ہال میں رات کے کھانے پر بیٹھے تو جنرل نے کہا۔ "آپ یہ سن کر شاید حیران ہوں گے کہ میں نے آپ کا نام کیسے جانا۔ میں شکار کے موضوع پر تمام کتابیں پڑھتا رہتا ہوں اور میری زندگی کا واحد شوق شکار ہے۔"

دیواروں پر نظر دوڑاتے ہوئے ریز فورڈ نے کہا۔ "آپ کے پاس یہاں جانوروں کے کچھ عمدہ سر موجود ہیں۔ وہ افریقی بھینسا بہت بڑا ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہی خیال ہے کہ بڑے جانوروں کے شکار میں

افریقی بھینسا سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" جنرل نے جواب دیا۔ "یہاں میں اپنی شکارگاہ میں زیادہ خطرناک شکار مارتا ہوں۔ قدرتی طور پر یہ شکار یقیناً یہاں نہیں ہے۔ مجھے اس جزیرے پر یہ شکار جمع کرنا پڑتا ہے۔"

"جنرل آپ نے کیا درآمد کیا ہے؟"

"شیر....." جنرل نے مسکرا کر کہا۔ "اب شیروں میں کوئی سنسنی باقی نہیں رہی۔ یہ کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ میں تو خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے زندہ ہوں۔ مسٹر ریز فورڈ۔"

"پھر وہ کون سا شکار ہے؟"

"میں آپ کو بتاؤں گا۔ مجھے بالآخر یہ خیال آیا تھا کہ اپنے شکار کے لئے ایک نیا جانور دریافت کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ ایک مثالی شکار میں کیا وصف ہونے چاہئے۔ تو جواب ملا کہ اس میں حوصلہ، مکاری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استدلال کی قابلیت ہونی چاہئے۔ خوش قسمتی سے ایسا ایک ہی جانور ہے جو دلائل دے سکتا ہے۔"

"لیکن آپ کا مطلب اس سے..... تو نہیں کیوں کہ جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ تو قتل ہے شکار نہیں۔"

"اف، کتنا خراب لفظ آپ نے استعمال کیا ہے۔ میں تو صرف دھرتی کی میل کا شکار کرتا ہوں یعنی آوارہ گرد جہازوں کے ملاح۔ ادھر کھڑکی کی طرف آؤ۔"

جونہی اس نے ایک بٹن دبایا، سمندر میں دور تک روشنیاں چمک اٹھیں۔ "یہ روشنیاں ایک ایسی رودبار کی نشاندہی کر رہی ہیں۔" جنرل بولا۔ "جہاں صرف استرے کی طرح تیز کناروں والی چٹانیں ہیں جو ایک جہاز کو اخروٹ کی طرح توڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ ایک تھیل ہے۔ آیا آپ کے دھیان میں؟ پھر میں اپنے مہمانوں میں سے کسی شکار کا جھانسہ دے کر ساتھ لے جاتا ہوں۔ میں اسے تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ پھر میں اعشاریہ بائیس کے پستول سے لیس ہو کر اسے تلاش کرتا ہوں۔ اگر میرا شکار مجھے پورے تین روز تک جل دینے میں کامیاب ہو جائے تو وہ جیت جاتا ہے اور اگر میں اسے ڈھونڈ نکالوں۔" جنرل نے مسکرا کر کہا۔ "تو وہ ہار جاتا ہے۔"

"فرض کریں آپ کا شکار، شکار ہونے سے انکار کر دے تو۔"

"تو پھر میں اسے آئی ون کے حوالے کر دیتا ہوں۔ یہ شخص ایک سادہ لوح آدمی ہے جو وائٹ زار اعظم کا کوڑے باز بھی رہ چکا ہے۔ اور اس کے شکار کھیلنے کے اپنے طریقے ہیں۔ مگر عموماً میرے مہمان شکار بننے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔"

"اگر وہ جیت جائیں تو؟"

اس پر جنرل کھل کر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "آج تک تو میں نہیں ہارا۔ ہاں، البتہ ایک آدمی قریب قریب جیت گیا تھا اور آخر کار مجھے اس پر کتے چھوڑنے پڑے۔" یہ کہہ کر وہ اسے دوسری کھڑکی کی طرف لے گیا اور کہا۔

"دیکھ لو۔"

کھڑکی سے نیچے ریز فورڈ کو درجن کے قریب بڑی بڑی کالی شکلیں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں۔

"اور اب میں آپ کو سروں کا ایک تازہ ذخیرہ دکھانا چاہتا ہوں۔ چلئے لائبریری میں چلیں، چلیں گے آپ؟"

"نہیں۔" ریز فورڈ نے کہا۔

"ہوں میں سمجھا۔ آپ کو یقیناً رات بھر اچھی نیند لینی ہے۔ صبح آپ اپنے آپ کو بالکل تر و تازہ محسوس کریں گے۔"

اگلی صبح دوپہر کے کھانے کے وقت تک جنرل زیراف نظر نہ آیا لیکن کھانے کے وقت ریز فورڈ نے دیکھا کہ اس کی تیز سیاہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی ہیں۔

"آج رات" جنرل نے کہا۔ "ہم شکار کریں گے۔ تم اور میں۔"

"نہیں جنرل۔" ریز فورڈ بولا۔ "میں شکار نہیں کروں گا۔"

www.paksociety.com

جنرل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرا شکار کھیلنے کا طریقہ آئی ون کے طریقے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ آپ اس کھیل کو دلچسپ پائیں گے کیوں کہ آپ کی سوچ، آپ کا جنگل کا تجربہ اور آپ کا حوصلہ میری سوچ تجربے اور حوصلے سے ٹکرائیں گے اور بے حد لطف آئے گا۔''

''اور اگر میں جیت جاؤں تو۔'' رینز فورڈ بولا۔

''اگر میں آپ کو تیسرے روز آدھی رات تک نہ ڈھونڈ سکوں تو میں اپنی شکست تسلیم کرلوں گا اور میری بادبانی کشتی آپ کو اس جزیرے سے باہر خشکی پر پہنچا آئے گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

جنرل زیراف نے کاروباری انداز میں کہا۔ ''آئی ون آپ کو شکار کا لباس، کھانا اور ایک چاقو دے دے گا۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جزیرے کے جنوب مشرقی کونے کے دلدلی حصے سے بچ کر رہیں۔ ہم اسے موت کا کنواں کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں ایک خوف ناک دلدل موجود ہے۔ میں اندھیرا ہونے تک آپ کا تعاقب نہیں کروں گا۔ آپ کا اپنا کیا خیال ہے۔''

☆.....☆.....☆

جلد ہی ظاہر ہونے والے خطرے کے پیش نظر رینز فورڈ کوئی دو گھنٹے تک جنگل کی جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا ہوا دوڑتا رہا۔ خوف دہراس نے اس کے لئے چبھتی ہوئی برچھیوں کا کام کیا۔ اب اس نے رک کر اپنا جائزہ لیا۔

اس نے سوچا کہ اس طرح اندھا دھند سیدھ میں میرا چلتا اسے میرے راستے پر ڈال دے گا۔ اس موقع پر اسے لومڑی کے شکار کے قصے یاد آئے کہ کس طرح لومڑی شکار میں حیلوں اور داؤ پیچ سے کام لیا کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے بھی کئی پیچ در پیچ چکر اور زاویے بنائے اور قدموں کے نشانات کو غارت کرنے کے لئے آگے چلتا ہوا انہیں قدموں پر واپس ہو کر دوبارہ آگے چلتا رہا۔

اس نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ اب اندھیرا چھا گیا تھا اور وہ تھکا ماندہ پہاڑیوں کے ایک ایسے سلسلے پر پہنچ گیا جو جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے سوچا لومڑی والے حیلے تو میں کر چکا ہوں اب بلی والا عمل اختیار کرنا چاہئے۔ نزدیک ہی ایک بڑا درخت تھا جس کی موٹی موٹی شاخیں اردگرد پھیلی ہوئی تھیں اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کے قدموں کا کوئی نشان باقی نہ رہے وہ درخت پر چڑھ گیا اور اس کی چوڑی شاخ پر لیٹ گیا۔

اب رات آہستہ آہستہ اپنا سیاہ خیمہ پھیلا رہی تھی۔ اس نے کسی شے کو احتیاط سے آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں سے آتے سنا۔ وہ شاخ کے ساتھ شاخ ہو کر لیٹ گیا اور گھنے پتوں کی چادر میں سے جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ جنرل زیراف ہی تھا۔ وہ راستہ طے کرتا ہوا آرہا تھا مگر اس کی آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں چلتے چلتے وہ قریب قریب درخت کے نیچے ہی آرکا اور رکوع کی حالت میں ہو کر زمین کا جائزہ لینے لگا پھر تن کر کھڑا ہو گیا اور ایک لمبا سیاہ رنگ کا سگریٹ سلگانے لگا۔

رینز فورڈ نے جب دیکھا کہ جنرل کی آنکھیں درخت کے نیچے سے اوپر تک ایک ایک انچ کا جائزہ لے رہی ہیں تو اس نے اپنی سانس روک لی۔ مگر شکاری کی آنکھیں اس شاخ تک پہنچنے سے پہلے ہی رک گئیں جس پر شکار موجود تھا۔ دیدہ دانستہ طور پر جنرل زیراف مسکرایا اور دھوئیں کا ایک حلقہ ہوا میں چھوڑ کر بے پرواہی سے آگے چل دیا۔

رینز فورڈ نے اب اپنی رکی ہوئی سانس چھوڑی۔ اسے پہلا خیال یہ آیا کہ جنگل میں رات کے وقت جنرل صاف طور پر مشکل کھوج لگا سکتا تھا۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ وہ اپنے شکار کو نہ دیکھ سکا تھا۔

اس کے بعد اسے دوسرا خیال یہ آیا کہ جنرل مسکرایا کیوں تھا، اور واپس کیوں چلا گیا۔ درحقیقت جنرل اس کے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کھیل رہا تھا، اور اسے دوسرے روز شکار کرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

رینز فورڈ کو اس خیال کے آتے ہی خوف اور دہشت کی حقیقت معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ درخت سے اتر پڑا اور جنگل میں روانہ ہو گیا۔

کوئی تین سو گز کے فاصلے پر وہ ایک ایسی جگہ رکا جہاں ایک بڑا سوکھا ہوا درخت ایک چھوٹے درخت پر خطرناک صورت میں جھکا ہوا تھا۔ رینز فورڈ نے نیام سے چاقو نکالا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ جب کام ختم ہو گیا تو وہ خود کوئی ایک سو فٹ دور نیچے پڑی ہوئی کیلی کے پیچھے لیٹ گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا یہ قزاق کھوج لگانے میں اتنا منہمک تھا کہ اس چیز کے عین اوپر پہنچ کر اسے پتا چلا۔ اس کا پاؤں باہر نکلی ہوئی شاخ سے ٹکرایا جو لبلبی کا کام کرتی تھی۔ جنرل کو فوراً خطرے کا احساس ہوا۔ وہ پیچھے کودا، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ سوکھا ہوا درخت تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ نیچے گرا اور جنرل پر ایک سرسری سی ضرب پڑی۔ وہ کھڑا ہو کر اپنے زخمی کندھے کو سہلاتا رہا اور پھر اس کی مصنوعی قہقہے کی گونج جنگل میں سنائی دی۔

اس نے زور سے پکارا۔ ''رینز فورڈ، میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ملیشیاء کے آدمی کو گرفتار کرنے والا یہ پھندا جو آپ نے میرے لئے بنایا ہے ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ مسٹر رینز فورڈ آپ بہت دلچسپ آدمی ثابت ہو رہے ہیں۔ میں اب اپنے زخم پر پٹی کرنے جا رہا ہوں۔ زخم معمولی سا ہے آپ فکر نہ کریں، میں واپس آؤں گا۔''

جب جنرل چلا گیا تو رینز فورڈ وہاں سے بھاگ نکلا۔ چلتے چلتے شام کا دھندلکا پھیلنے لگا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ اس کے پاؤں اب پہلے سے زیادہ نرم زمین پر پڑنے لگے۔ اس نے آگے قدم بڑھایا تو اس کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا۔ رینز فورڈ فوراً سمجھ گیا کہ یہ دلدل موت کا کنواں ہے۔

زمین کی نرمی سے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ دلدل سے کوئی بارہ فٹ پیچھے ہٹ کر اس نے گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ جب گڑھا اس کے کندھوں سے اوپر تک تیار ہو گیا تو وہ اس میں سے باہر آ گیا اور سخت سخت پودے کاٹ کر ان سے تیز نوکدار میخیں تیار کر لیں جو اس نے گڑھے کے اندر اس طرح گاڑ دیں کہ ان کی نوکیں سنگینوں کی طرح اوپر کی جانب تھیں۔ پھر اس نے نرم نرم بیلوں، شاخوں اور پتوں وغیرہ سے ایک چٹائی تیار کر لی اور اس سے گڑھے کا منہ ڈھانپ دیا۔ سخت مشقت نے اسے پسینے سے شرابور کر دیا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور برابر کام کرتا رہا۔ یہ کام مکمل کر کے وہ رینگتا ہوا ایک درخت کے پیچھے جا چھپا۔

اتنے میں اسے نرم نرم زمین پر تھپ تھپ کی آواز سنائی دی اور وہ سمجھ گیا کہ اس کا تعاقب کرنے والا آرہا ہے۔ کچھ دیر بعد اسے چٹائی کے چٹخنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی درد سے چیخنے کی آواز آئی کیوں کہ نوکدار میخیں گرنے والے کے جسم میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے دیکھا تو گڑھے سے تین فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی ٹارچ لئے کھڑا تھا۔

جنرل نے گرج کر کہا۔ ''رینز فورڈ آپ کے بری شیر کے گڑھے نے میرے بہترین کتوں میں سے ایک کو موت کی نیند سلا دیا ہے آپ نے دوبارہ میدان مار لیا ہے۔ مگر اب میں دیکھوں گا کہ آپ میرے کتوں کے پورے غول کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں اس دلچسپ ترین شام کے لئے بہرحال میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

رینز فورڈ دلدلی حصے کے قریب ہی سو گیا تھا۔ طلوع آفتاب کے وقت اسے دور کی کسی ایسی آواز نے جگا دیا جو مدھم اور تھرتھراہٹ والی تھی۔ یہ آواز شکاری کتوں کے بھونکنے کی تھی۔ ان حالات میں رینز فورڈ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے اچانک ہی یوگنڈا والی ایک چال کا خیال آیا جو اس نے سیکھ رکھی تھی۔ وہ دلدلی حصے سے ہٹ گیا اور جلد ہی اسے ایک ایسا پودا نظر آ گیا جو جھکنے کے بعد اسپرنگ کی طرح واپس اپنی اصلی حالت پر جا سکتا تھا۔ اس نے اپنا شکاری چاقو پودے

میں اس طرح باندھ دیا کہ اس کے پھل کی نوک پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھی۔ اب اس نے اس پودے کو پیچھے جھکا کر جنگلی انگور کی بیل سے باندھ دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا۔

اب جب کتوں کو تازہ بو ملی تو وہ تیز آواز میں مسلسل بھونکنے لگے۔ رینز فورڈ کو معلوم تھا کہ جب کوئی جانور گھر جائے تو اسے کیا محسوس ہوتا ہے۔ شکاری کتوں کا بھونکنا ایک دم بند ہوگیا اور رینز فورڈ کا دل بھی بیٹھ گیا۔ ''ضرور وہ چاقو تک پہنچ گئے ہوں گے۔'' رینز فورڈ سوچنے لگا پھر جوش میں آ کر اس نے ایک درخت پر چڑھ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کا تعاقب کرنے والے رک گئے تھے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر امید پر پانی پھرتا نظر آیا کہ جنرل زیراف ہاتھ میں ریوالور تھامے اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ دراصل پودے سے بندھا ہوا چاقو زیراف کی بجائے آئی ون کو لگا تھا جس نے ہاتھ میں زنجیر سے بندھے ہوئے کتے تھام رکھے تھے۔

رینز فورڈ بمشکل درخت سے اتر پایا تھا کہ شکاری کتوں کے غول نے تیز تیز اور زور زور سے بھونکنا شروع کردیا۔

عف عف کی زوردار آوازوں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا مگر وہ رکا نہیں۔ اچانک اسے سامنے درختوں میں سے نیلے رنگ کا ایک خلا نظر آیا۔ وہ سمندر تک پہنچ گیا اور ایک کھاڑی کے پار اسے بڑے مکان کا سلیٹی رنگ کا پتھر دکھائی دیا۔ جس مقام پر وہ تھا وہاں سے نیچے قریباً بیس فٹ گہرائی میں سمندر کی لہریں گرج دار آواز کے ساتھ کنارے سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہورہی تھیں۔ رینز فورڈ قدرے ہچکچایا اور پھر فوراً سمندر میں چھلانگ لگادی۔

جب جنرل اور اس کے شکاری کتوں کا غول اس مقام پر پہنچا تو جنرل رک گیا اور کچھ دیر تک کھڑا وہ نیلے پانی کی وسعت کو غور سے دیکھتا رہا۔

اس شام رات کے کھانے پر وہ بدمزگی محسوس کرتا رہا۔ اسے دو اذیتیں کھائے جارہی تھیں ایک تو یہ کہ اس کے لئے اب آئی ون جیسا آدمی حاصل کرنا مشکل تھا اور دوسری یہ کہ اس کا شکار اس سے بچ نکلا تھا۔ ''یہ جان پر کھیلنے والا امریکن میرا شکار نہ بن سکا۔'' جنرل نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

اپنی طبیعت پر سے بوجھ دور کرنے کے لئے وہ اپنی لائبریری میں چلا گیا اور پڑھتا رہا۔ کوئی دس بجے کے قریب وہ سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ روشنی کرنے سے پہلے وہ کھڑکی کی طرف لپکا اور نیچے صحن کو دیکھنے لگا۔ چاندنی میں کتوں کو دیکھتے ہوئے پکارا۔ ''فکر نہیں اگلی مرتبہ قسمت ہمارا ضرور ساتھ دے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کمرے میں روشنی کردی۔

جونہی کمرے میں روشنی ہوئی تو چھپر کھٹ کی مسہری میں سے ایک آدمی نکل کر جنرل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اوہ رینز فورڈ، یہ تم ہو؟'' جنرل نے چلا کر کہا۔ ''تم یہاں کیسے آگئے؟''

''تیر کر۔'' رینز فورڈ نے کہا۔ ''جنگل میں سے چل کر آنے کی بجائے یہ طریقہ مجھے آسان لگا تھا۔''

جنرل کا سانس رک گیا اور اس نے خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ نے یہ کھیل جیت لیا ہے۔''

رینز فورڈ بالکل نہیں مسکرایا۔ ''میں اب بھی گھرا ہوا ایک شکاری جانور ہوں، زیراف تیار ہوجاؤ۔'' رینز فورڈ نے بھاری آواز سے آہستہ لہجے میں کہا۔

جنرل کورنش بجالاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اب ہم دونوں میں سے ایک کو ان شکاری کتوں کی خوراک بننا ہے اور دوسرا اس عمدہ اور آرام دہ بستر پر سوئے گا۔'' اب ہوشیار ہوجاؤ رینز فورڈ......''

اور رینز فورڈ کے بقول وہ اس بستر سے بہتر بستر پر پہلے کبھی بھی نہیں سویا تھا۔

مظلوم روح

محمد ابوہریرہ بلوچ۔ بہاولنگر

اچانک نوجوان پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا اس کی آنکھیں پتھرا گئیں، دل جیسے دھڑکنا بھول گیا، رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا کیونکہ کمرے میں ایک ہیولہ نمودار ہوا اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی دل شکستہ اور خونچکاں بھونچکاں روداد

رات کے مہیب اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سناٹے کا سینہ چیرتی گاڑی میں بیٹھا ریحان دھیمی میوزک سے محظوظ ہوتے ہوئے گھر کی جانب محو سفر تھا، بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کسی بھی پل بارش کی آمد کا سندیسہ تھی، فراٹے بھرتی گاڑی اس کے سفر کو متواتر کم سے کم کیے جارہی تھی۔ اس کا گھر شہر سے دور ایک گاؤں میں تھا، جو بھاون شاہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ رات کے اس پہر تک تاخیر کی وجہ دوست کی شادی کی پارٹی میں شرکت تھی، دور ہونے کی وجہ سے وہ اس دعوت کو چاہ کو بھی ٹھکرا نہ سکا، اس لئے مجبوراً حامی بھر کر شریک محفل ہوا۔ مصروفیت میں کھویا کب گھڑی نے رات کے گیارہ بجنے کا آلارم دیا اسے پتا ہی نہ چلا۔

اتنی رات گئے وہ کبھی باہر نہ نکلتا، اندھیرے اور دھند نے اس کے سامنے کے منظر کو دھندلا کر رکھا تھا کہیں کہیں

لیڈوں کی آواز گہرے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتی اور خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر جاتی۔ مگر ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کی لطف اندوزی نے اس کے ڈر کو قدرے کم کر دیا تھا۔ اچانک اسے اپنے پاؤں کو زحمت دینا پڑی اور بریک لگنے سے اس کا سر اسٹیئرنگ سے جا ٹکرایا جس سے یک دم وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اس عمل کی وجہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ایک سایہ تھا۔ ہارن کی آواز کے ساتھ اس نے سائے کو سائیڈ پر ہونے کا سگنل دیا مگر شاید بہرا ہونے کی بنا پر وہ سایہ ہارن کی آواز سننے سے قاصر تھا، لیکن اس نے کوشش مسلسل کی جو کچھ پل کی تاخیر کے بعد رنگ لائی اور سایہ مسکرا کر پیچھے مڑا، لائٹ کی روشنی میں وہ اس کا سراپا دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔

ایک جواں سال حسینہ ادائے قاتل سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ حسن کے سحر میں کھویا گویا وہ خود ہی بھول گیا ایسے جیسے پتھر کا مجسمہ بن گیا ہو لیکن اگلے ہی لمحے گاڑی کے دروازے پر ہوتی دستک نے اسے خیالاتی بھنور سے کھینچ نکالا اور وہ ایک دم سنبھل گیا، لڑکی اب دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً فرنٹ دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کی پیشکش کی، جسے بغیر ہچکچاہٹ کے قبول کرتے ہوئے اس کے برابر والی سیٹ پر وہ براجمان ہو گئی۔ لڑکی کی نزدیکی قربت ریحان کے وجود کو پگھلائے جا رہی تھی، شاہکار حسن کی بدولت وہ پری کا روپ تھی۔ علیک سلیک اور حال احوال کے تبادلے میں اسے معلوم ہوا کہ دلربا کا نام نیلم ہے وہ واقعی اسی نام کی مستحق تھی۔ بدن کا ہر ایک عضو ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔

ریحان اس کے باکمال حسن کی جتنی بھی تعریف کرتا تھا کم تھا، اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے اس نے نیلم سے اس کے گھر کا ایڈریس دریافت کیا مگر جواب "جہاں اترنا ہوگا بتا دوں گی۔" سن کر اس نے گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا اور سفر کی ابتدا ہو گئی۔ کچھ پل کی خاموشی نے جب طول پکڑا تو لڑکی نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اس کے ناگن کی طرح لمبے بال اس کے چہرے پر جھک آئے۔

بے چین ہو کر ریحان ایک غیر متوقع سوال پوچھ بیٹھا۔ "کیا آپ شادی شدہ ہیں۔"

جواب دہی کے لئے جب نیلم نے سر اٹھایا تو ریحان کی جیسے سانس حلق میں اٹک گئی، اب اس کے سامنے ایک اسی سالہ کریہہ شکل بڑھیا تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلوں کی جگہ دو دہکتے جیسے انگارے تھے، خوب صورت جسم اب ڈھانچے میں بدل چکا تھا، اب وہ مہ جبیں ایک چڑیل کی صورت اس کے سامنے تھی۔

اس سے پہلے کہ ریحان اپنی گاڑی چھوڑ کر بھاگتا اس کا خیال وہ بھانپ گئی۔ چڑیل نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور سوئی کی طرح دو نوکیلے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیئے اور خون پینے لگی۔

بچاؤ کے لئے اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر گرفت سخت تھی۔ بے کنٹرول ہوتی گاڑی ایک درخت سے جا ٹکرائی اور ریحان کی طرح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی، ڈھانچہ بھی اپنا کام کر کے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اب گاڑی میں مردہ ریحان پڑا تھا۔

شہر بہاولنگر کے مضافات میں واقع گاؤں شیر شاہ میں اس وقت قیامت کا سماں تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، چوہدری لیاقت علی کی تو جیسے دنیا ہی لٹ گئی کیونکہ اٹھارہ سالہ جوان بیٹا ریحان اس کے سامنے تخت پر مردہ پڑا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ جسم کا سارا خون جیسے چوڑ لیا گیا تھا۔

چوہدری اپنے علاقے کا مشہور اور شریف آدمی تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے جبکہ شریک حیات چار سال پہلے اس دار فانی کو الوداع کہہ کر خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ اس کی بیوی کی وفات کے بعد چوہدری نے بچوں کو کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی، فقط اس ڈر سے کہ آنے والی بیوی ان بچوں سے برا سلوک کرے گی اس لئے اس نے شادی نہ کی، ان کے ہر ناز و نعم اٹھائے، دولت کی ریل پیل تھی، جس چیز کی خواہش بچوں کے دل میں ابھرتی فوراً پوری کر دی جاتی، نتیجہ وہ ضدی اور من مانی کرنے لگے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اس بری عادتوں میں تیزی آنے لگی، ان تینوں میں سب سے بڑا بیٹا

وسیم ان حرکتوں میں دونوں کا باپ تھا۔ ریحان کی موت پر ہر ایک افسوس کرنے آیا شام تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ پھر رات کی تاریکی پھیلتی دیکھ کر سب ایک ایک کر کے چلے گئے، چوہدری لیاقت علی بھی اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بیٹے کی یاد میں اس کی آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔

دفعتاً کمرے کے ایک کونے میں دھواں پھیلنا شروع ہو گیا، جب دھواں چھٹا تو ایک ہیولہ نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر چوہدری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مارے خوف سے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔

"ن..... نیلم تم زندہ ہو؟؟" چوہدری کی زبان جیسے اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"نہیں چوہدری یہ میری روح ہے، بے چین روح جو تمہارے ظلم کا شکار ہوئی اور مر کر بھی سکون حاصل نہ کر سکی آج اپنا بدلہ لینے آئی ہے۔ تم نے اپنے بیٹے کے گناہ پر پردہ ڈالنے کی خاطر میرا جنازہ پڑھائے بغیر مٹی میں گاڑ دیا۔ لیکن خدائی لاٹھی جو بے آواز ہے اس کا خیال نہ آیا۔ تمہارے بیٹے ریحان کو میں نے ہی موت کی ابدی نیند سلایا ہے، اسی طرح تمہارے سارے خاندان کو تہس نہس کر دوں گی۔ یہ میرے بدلے کی ابتدا تھی۔ میں صرف تمہیں آگاہ کرنے آئی ہوں کہ آج سے اپنے دن گننا شروع کر دو۔"

چوہدری اٹھ کر روح کے آگے گڑگڑانے لگا، اپنے کیے پر معافی مانگنے لگا لیکن روح نے اس کو دھتکار دیا اور بولی۔ "تمہارا گناہ ناقابل معافی ہے تم نے میری ہنستی کھیلتی زندگی کو پل بھر میں ویران کر دیا، تمہیں ذرا بھی خیال نہ آیا، تم معافی کے لائق نہیں۔" پھر وہ دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گئی اور چوہدری سسکتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

نیلم اپنے والدین کی اکلوتی چشم و چراغ تھی، خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرتی میں بھی بے مثال تھی۔ گاؤں کے ہر لڑکے کے دل کی حسرت اور ارمان تھی۔ اس کی چڑھتی جوانی، سفید رنگت، نیلی موٹی آنکھیں، سڈول جسم ان تمام خصوصیات نے اس کی نسوانی کشش میں چار چاند لگا دیئے تھے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم تھی۔ مگر وہ ان لڑکوں کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتی، اس کا دل صرف ہریرہ کے لئے دھڑکتا تھا۔ اس نے اپنا جسم و جاں غرض ہر چیز کو اسی کے نام کر دیا تھا۔

مگر ہریرہ اس کے جذبات سے بے خبر اپنی ایک الگ ہی دنیا جسے تنہائی اور خاموشی کہتے ہیں میں گم رہتا، اس کے والد اپنے علاقے میں پیر ہونے کے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی تھے۔ چار بھائیوں اور ایک بہن والدہ اور والد پر مشتمل ان کا گھرانہ مثالی تھا۔

نیلم نے ہریرہ کو پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جب وہ اپنے والد محمد اختر علی کے ساتھ پڑوسی گاؤں سے آیا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اس پر اپنا سب کچھ ہار بیٹھی اسے من ہی من میں بسائے یادوں کی آگ میں جلتی رہی مگر اظہار محبت کی جرأت نہ کر پائی۔ محبت کا یہ لاوا اندر ہی اندر زور پکڑتا گیا پھر جب کنٹرول سے باہر ہو گیا تو اس نے اپنی ایک سہیلی کو ہم راز بنایا اور ساری حقیقت اس کے گوش گزار کر دی، اس کی سہیلی جس کا نام ممتاز تھا، اس کی مدد کی حامی بھرتے ہوئے اسے ہریرہ سے ملانے کا اٹل فیصلہ کر لیا۔

ممتاز نے ہریرہ کے گاؤں بھاون شاہ جا کر ان کے گھر کا پتا دریافت کیا اور نیلم کو لئے ہریرہ کے گھر آ دھمکی، اس وقت گھر میں صرف ہریرہ کی والدہ اور وہ خود موجود تھا، والد ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئے تھے۔ ہریرہ کی والدہ نے ان کا خیر مقدم کیا، نیلم ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، اتنی دیر میں ہریرہ کولڈ ڈرنک اور بسکٹ لے آیا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ہریرہ نے اپنی نظر کی حد درجہ حفاظت کی ہوئی تھی، اس وقت بھی وہ زمین کو ہی تکے جا رہا تھا۔ اس کی کمال سادگی اور شرافت نیلم کے دل کو چھو گئی، وہ اس سے پیار تو پہلے بھی کرتی تھی اب اس کی چاہت اور بڑھ گئی، چاہت دیوانگی کی حدوں کو جا پہنچی، نیلم کا مقصد پورا ہو چکا تھا کیونکہ وہ صرف اپنے پیار کو دیکھنے آئی تھی۔

پھر وہ اٹھی۔ "آنٹی ہمیں دیر ہو رہی ہے لہٰذا چلنا پڑے گا ہم پھر آئیں گے۔"

ہریرہ کو بھی اب تک محسوس ہو گیا کہ یہ لڑکی اس میں

دلچسپی رکھتی ہے کیونکہ نیلم کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔

شام کو جب پیر اختر علی ہریرہ کے والد گھر لوٹے تو ان کی بیگم نے ان لڑکیوں کے متعلق بھی بتادیا۔ تو وہ بولے۔ ”کل میں نے ان کے ہی گھر جانا ہے وہاں جاکر دریافت کرلوں گا۔“

پیر صاحب اپنے علاقے کے تمام معاملات اور مسائل کو بخوبی حل کرتے تھے، ہر ایک ان کی عزت کرتا۔ علاقے میں ان کا خوب طوطی بولتا تھا۔

اگلی صبح ہریرہ کو ساتھ لئے نیلم کے والد اکرم کے گھر پر تھے۔ ہریرہ چونکہ پیر صاحب کا بڑا بیٹا تھا۔ اس لئے وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تاکہ سارے معاملات کو وہ بخوبی سمجھ سکے۔

نیلم کے والد محمد اکرم نے ان کا خوب خیر مقدم کیا وہ تو ان کا مرید تھا۔ پیر اختر علی نے نیلم کے والد اکرم سے ضروری باتیں کیں، پھر واپسی کے لئے تیار ہوگئے، تو اکرم نے انہیں زبردستی روکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے لئے کھانا تیار ہورہا ہے، برائے مہربانی کھا کر جائیں، میری بیٹی نیلم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“

ہریرہ کو اب اس کا نام معلوم ہوا۔ نیلم اس وقت پاس ہی موجود کھڑی تھی۔ پہلی بار ہریرہ نے نیلم کے سراپے کا جائزہ لیا تو واقعی نام کی طرح اسے نیلم پایا۔ کچھ ہی دیر بعد دسترخوان بچھادیا گیا۔ کھانا پرتکلف تھا، سب نے سیر ہوکر کھایا، ہریرہ بھی تعریفوں کے پل باندھ گیا کہ کھانا لاجواب تھا۔ اس وقت نیلم کی سرشاری دیکھنے کے قابل تھی۔ ہریرہ اس میں انٹرسٹڈ ہونے لگا۔

ان کی محبت کی گاڑی اب پٹری پر آچکی تھی۔ مگر انہوں نے ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جس سے ان کو ندامت کا سامنا کرنا پڑتا، ان کی محبت بہت پاکیزہ تھی۔

☆.....☆.....☆

چوہدری لیاقت کا وسیم سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ناز و نعم نے اس کی عادت بگاڑ دی تھیں وہ عیاش طبیعت کا مالک تھا، خوب صورت لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں، گاؤں والے صرف اس کے والد کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی غلطیوں کو درگزر کرجاتے، اسی لحاظ سے اس کی ہمت کو مزید بڑھادیا، وہ اپنے باپ کے نام کا خوب فائدہ اٹھاتا، ہر روز کوئی نہ کوئی شکایت چوہدری عنایت علی کے کانوں تک پہنچتی کہ ”وسیم نے آج فلاں کام کیا، فلاں کی لڑکی کو چھیڑا۔ اس کا باپ تنگ آگیا اس نے اپنے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ علاقے میں ہماری عزت ہے ایک مقام اور مرتبہ ہے کیوں ہیں رسوا کرنے پر تلے ہوئے ہو مگر ان باتوں اور نصیحتوں سے اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی وہ اپنی عیاشی میں مزید آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

اس نے جب نیلم کو دیکھا اسے اپنے بستر کی زینت بنانے کی تگ و دو میں لگ گیا، وہ بے چاری اس کی شیطانی سوچ سے بالکل بے خبر تھی کہ اس پر کیا قیامت گزرنے والی ہے۔

وہ منحوس اندھیروں کی لپیٹ میں تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا آسمان پر بادلوں کی ستاروں سے آنکھ مچولی جاری تھی۔ ایسے میں دو سائے ایک لڑکی کو اٹھائے چوہدری لیاقت علی کی حویلی کی جانب پیش قدمی کررہے تھے۔ وہ لڑکی شاید بے ہوش تھی۔ اس لئے اٹھانے والوں کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ دونوں سائے حویلی کا عقبی گیٹ پار کرکے اس حصے کی جانب چلنے لگے جہاں کباڑ اور زمیندار کا دوسرا سامان موجود تھا۔ آخر وہ ایک کمرے میں پہنچ گئے جہاں وسیم پہلے ہی ان کا منتظر تھا۔ انہیں کامیاب لوٹتا دیکھ کر اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے نوٹوں کی بڑی گڈی نکالی اور ان دونوں کی طرف پھینک دی۔ جنہیں پاکر وہ خوشی سے نہال ہوگئے۔ وسیم نے انہیں اشارہ کیا تو وہ لڑکی کو بستر پر لٹا کر فوراً رفو چکر ہوگئے۔

نیلم نے آنکھ کھلنے پر خود کو اجنبی ماحول میں پایا تو گھبرا کر اٹھنا چاہا مگر خود کو بندھا دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگئی۔ اس کے سر میں مارے درد کے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اسے یاد آیا کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلی تھی، دو نقاب پوشوں نے اس کو نہ جانے کیا سونگھایا کہ وہ ہوش کی دنیا سے بیگانی ہوتی چلی گئی اور اب جب اسے ہوش آیا تو وہ

یہاں تھی۔ اس نے خود کی آزادی کے لئے کئی جتن کر ڈالے مگر کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ اتنے میں وسیم کی آواز اس کے پردہ سماعت سے ٹکرائی۔

”ملکہ اب تم ہماری قید میں ہو، آج میں تمہاری بھرپور جوانی سے فتح کے جھنڈے گاڑوں گا، بڑے نخرے کرتی تھی نا، آج تیری ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

پھر وہ نیلم کی طرف بڑھا تو وہ بہتیرا چیختی رہی کہ شاید کوئی اس کی فریاد سن کر مدد کو آپہنچے، مگر بے سود، وہ عزت کا لٹیرا اس کی آبروریزی میں مگن رہا۔

چوہدری لیاقت علی کو حویلی کے عقبی حصے سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی وہ اس وقت زمین کے کسی حساب میں لگا ہوا تھا وہ بہت حیران ہوا کیونکہ یہ آواز جس سمت سے آرہی تھی وہاں آمد و رفت بالکل نہیں تھی وہ اٹھا اور آواز کی سمت بڑھنے لگا، آخر اس کی رہنمائی میں وہ ایک دروازے تک پہنچ گیا، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا، جسے وسیم بے خبری میں بند کرنا بھول گیا تھا۔

چوہدری جیسے شرم سے غرق ہوگیا، اس کا بیٹا وسیم لڑکی کی آبروریزی میں مگن تھا، بیٹے نے جب باپ کو سامنے دیکھا تو وہ بھی بت بن کر ساکت ہوگیا، نیلم کی زندگی برباد ہوچکی تھی، وہ جان گئی کہ اس ظالم دنیا میں اسے کوئی اس روپ میں نہیں اپنائے گا، اس نے میز پر پڑا خنجر اٹھایا، اور چشم زدن میں اپنے دل کی جگہ پر پیوست کردیا۔

مرنے سے پہلے اس نے چوہدری لیاقت کو للکارا کہ وہ اپنے ساتھ ہوئے ظلم کا بدلہ لینے ضرور آئے گی اور اس کے سارے خاندان کو تہس نہس کرڈالے گی۔

چوہدری غصے سے لال پیلا ہورہا تھا، بیٹے نے ساری عزت خاک میں ملادی تھی۔ اب وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا، وسیم اس کا اپنا خون تھا، وہ بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔ نیلم کی اس قدر جلدی کارروائی سے ان کو سانپ سونگھ گیا تھا، اب چوہدری کے پاس ایک ہی راستہ تھا، اس نے وہیں کمرے میں ایک گہرا گڑھا کھدوایا اور نیلم کی لاش کو اس میں دفن کرکے کمرے کو بڑا سا تالا لگادیا۔

وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا کہ ایک طرف اس کا بیٹا تھا تو دوسری طرف عزت، اس نے معاملے کو وہیں دفنانے میں اپنی عاقبت سمجھی پھر وسیم کو دوسرے ملک بھیج دیا۔

نیلم کے گھر والے اسے ڈھونڈتے تھک گئے مگر اس کو نہ ملنا تھا نہ ملی، وہ دار فانی کو الوداع کہہ چکی تھی، اس صدمے کا اس کے باپ اکرم پر خاصا اثر ہوا، والدہ تو بہت پہلے ہی دنیا چھوڑ چکی تھی، باپ روتا پیٹتا بستر کا ہوکر رہ گیا۔

چوہدری نے ہمدردی دکھاتے ہوئے اس کے علاج اور گھر کا ذمہ اٹھالیا۔

ہریرہ کو جب نیلم کی گمشدگی کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے تئیں کوشش کی اور وہ بھی سر پیٹتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

عمران جو کہ وسیم سے چھوٹا تھا بہت ہی خوب صورت اور بھائی کی طرح حسن پرستی کا دلدادہ تھا۔ شکار اس کا مشغلہ تھا، اور اپنے شوق کی تکمیل کے لئے وہ رات گئے تک باہر رہتا۔

اس علاقے میں تیتر بٹیر کی بہتات تھی۔ ایک دن جب وہ شام ڈھلے شکار کے لئے نکلا تو ایک حسینہ کو دیکھ کر اس کا جی للچانے لگا۔ اس نے گاڑی روک کر لڑکی سے اس کا پتہ دریافت کیا کہ ”آپ اس گاؤں کی نہیں لگتیں کہاں کی رہنے والی ہیں۔“

”میں یہاں اپنے دوست سے ملنے آئی ہوں۔“ کے جواب نے عمران کو مطمئن کردیا۔

اس نے لڑکی پر اپنا تاثر ڈالنے کے لئے کہا۔ ”میں یہاں کے بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں، یہ علاقہ ہماری ہی ملکیت ہے آپ کو اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتانا۔“

”کیا آپ سچ میں چوہدری صاحب کے صاحبزادے ہیں۔“ جواب نے لڑکی کو حیران کردیا۔ وہ شاید اس کا اثر لے چکی تھی۔ ”کیا آج ہم پرانے کنویں کے پاس مل سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں جی میں ضرور آؤں گا۔“ عمران بہت خوش تھا کیونکہ بڑی آسانی سے شکار اس کے قابو میں آگیا تھا، وہ رات کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے لگا اسے رات

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہونے کا انتظار تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ قسمت اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

کہتے ہیں ناں وقت کسی کے روکے نہیں رکتا۔ اور رات سر پر آ گئی، وہ مقررہ وقت سے پہلے وہاں پہنچا تو حسینہ کو دیکھ کر اور بھی خوش ہوگیا، وہ آگے بڑھ کر اس کے قریب ہوگیا، باتوں باتوں میں اس نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی، مگر لڑکی جیسے خود کو اس کے سپرد کردینے پر آمادہ کر کے آئی تھی، اس لئے چھیڑ خانی سے خاموش رہی اور پھر وہ اسے کنویں کے پاس لے آئی۔

کنواں سالوں پرانا تھا پرانے بزرگ اس سے پانی بھر کر ضرورت کے مطابق استعمال کرتے تھے مگر زمانہ جدید نے کنویں کی ضرورت کو بے کار کردیا تھا، کنویں کی جگہ نلکوں اور موٹروں نے لے لی اس لئے اب یہ ویران تھا۔ پانی حد درجہ سیاہ اور زہریلا ہو چکا تھا، اب لڑکی نے اپنی ہیئت بدلنی شروع کردی اب وہ نیلم بن کر اس کے سامنے تھی۔

"تم یہاں؟؟؟ تم تو غائب ہوگئی تھی ناں۔" خوف سے عمران کی گھگھی بندھ گئی عمران نیلم کو پہچان چکا تھا کیونکہ دونوں ایک ہی گاؤں کے تھے اور ایک دو بار اس سے عمران کا ٹکراؤ بھی ہوا تھا.....

"ہاں میں نیلم ہی ہوں تمہارے خاندان کے ظلم کی ماری مظلوم روح، تم نے میرے ساتھ جو انہونی کی اسی کے بدلے کے لئے میں نے یہ روپ لیا ہے، آج کی رات تمہاری آخری رات ہے۔ بہت شوق ہے ناں لڑکیاں چھیڑنے کا تو آؤ بجھالو اپنی پیاس دور کیوں کھڑے ہو؟"

عمران کی حالت دیدنی تھی، زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ اس لئے وہ بھاگنے سے بھی قاصر رہا، نیلم نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کے بھائی ریحان کا ہوا تھا، ایک جھٹکے سے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی اور پھر اسے کنویں کی نذر کردیا۔

صبح اس کی پھولی ہوئی لاش لوگوں کو ملی جو اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ ہر کوئی اس کا حشر دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا۔

چوہدری تو جیتے جی مر گیا، اس کے دو بیٹے موت کی آغوش میں جا سوئے تھے، لوگوں میں ہر ایک کی موت کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں تھیں، کوئی کہتا کہ شکار کھیلنے آیا ہوگا پھر انجانے میں پاؤں پھسلنے سے مر گیا تو کوئی کہتا یہ تو جن بھوتوں کا چکر لگتا ہے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

لیکن وجہ صرف چوہدری لیاقت کو ہی معلوم تھی، اس نے اپنے بڑے بیٹے وسیم کو اس وقت دبئی سے بلا لیا کیونکہ اب زمین سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔

حالات معمول پر آنے لگے سب اس بات کو بھول گئے لیکن چوہدری پر خطرات جیسے منڈلا رہے تھے۔ صرف وہ ہی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لئے بہت سے عاملوں سے رابطہ کیا۔

پھر وہ پیر اختر کے پاس پہنچا تو انہوں نے ایک تعویذ دیا اور کہا کہ "اس کو اپنے بیٹے کے گلے میں ڈال دینا، خدا نے چاہا تو موت کے علاوہ اور کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن محتاط رہیں وہ جو کوئی بھی ہے ایک مقصد لے کر آئی ہے اور اس کے ساتھ دوسروں کی مدد بھی ہے۔" پیر اختر نے چوہدری کو تنبیہ کردی تھی۔

عمران کی موت کو ایک ماہ بیت گیا تھا۔ چوہدری سمجھا کہ شاید مصیبت ٹل گئی لیکن آئی کو کون ٹال سکتا ہے۔ وسیم تعویذ کی حفاظت جان سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ ہر وقت اسے اپنے پاس رکھتا، لیکن موت کو کسی کی ضرورت نہیں جب آنا ہوتی ہے آجاتی ہے اور بہانہ خود بہ خود بن جاتا ہے۔

ایک دن وسیم نہانے کے لئے گیا۔ اس نے کپڑے اتارے اور ساتھ میں تعویذ بھی اتار دیا۔ پہلے وہ تعویذ اپنے گلے میں موجود ہوتے ہوئے نہایت تھا۔ مگر اس مرتبہ جیسے ہی وہ تعویذ رکھ کر، شیشے کے سامنے ہوا، جو کہ دیوار میں نصب تھا۔

نیلم کی تصویر ابھر آئی، تو اس نے جلدی سے تعویذ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ نیلم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی تیزاب کی بوتل اس پر انڈیل دی۔ جس سے وسیم کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں، حیرت کی بات یہ تھی کہ چیخیں صرف واش روم میں ہی تھیں باہر ان کا گمان تک نہ تھا، وسیم کا جسم جھلسنے لگا، کھال اور گوشت گل

کر اس سے الگ ہونا شروع ہوگیا۔ اس کا چہرہ عجیب طرح کا ہو چکا تھا۔ نیلم کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس کی گردن توڑ دی۔

چوہدری لیاقت علی اس وقت حویلی میں موجود نہیں تھا، وہ کسی کام سے شہر سے باہر گیا تھا اور نوکر بھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اندر ان کے مالک کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اس پر اتنا تیزاب ڈالا گیا تھا کہ اس کے جسم کا سارا گوشت الگ ہو چکا تھا۔ مگر اس کے سر اور چہرے پر نیلم نے تیزاب نہیں ڈالا تھا۔ اس کی لاش اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ دیکھنے والوں پر کپکپی طاری ہوجاتی، وہ توبہ توبہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے فوراً ہٹ جاتے۔

نیلم نے اپنی موت کا بدلہ لے لیا تھا۔ اور بدلہ بھی خوفناک طریقے سے، اس کے چہرے پر پل بھر کے لئے مسکراہٹ ابھری، نیلم کی روح اب جا چکی تھی۔

چوہدری کی حالت بہت غیر تھی، اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے، کیونکہ اب اس کی دنیا اجڑ چکی تھی۔

گاؤں والوں کی زبانی جب وسیم کی موت کا علم پیر اختر علی کو ہوا تو انہوں نے نیلم کی روح کو حاضر کیا، اور اس سے حقیقت معلوم کی تو اس نے ساری حقیقت من وعن سنا ڈالی۔ جسے سن کر پیر اختر علی بہت افسردہ ہوئے۔ پھر وہ گویا ہوئے۔ "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

تو نیلم کی روح بولی۔ "میں نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے لیا۔ اب چوہدری لیاقت زندہ ہے، میں اسے نہیں ماروں گی بلکہ اسے لوگوں کے لئے عبرت بنادوں گی، آپ سے میری ایک گزارش ہے آپ اسے ایک بیٹی کی التجا سمجھ لیں۔

"نہیں بیٹا ایسی کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔" پیر اختر علی نے پوچھا۔

"میرا اس دنیا سے دل بھر گیا ہے اب میں واپس جانا چاہتی ہوں، حویلی کے فلاں کمرے میں میری بدنصیب لاش پڑی ہے۔ آپ اسے نکال کر شریعت کے مطابق دفن کردیں تب میری بے چین روح کو قرار آجائے گا۔"

پیر صاحب نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی خواہش کو ضرور پورا کریں گے۔

اگلی صبح مزدور لگا کر مطلوبہ جگہ کو کھودا گیا تو ایک ڈھانچہ برآمد ہوا جو یقیناً نیلم کا تھا، گاؤں والوں کو جب چوہدری کی خباثت اور کرتوت کا علم ہوا تو وہ اس پر لعنت بھیجنے لگے، اب وہ واقعی لوگوں کے لئے عبرت بن گیا تھا۔

پنجر نکال کر اسے غسل دیا گیا، اور پھر شریعت کے مطابق نماز جنازہ کے بعد قبر کے سپرد کردیا گیا۔ ہر کوئی اشکبار تھا۔ نیلم کا والد محمد اکرم ایک بار پھر تنہا رہ گیا تھا۔

رات کو ہریرہ اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ اس کا کمرہ مہکنے لگا، وہ اٹھ بیٹھا اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، اس کے سامنے نیلم کھڑی تھی، سفید کپڑوں میں ملبوس، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی ایک سکون تھا۔

اس نے ہریرہ کو بھی داستان سنائی اور کہا "اب میں نے اپنا بدلہ پورا کرلیا ہے۔ مگر میری ایک خواہش ہے، کیا تم میری خواہش پوری کرو گے؟ تم میری خواہش پوری کردو، میں تمہاری حسان مند رہوں گی۔"

ہریرہ بولا۔ "نیلم تم ایک خواہش کی بات کرتی ہو، تم کہو تو میں تمہاری ہزاروں بلکہ لاکھوں خواہشیں پوری کردوں گا، تم حکم تو کرو۔"

یہ سن کر نیلم بولی۔ "میری خوشی کی خاطر جتنی جلدی ہوسکے تم شادی کرلو۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔" اور یہ بول کر وہ مسکراتے ہوئے ہریرہ کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی اور بولی۔

"اب تم انکار نہ کرنا، میری خوشی کے لئے۔"

یہ سن کر ہریرہ بولا۔ "ٹھیک ہے میں تمہاری خواہش پوری کروں گا، اب تو خوش ہوناں۔"

پھر نیلم بولی۔ "تم نے میری بات رکھ لی، میں تمہاری خوشی کی خاطر وقتاً فوقتاً تم سے ملنے آیا کروں گی، مگر صرف تمہیں ہی نظر آؤں گی۔" اور یہ بول کر وہ مسکراتی ہوئی ہوا میں تحلیل ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اور ہریرہ اس کے خیالوں میں گم ہوگیا۔

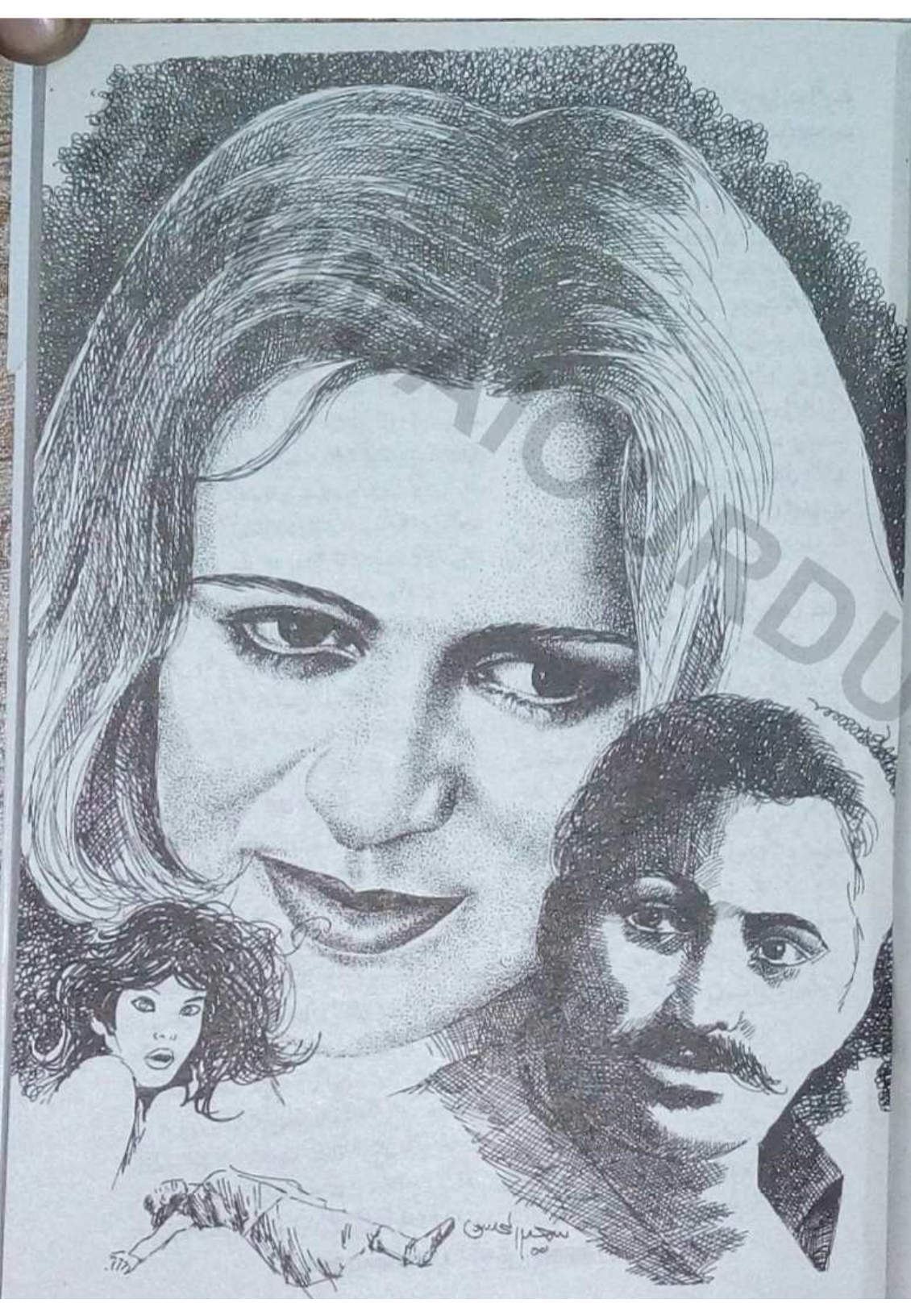

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:128

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

اپنے کان کے قریب سرگوشی سنتے ہی رولوکا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور پھر اس کا چہرہ متغیر ہوگیا، سرگوشی کرنے والا اس کا اپنا کارندہ جاگتا الو تھا۔ رولوکا کے بدلتے چہرے کو سب نے دیکھا کیونکہ اس وقت رولوکا کے قریب کئی لوگ براجمان تھے۔ پھر رولوکا نے اپنی خفیہ زبان میں جاگتے الو کو کوئی پیغام دیا، پھر رولوکا لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ''دراصل میرا ایک نادیدہ ہرکارہ ایک اہم پیغام لایا تھا میں نے اسے پیغام دے کر روانہ کردیا۔'' اس کے بعد رولوکا نے اپنے شاگرد کی طرف دیکھا جو کہ کہانی پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رولوکا مسکراتے ہوئے شاگرد سے بولا۔ ''چلو اب تم کہانی سناؤ۔'' اور شاگرد کہانی سنانے لگا۔ چارلی بروڈی اپنے وقت کا بہت ہی چھٹا ہوا بدقماش بدمعاش تھا۔ اس کی موت واقع ہوگئی تو اس کے لواحقین نے اسے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ قبرستان میں دفن کردیا۔ پھر رات میں دو سائے قبرستان میں ٹارچ لئے داخل ہوئے ایک نے دوسرے کا نام لیا۔ ایلن اب جلدی سے قبر کھودو اور جتنی جلدی ہو سکے اس کام سے فارغ ہوجاؤ۔ یہ سنتے ہی ایلن اپنے کام میں لگ گیا اور بڑی جدوجہد کے بعد اس نے قبر کھود ڈالی، پھر ان دونوں نے مل کر تابوت کا ڈھکن اٹھایا تو یہ کیا..... اندر سے تابوت خالی پڑا تھا۔ چارلی بروڈی کی ڈیڈ باڈی اندر سے غائب تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم سے بھی کوئی چالاک نکلا اور اس نے بروڈی کی ڈیڈ باڈی غائب کردی۔ ایک بولا اور پھر ایک دو نہیں بلکہ کئی اس چکر میں لگ گئے کہ چارلی کی ڈیڈ باڈی گئی تو کہاں گئی، اصل وجہ یہ تھی کہ دفن کرتے وقت چارلی کو جو کوٹ پہنایا گیا تھا اس کوٹ کے استر میں کئی لاکھ کے ہیرے چھپائے گئے تھے، خیر تمام تگ ودو کے بعد تمام ہیرے ایلن کو مل گئے، اس میں سب سے زیادہ تعاون چارلی کی بیوی کا تھا اور چارلی کی بیوی نے ایلن سے شادی کرلی اور یہاں پر جب کہانی ختم ہوگئی تو شاگرد رولوکا سے مخاطب ہوا۔ استاد محترم کہانی ختم ہوگئی۔ وہاں پر جتنے لوگ موجود تھے سب کے سب کہانی سننے میں کچھ زیادہ ہی محو تھے کہ اچانک ایک دہشت ناک سانپ چھت پر سے کمرے کے فرش پر گرا اور اس کی پھنکار نے لوگوں میں کھلبلی مچادی، لوگ بدحواس ہوگئے اور ایک دوسرے پر گرتے پڑتے باہر کی جانب بھاگے، لیکن رولوکا نے اپنی دونوں آنکھیں اس سانپ پر مرکوز کردیں۔

(اب آگے پڑھیں)

رولوکا اور سانپ ایک دوسرے پر اپنی نظریں مرکوز کئے ایک دوسرے کو قہر آلود نظروں سے گھورے جارہے تھے۔

سانپ کی حالت سے اندازہ ہورہا تھا کہ اس میں ہلنے جلنے کی سکت باقی نہیں تھی، اس کا تمام دھڑ حقیقت میں جیسے منجمد ہوکر رہ گیا تھا، اس کی صرف آنکھیں حرکت کررہی تھیں اور پھر چند لمحے بعد اس کی دونوں آنکھیں بھی ساکت ہوگئیں۔

سانپ کی حالت دیکھ کر رولوکا کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر رولوکا نے اس سانپ کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے اپنے پیچھے کونے میں رکھ دیا۔ اب وہ سانپ جیسے ٹھوس پتھر کا بن کر رہ گیا تھا۔

رولوکا کے آستانے میں سانپ کے فرش پر گرنے سے پہلے جو لوگ موجود تھے اور کہانی سن رہے تھے، وہ لوگ ابھی تک بدحواسی کے عالم میں آستانے

PAKSOCIETY.COM

کے باہر موجود تھے اور اندر کی حالت جاننے کے لئے بے چین تھے اور یہ بھی ان کے ذہن میں تھا کہ رولوکا خیر خیریت سے ہے کہ نہیں۔

اتنے میں رولوکا کی آواز سنائی دی جو کہ اپنے شاگرد کا نام لے کر پکار رہا تھا، رولوکا کی آواز سنتے ہی تمام لوگوں کے چہرے کھل اٹھے اور فوراً سے پیشتر رولوکا کا شاگرد اندر کی طرف لپک۔

اس کے بعد پھر رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''جناب آپ سارے لوگ اندر آستانے میں تشریف لے آئیں۔'' اور رولوکا کی آواز سنتے ہی سارے لوگ آستانے میں داخل ہوئے اور رولوکا کا اشارہ پاتے ہی اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد رولوکا نے لوگوں کو اس سانپ کے متعلق بتایا اور دکھایا جو کہ اب پتھر کا بن چکا تھا۔

اس کے بعد رولوکا شاگرد سے بولا۔ ''ہاں بھئی..... اب تم دوسری کہانی سناؤ جو کہ رہ گئی ہے۔''

''شاگرد کہانی سنانے لگا، کہانی یوں تھی۔ مراکش ایکسپریس کے ڈبے سے کیری ایک عربی گھوڑے کو دیکھ کر چونک پڑی۔ صحرائی سورج کی سنہری کرنوں میں گھوڑا اور اس کا سوار ٹرین سے ایک دھندلے خاکے کی طرح نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنے شوہر کو ٹہوکا دیا۔ ''کیوں باب..... یہ کس قبیلے کا آدمی ہے؟''

''معلوم نہیں.....'' باب نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شاید کوئی بربر ہو۔''

''دیکھنے میں کتنا وجیہہ اور شان دار ہے؟'' کیری نے گھوڑ سوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مراکش صرف بیس میل دور رہ گیا تھا۔ ان کی شادی تین روز پہلے ہوئی تھی اور اب وہ مراکش جارہی تھی جہاں اس کے شوہر کو ایک اہم عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔

باب نے جواب نہیں دیا۔ وہ بھی گھوڑ سوار ہی کی طرف متوجہ تھا جو سیلوٹ کے انداز میں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا اور تین طرف سے ان گنت گھوڑ سوار اس کی طرف بڑھ رہے تھے یہ ایسا دلکش منظر تھا کہ کیری خوشی سے کھل اٹھی۔ ''باب..... یہ کوئی تماشہ ہو رہا ہے یا تم نے میری تفریح کے لئے ان لوگوں کو پہلے سے دعوت دے دی تھی؟''

وہ اب بھی خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ سواروں کا یہ اجتماع کسی طوفان کا بھی پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ اسکے بدترین خدشات کا جلد ہی اظہار ہو گیا۔ اچانک ایک دھماکہ سنائی دیا۔ گاڑی نے زبردست ہچکولا کھایا۔ مسافر اور سامان ایک دوسرے پر گر پڑے۔ ایک دم شور ہوا لیکن فوراً ہی دوسرا دھماکہ ان آوازوں پر غالب آ گیا۔ گاڑی کے گویا پرخچے اڑ گئے تھے۔ انسانی جسم ڈبوں سے اڑتے ہوئے دونوں طرف ریت پر گر رہے تھے۔ قیامت کا سماں تھا۔ دل دہلا دینے والی چیخوں، ڈبوں کے ٹوٹنے کی آوازوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے صحرا کا ذرہ ذرہ کانپ رہا تھا۔ دھوئیں اور ریت کے بادل ہر طرف اڑ رہے تھے۔

باب نے ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیوں سے خود کو اٹھایا اور اپنی نئی نویلی دلہن کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر موجود تھی اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ دونوں اپنے ڈبے میں ہی گرے تھے۔ اس نے جلدی سے کیری کو سنبھالا اور الٹے ہوئے ڈبے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ باہر آ کر دونوں ریلوے لائن پر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف سے کربناک آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں گھوڑے تیزی سے گاڑی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جن لوگوں نے گاڑی کے حادثے میں خود کو سنبھال لیا تھا۔ ان کے چہرے گھوڑ سواروں کو دیکھ کر زرد ہو رہے تھے۔

چند لمحوں میں گھوڑ سواروں نے ان کو نرغے میں لے لیا۔

''باب! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کیری نے دہشت سے کانپتے ہوئے کہا۔

''جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' باب نے اسے تسلی دی۔

گھوڑ سواروں کا سردار سرخ لبادے میں تھا۔

اس نے مسافروں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس طرف بڑھا۔ جہاں باب اور کیری بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ان کے بالکل سامنے گھوڑا روکا اور کیری کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ کیری خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے شوہر کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی نگاہ سردار کی انگلی سے پھسلتی ہوئی چہرے پر آئی تو جسم کا رواں رواں پسینے میں ڈوب گیا۔ کیری اخباروں میں اس کی تصویر دیکھ چکی تھی۔ وہ کاکنان تانگ تھا۔ دنیا کا سفاک ترین آدمی! اس کے بال سیاہ تھے، رخساروں کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ اور آنکھوں میں خون خوار چمک تھی۔ سیاہ آنکھیں بالکل سانپ کی آنکھوں کی طرح خوف ناک اور چمک دار تھیں۔

کاکنان کا اشارہ پاتے ہی چار سوار گھوڑوں سے کود کر ان کی طرف بڑھے۔

پہلے اور دوسرے سوار کے منہ پر باب کے پے در پے ٹھوکریں پڑیں اور وہ ریت پر لوٹنے لگے۔ تیسرا بڑی پھرتی سے آگے بڑھا لیکن باب نے ایک قدم ہٹ کر لاتینگ کک ماری۔ ایک کریہہ چیخ اس کے حلق سے نکلی اور وہ گھوڑے کی ٹانگوں میں جا گرا۔ گھوڑا بدک گیا اور اسے روندتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔

اس سے پہلے کہ چوتھا سوار آگے بڑھتا کاکنان کی خوف ناک غراہٹ سنائی دی۔ باب رک گیا اور اس نے تینوں گرے ہوئے سواروں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اٹھتے اٹھتے انہوں نے ریوالور نکال لئے لیکن فائرنگ سے پہلے ان کی لاشیں تڑپتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ کاکنان کے ریوالور کی نال سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

''بزدلوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے باب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں دیکھ چکا ہوں کہ تم ایک اچھے فائٹر ہو۔''

''تم کون ہو؟'' باب غرایا۔ ''اور کیا چاہتے ہو؟''

کاکنان کا قہقہہ بہت بھیانک تھا۔ کراہتے ہوئے مسافر بھی خاموش ہو گئے جیسے اپنے زخموں کا انہیں ہوش ہی نہ رہا۔ کاکنان نے کیری کی طرف اشارہ کیا۔

''اب یہ ہماری ہے۔ تمہاری زندگی یا موت سے ہمیں کوئی دل چسپی نہیں۔''

''باب!'' کیری نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اس بھیڑیے سے درخواست کروں گی کہ بے گناہ لوگوں کے خون سے ہولی نہ کھیلے۔''

''تم خاموش رہو۔'' باب نے پلٹ کر ناخوشگوار لہجے میں کیری کو ڈانٹا۔ اس کے چہرے کی سرخی پھیل رہی تھی۔ اس نے گہری نگاہ سے کاکنان کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس شخص سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے نرمی سے کیری کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا اور کاکنان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں اس کے لئے تم سے جنگ کروں گا۔''

کاکنان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ ابھی کھلکھلا کر ہنس پڑے گا۔ مگر وہ پتھر جیسی بے رحم آنکھوں سے باب کو گھورتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم ایک سو گھوڑ سواروں کے دستے کے بہادر سوار ہو۔'' باب نے دوبارہ کہا۔ ''کیا ان کے بغیر بھی بہادری کا دعویٰ کر سکتے ہو؟''

یہ الفاظ کاکنان کے لئے گالی سے کم نہیں تھے۔ اس نے غصے اور نفرت کے ساتھ زمین پر تھوک کر کہا۔ ''مجھے چیلنج کر کے تم حماقت کر رہے ہو..... لیکن۔'' اس نے اپنے سواروں پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ''میرے ساتھیوں کو بہت دنوں سے محظوظ ہونے کا موقع نہیں ملا ہے۔ میں ان کی تفریح کے لئے تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری موت ایک بادشاہ کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔''

اس سے پہلے کہ کیری باب کو پکڑتی، اس نے پیار سے کیری کا ہاتھ دبایا اور میدان میں کود گیا۔ ''میں تمہارے اس وعدے کو دستے کے تمام آدمیوں کا وعدہ سمجھ کر یقین کر رہا ہوں۔'' باب نے کہا۔ ''اگر میں جیت

گیا تو مجھے اور ٹرین کے باقی تمام مسافروں کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

کاکنان نے تمکنت سے کہا۔ "یقیناً..... ایسا ہی ہوگا۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا صحرا کا سینہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے لرزنے لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے ان دونوں کو گھیرے میں لے کر ایک وسیع دائرہ بنالیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف جلتی ہوئی لکڑیوں کے تڑخنے یا زخمیوں کی مدھم کراہوں کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھیں۔

باب کی پہلی کوشش جوڈو کے معمولی سائیڈ اسٹیپ کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑاتا ہوا ریت پر گر گیا۔ ماحول گھوڑسواروں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔ باب نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی لیکن اس وقت تک کاکنان بھی چوکنا ہو چکا تھا۔ اس کے جوتے کی آہنی چونچ نے باب کے رخسار پر گہری خراش ڈال دی تھی۔ کیری کی چیخ کاکنان کی دوسری ٹھوکر کے ساتھ ہی بلند ہوئی اور باب کے دوسرے رخسار پر بھی خون کی لکیر نظر آنے لگی۔ ایک سو گھوڑسوار کھلکھلا کر ایک ساتھ ہنس پڑے تھے۔

باب باکسر تھا لیکن کاکنان نے اس کے ہر حملے کو ناکام بنادیا۔ اس کا بایاں بک فوج میں کئی آدمیوں کو زمین دکھا چکا تھا لیکن اب تک وہ کاکنان کو چھو بھی نہیں سکا تھا۔ کیری کی چیخیں بڑھتی گئیں۔

☆.....☆.....☆

کنگ نے تراشے کو بغور پڑھا اور نگاہ اٹھا کر کہا۔ "تمہیں یقین ہے کہ گاڑی کے اس حادثے میں ریڈ سرکل کا ہاتھ ہے؟"

"ہاں..... سو فیصد یہ اسی کا کام ہے۔ اس حادثے میں کاکنان تانگ کی موجودگی بھی ثابت ہوگئی ہے۔"

"کاکنان..... اور یہاں مراکش میں؟" کنگ اچھل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ جوتارا سے بھیجا گیا تھا، وہ بے حد اہم تھا۔ لیکن یہ امید نہیں تھی کہ جس آدمی کی تلاش میں اس نے رات دن ایک کردیئے تھے، وہ یہاں مراکش میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کررکھا ہوگا۔

"گاڑی کے حادثے میں جو چند افراد زندہ بچے تھے۔" نائب سفیر نے بتایا۔

"ان میں ایک عرب نوجوان بھی تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود صرف اسی لڑکے کے حواس بجا تھے دوسروں کی حالت بہت نازک تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے کاکنان کا پورا حلیہ بتایا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کاکنان بربر قاتلوں کا سرغنہ بن چکا ہے۔ ریڈ سرکل کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے پہاڑی قبائل پر مشتمل ہے جو فرانسیسیوں کے وجود کو برداشت نہیں کرتے، ممکن ہے کہ وہ بھی کاکنان کے ساتھ مل گئے ہوں۔ وہ ایک صدی سے برسرپیکار ہیں اور ان کا موقف ہے کہ جب تک انہیں آزادی نہیں مل جاتی، جنگ جاری رہے گی۔"

کنگ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ان قبائل کو لیڈر شپ میسر نہیں تھی۔ اس لئے ان کو جنگ میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کاکنان جیسے آدمی نے جب لیڈر شپ قبول کی ہوگی تو ان کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے ہوں گے۔ اب تک بربر قبائل اور حکومت میں فیصلہ کن جنگ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سب قبیلے سلطان مراکش کے وفادار تھے لیکن اگر ان کی وفاداری واقعی کاکنان کی طرف منتقل ہوچکی ہے تو عرب اور یورپ دونوں کے لئے انتہائی بھیانک ثابت ہوگی۔"

"میں کاکنان کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ سلطان کو بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گا۔ ہمیں چاہئے کہ جلد از جلد اسے قابو میں کرکے اس کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملادیں۔"

"ہاں..... وہ انتہائی کامیابی سے پہلا وار کرچکا ہے۔" نائب سفیر نے کہا۔

"وہ جس لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا وہ میری بیٹی کیری ہے اور جو نوجوان کاکنان کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے وہ....." نائب سفیر کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں

میں آنسو چھلک آئے۔ "ان کی شادی کو صرف تین دن ہوئے تھے اور وہ ہنی مون منانے..... مراکش..... اس کا باقی جملہ سسکیوں کی نظر ہوگیا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ "اس اخبار میں ایک اطلاع نہیں ہے۔" نائب سفیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جس روز حادثہ ہوا تھا، اس کے دوسرے روز مجھے ڈاک سے ایک پیغام ملا تھا۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر کنگ کی طرف بڑھادیا۔ کنگ نے آواز کے ساتھ پڑھا۔

"غیر ملکی شیطان! اگر تم اپنی بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو پانچ لاکھ فرانک جمعہ کی شام تک کاسابلانکا کے بلیک پیرٹ میں بھجوا دو اور اپنی منحوس صورت لے کر مراکش سے نکل جاؤ۔"

"استقلال۔"

لفافے میں اس پیغام کے ساتھ بالوں کی ایک لٹ بھی تھی۔ نائب سفیر نے سنہرے بالوں کا ایک گچھا کنگ کو دکھایا۔

کنگ بولا۔ "اگر اس خط اور لٹ کو بھیجنے والا کاکنان ہے تو وہ لڑکی کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں مانے گا چاہے تم اسے رقم بھیجو، چاہے نہ بھیجو، مگر "استقلال" کیا ہے؟"

"ایک انقلابی جماعت ہے جس نے 1943ء سے فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کررکھا ہے۔ اس تنظیم میں میرے کچھ جاننے والے بھی شامل ہیں۔ غالباً کاکنان نے اس جماعت کے چند آدمیوں کی حمایت بھی حاصل کرلی ہے..... اس تنظیم نے ہمیشہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا ہے۔ لیکن کاکنان۔"

"اوہ..... وہ آدمی نہیں درندہ ہے..... اور درندہ بھی ایسا جو پاگل ہوچکا ہے۔" لڑکی نے جھرجھری لے کر کہا۔

"آج منگل ہے۔" مور بولا۔ "اور جمعہ آنے میں تین دن باقی ہیں ہمارے مہمان نائب سفیر انتظار کرنے پر بخوشی آمادہ ہیں۔ یہ جمعہ تک رقم نہیں بھیجیں گے میرا خیال ہے کہ ان کی بیٹی کو زرتاوان ادا کئے بغیر واپس لانے کے لئے تین دن کا عرصہ کم نہیں۔ اس سلسلے میں ہم ایک لاکھ فرانک تک خرچ کرسکتے ہیں۔ اگر ہم مقررہ مدت میں کامیاب نہیں ہوئے تو نائب سفیر اس بات کے مجاز ہوں گے کہ رقم ادا کردیں تاکہ لڑکی واپس مل جائے۔ بعد میں ہم تاوان کی ادا شدہ رقم حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرسکتے ہیں۔ اتنی بڑی رقم ریڈ سرکل کے ہاتھوں میں ہرگز نہیں جانی چاہئے۔ اس سے وہ سب کے سب مسلح ہوسکتے ہیں۔ جب کہ میں نہیں چاہتا کہ ایک تخریبی گروہ کو طاقت حاصل ہو۔"

"کام کا آغاز کہاں سے کیا جائے گا؟" کنگ نے پوچھا۔

"بلیک پیرٹ سے! یہ کاسابلانکا کا ایک شراب خانہ ہے، جسے شیلے نامی ایک بدنام آدمی چلا رہا ہے۔ اگر مراکش میں کسی کو یہ علم ہو کہ کاکنان کہاں ہے تو وہ یہی شخص ہوسکتا ہے۔" مور نے بتایا۔ "شمالی افریقہ کے صرف نصف درجن آدمیوں کو علم ہے کہ بلیک پیرٹ تک کس طرح پہنچا جاسکتا ہے! حتیٰ کہ ہمارے مہمان نائب سفیر بھی راستے سے واقف نہیں ہیں۔" پھر اس نے لڑکی کی طرف اپنا چہرہ گھمایا۔ "کاکنان کا خیال ہے کہ سن لی مرچکی ہے، اس لئے یہ یہیں محفوظ رہے گی۔"

کنگ نے سن لی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی نیم وا آنکھوں سے اسی کی طرف متوجہ تھی۔ کچھ دیر بعد سن لی کے ہونٹ متحرک ہوئے اور سریلی آواز کنگ کے کانوں سے ٹکرائی۔ "تم میرے پاس واپس آؤ گے نا....."

کنگ نے اثبات میں سر ہلا کر نائب سفیر کی طرف دیکھا۔ دو روز پہلے یہی نائب سفیر مراکش کا ایک معزز اہم آدمی تھا لیکن آج وہ ایک مایوس اور دل شکستہ باپ تھا جو مور کی عظیم بلوسرکل کے پاس مدد کی درخواست لے کر آیا تھا۔

مور خفیہ دروازے کی طرف گھوم گیا۔ "ہم اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے رخصت ہوجائیں گے۔"

"موسیو پال..... موسیو پال!" عرب لڑکے کی چیخیں سن کر ڈیوا کس پال چونک پڑا۔

اس کا نوعمر نائب ریت پر لڑکھڑاتا اور اسے

بھیانک آواز میں پکارتا ہوا آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور لڑکے کی طرف دوڑ پڑا۔ ایک چھوٹا سا طیارہ شام کے جھٹپٹے میں قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے گزرتے وقت پال سوچ رہا تھا کہ لڑکا تنہا کیوں ہے؟ آخر مور اس کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟ سورج غروب ہونے میں صرف بیس منٹ رہ گئے تھے اور اندھیرا ہونے کے بعد انہیں پرواز میں دشواری بھی پیش آسکتی تھی۔

"حاکم! کیا بات ہے؟" اس نے ہانپتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

"موسیو پال!" لڑکا بری طرح کانپ رہا تھا۔ پال نے دیکھا کہ لڑکے کے ساتھ ساتھ ریت پر خون کی ایک لکیر کھنچتی چلی آئی ہے۔ اس کا لبادہ بھی خون سے تر بتر تھا۔ جونہی وہ پال کے قریب پہنچا، اس کی ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا اور وہ اس کے قریب ہی گر گیا۔

طویل القامت پال نے لڑکے کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور تیزی سے اس چھپر کی طرف بڑھا جس کے نیچے تھوڑی دیر پہلے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی لڑکے کی ٹانگ کے زخم پر جمادی تھی، تاکہ اخراج خون کم سے کم ہو۔

"اوہ! میرے خدا..... تمہیں کیا ہوا حاکم؟"

"موسیو پال.....! وہ تعداد میں تین تھے۔ انہوں نے مار مار کر میری ٹانگ توڑ دی۔ میں بڑی مشکل سے لنگڑاتا ہوا یہاں تک پہنچ سکا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر میں ان کو طیارے کی خفیہ جگہ کے بارے میں نہیں بتایا تو وہ مجھے قتل کردیں گے اور....."

لڑکا دوبارہ کانپنے لگا۔ پال نے اسے چارپائی پر لٹادیا اور فرسٹ ایڈ ڈبے سے پٹیاں نکالنے لگا۔ ٹانگ کی ہڈی بیٹھاتے وقت لڑکا ذبح ہوتے ہوئے مویشی کی طرح چیخ اٹھا۔

"تم ان کے نرغے سے کس طرح نکلے؟" پال نے پوچھا۔

"ایک بہت لمبا سیاہ آدمی اور ایک نوجوان آکر ان تینوں سے لڑنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔"

بہت خوب، پال سوچنے لگا کہ اگر مور نے اس کے نائب کو غنڈوں سے نجات دلائی ہے تو وہ زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اس نے لڑکے کی طرف دیکھا جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"موسیو پال! میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں حاکم! تم ایک وفادار لڑکے ہو۔"

ابھی وہ مرہم پٹی سے فارغ ہی ہوا تھا کہ مور اپنے نوجوان ساتھی کے ساتھ وہاں پر پہنچ گیا۔

پال نے مور سے دریافت کیا۔ "تم لوگ کہاں رک گئے تھے؟"

"تھوڑی دیر کے لئے ہم منظر کی دلکشی میں کھو گئے تھے۔" مور نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ ہماری ذرا سی غفلت سے لڑکا زخمی ہوگیا..... اب وہ لوگ کئی سال تک کسی لڑکے کو زدوکوب نہیں کرسکیں گے۔ میں نے ان کی ہڈیاں پسلیاں ایک کردی ہیں۔"

"یہ تو تم لوگوں نے بہت ہی اچھا کیا۔" پال نے ہنس کر کہا۔

"ان تینوں کے بارے میں ان کے ساتھیوں کو جلد ہی معلوم ہوجائے گا اور میرا خیال ہے کہ ان کے متعدد ہمدرد کچھ دیر بعد یہاں انتقام لینے پہنچ جائیں گے۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ صرف پانچ منٹ کی مہلت ہے۔ کیا ہم اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔"

"یقیناً اس عرصہ میں ہم یہاں سے اڑ نکلنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔" پال نے مور کے پہلو میں کھڑے ہوئے نیلے لباس والے پرسکون نوجوان سے اپنا تعارف کرایا۔ "میں پائلٹ ہوں اور میرا نام ڈیواکس پال ہے۔ یہ میرا نائب ہے اور اسے حاکم کہا جاتا ہے۔"

"فائی کنگ!" نوجوان نے مسکرا کر اپنا نام

بتایا۔ "میں تمہارے نائب کو اٹھائے لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے زخمی لڑکے کو گود میں اٹھالیا اور وہ سب تیزی سے طیارے کی طرف بڑھنے لگے۔

پال نے پوچھا۔ "حاکم کو روکنے کی کوشش کرنے والے کون تھے؟"

مور نے کندھے اچکائے۔ "مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم کہ وہ کنگ فو فائٹر تھے۔ ریڈ سرکل کے آدمی بھی ہوسکتے ہیں اور مقامی بھی جو اس قسم کی حرکتیں کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔"

جہاز کے قریب پہنچ کر کنگ نے بے ہوش عرب کو مور کی بانہوں میں دے دیا اور خود بھی اوپر بیٹھ گیا۔ ابھی وہ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ پال کا نعرہ سنائی دیا۔

"لو..... وہ بھی آگئے" اس کے ساتھ ہی طیارے کا انجن گرج کر بیدار ہوا۔ اس نے جلدی سے طیارے کی سمت بدلی اور اسے ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ریت کے دھواں دھار بادل طیارے کی پشت پر چھا گئے۔

معاً ایک ہیلی کاپٹر اس سے تقریباً آٹھ سو گز کے فاصلے پر نمودار ہوا یہ ایک جنگلی ہیلی کاپٹر تھا۔ کنگ نے اندازہ لگایا کہ ہیلی کاپٹر تیس سیکنڈ میں ان کے نزدیک پہنچ جائے گا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ خدا جانے پال کیسا پائلٹ ہے اور وہ اس مصیبت سے نجات حاصل بھی کرسکے گا یا نہیں۔

اچانک پال نے طیارے کو زمین سے فضاء میں بلند کرلیا۔ اسی لمحے ہیلی کاپٹر سے گولیاں چلنا شروع ہوگئیں۔ پال نے چلا کر اپنے ساتھیوں سے جھک جانے کے لئے کہا۔ کنگ کے سر سے تقریباً چھ انچ بلندی سے گولیوں کی پوری باڑھ گزر گئی۔ پال نے بڑی مہارت سے طیارے کو موڑا اور گولیوں کی زد سے باہر نکال کر اسے فضاء میں بلند کرنے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ایک گن کنگ کی طرف بڑھائی۔ "ہے تو بہت پرانی لیکن تم چاہو تو اس بوڑھی مشین کا کمال دیکھ سکتے ہو۔"

ہیلی کاپٹر تیزی سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ مگر پال آسمان پر تیرتے ہوئے سیاہ بادلوں میں بار بار طیارے کو ادھر ادھر موڑ رہا تھا تاکہ وہ لوگ ہیلی کاپٹر کی گولیوں سے محفوظ رہیں۔ دو گولیاں طیارے کی کھڑکی سے ٹکرائیں۔ پائلٹ تیزی سے نیچے جھک گیا ورنہ اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے اڑ گئے ہوتے۔ اس نے کپڑے کا ایک بنڈل مور کی طرف پھینکا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر مور نے کسی خاص تیل میں بھیگے ہوئے اس بنڈل کو آگ لگا کر ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال دیا اور بنڈل کا گاڑھا دھواں عقب میں پھیلنے لگا۔

"موسیو کنگ.....! فائرنگ کے لئے تیار ہو، جیسے ہی میں اشارہ کروں فائر کھول دینا۔" پال نے کہا۔ اس نے جہاز کو جھکایا۔ ایک سو بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طیارہ پانی کی طرف اترنے لگا۔ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ گاڑھے دھوئیں سے بچنے کے لئے کاپٹر کو ادھر ادھر گھما رہا تھا۔ کاپٹر کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ بھی برابر نیچے آرہا تھا۔

پانی کی سطح جب صرف بیس فٹ رہ گئی تو پال نے کمال مہارت سے طیارے کو سیدھا کیا اور یہی وہ لمحہ تھا جس کا کنگ کو انتظار تھا۔ اس نے جیسے ہی ہیلی کاپٹر کو زد میں دیکھا مشین گن سے فائرنگ شروع کردی۔ کاپٹر کا پورا عملہ شاید اس غلط فہمی میں تھا کہ طیارہ غیر مسلح ہے۔ وہ اس وجہ سے قریب تر پہنچ گیا تھا پائلٹ نے بہت کوشش کی لیکن وہ ہیلی کاپٹر کو فوری طور پر گولیوں کی زد سے باہر نہ نکال سکا۔ اس کا ہاؤزنگ ٹوٹ گیا اور بڑا پنکھا بے ڈھنگے انداز سے انک انک کر گھومنے لگا۔

ہیلی کاپٹر پوری طرح تباہ نہیں ہوا تھا۔ پائلٹ ایک بار پھر گولیاں برسانے لگا تھا۔ سنسناتی ہوئی گولیاں طیارے کے چاروں طرف سے گزر رہی تھیں۔

"بہتر ہوگا کہ اس سے نمٹ لو۔" مور چیخا۔ "ورنہ ہم شارک مچھلیوں کی خوراک بن جائیں گے۔"

"موسیو! مجھے خطرہ ہے کہ کہیں اس مسلح کاپٹر سے راکٹ نہ پھینک دیا جائے۔" پال نے کہا۔

"اوہ..... کیا ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں....." پال نے کہا اور ایک بار پھر بحیرہ روم کی سطح سے طیارے کو بلند کرنے لگا۔ گولیوں سے

طیارے کے کسی حصے کو نقصان پہنچا تھا۔ انجن بری طرح گرجتا ہوا شور مچا رہا تھا۔

"جب میں ضرورت محسوس کروں تو کیا تم جہاز کی رفتار بڑھا سکتے ہو؟" کنگ نے کہا۔

"یقیناً موسیو..... جب تم کہو۔"

کنگ نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑھتے ہوئے جوش پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب دونوں جہازوں میں صرف پچاس گز کا فاصلہ تھا اور اسے ہیلی کاپٹر کے عملے کی سرد آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ صورت حال کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں سے راکٹ چھوٹنے والا تھا۔ پال نے اس کی ہدایت کے مطابق رفتار خاصی کم کر دی تھی اور اس کے اشارے پر رفتار بڑھانے کے لئے مستعد تھا۔ ہیلی کاپٹر اب ایک بار پھر قریب تر آنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ راکٹ کا نشانہ خطا نہ کر جائے۔

"اپنے طیارے کو بچانا تمہارا کام ہے۔" کنگ نے کہا۔ "رفتار..... بڑھا دو۔"

پال نے تھروٹل کو پورا گھما دیا۔ طیارہ بوڑھے شیر کی طرح گرجا اور ایک شدید جھٹکا لگا۔ کنگ نے ہیلی کاپٹر سے راکٹ چھوٹتے دیکھ لیا تھا۔ راکٹ ابھی ہیلی کاپٹر سے نکل کر کچھ ہی آگے آیا تھا کہ اس نے مشین گن سے راکٹ کو نشانہ بنایا۔ راکٹ پھٹ گیا اور اسی لمحے ہیلی کاپٹر اس کے قریب پہنچا۔ ممکن ہے کہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اسے بچانے کی کوشش کی ہو لیکن پال اور اس کے ساتھیوں کو شراروں، شعلوں اور دھوئیں میں دوڑتی ہوئی چنگاریوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پال نے طیارے کی رفتار اس وقت کم کی جب اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ خطرے سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ ہیلی کاپٹر میں موجود ریڈ سرکل کے چھ گرگوں اور قیمتی مسلح ہیلی کاپٹر کی تباہی سے مور بہت خوش تھا۔ پال جوش سے چیخ رہا تھا۔ "یہ لڑکا واقعی کام کر سکتا ہے ماسٹر!"

دو گھنٹے بعد پال اور اس کا نائب انہیں چھوڑ کر واپسی کے لئے روانہ ہو گئے۔

بلو سرکل کے دونوں ماسٹر فائٹر ایک گلی میں خاموش کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اب تک کئی آدمیوں سے مطلوبہ شراب خانے کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی ان کی بات سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ ہر آدمی اجنبی نگاہ سے انہیں دیکھ کر آگے بڑھ جاتا تھا یا پھر انہیں کڑے تیوروں سے گھورنے لگتا تھا۔

کنگ نے تنگ آ کر لوگوں سے پوچھنا ترک کر دیا۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس شراب خانے تک کیسے پہنچیں گے۔

اچانک مور کی نگاہ ایک بوڑھے شرابی پر جم گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مور نے کنگ کو ٹہوکا دیا اور دونوں ہی آگے بڑھے۔

"فادر!" مور نے نرمی سے بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"فادر.....؟" بوڑھے شرابی نے چونک کر کہا۔ "اس شہر میں مجھے فادر کہہ کر کون پکار رہا ہے؟ میں تو ایک عرصے سے کسی کا فادر نہیں ہوں۔" اس نے نشے سے بوجھل پلکیں اٹھائیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں کی طرف دیکھا۔ "اوہ، تم اجنبی ہو، خیر میں اجنبیوں کے لئے واقعی فادر ہو سکتا ہوں، میرے بچو، بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں کچھ معلومات درکار ہیں۔" مور نے کہا۔

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے لیکن معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی کو فادر بنا لینا کافی نہیں۔"

"ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں فادر؟"

"وہی جو کمانے والے بچے کرتے ہیں، کیا تم ایک چمچہ بھر شراب کی رقم بھی نہیں دے سکتے؟"

مور نے چند سکے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے جنہیں جیب میں ڈالنے کے بعد شرابی نے کہا۔ "پوچھو؟ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہم مسٹر شیلے کے شراب خانے میں جانا چاہتے ہیں۔"

"ضرور جاؤ..... تمہیں کون روک رہا ہے؟"

"مصیبت یہ ہے فادر کہ ہمیں راستہ معلوم

نہیں۔" مور نے بے بسی کا اظہار کیا۔

"راستہ میں بتائے دیتا ہوں۔" بوڑھے شرابی نے کہا۔ "سیدھے چلے جاؤ، پھر دائیں..... نہیں شاید بائیں....." اس نے رک کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر مور کے دیئے ہوئے سکے نکال کر غور سے دیکھے۔ "میں بھی حیران تھا کہ میری یادداشت کو یکا یک کیا ہو گیا ہے۔"

مور نے کن انکھیوں سے کنگ کی طرف دیکھا۔ کنگ کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ اس نے چند سکے مزید اس شرابی کی نذر کئے تو شرابی کی کھوئی ہوئی یادداشت فوراً ہی واپس آ گئی۔ "ہاں..... دائیں طرف گھوم کر اٹھائیسویں گلی میں چلے جاؤ۔ تم اس شراب خانے کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے اور وہ لوگ بھی تمہیں ہرگز نظر انداز نہیں کریں گے۔ ایک بات غور سے سن لو، اس شراب خانے میں کوئی شخص بلا اجازت داخل نہیں ہو سکتا، اگر کوئی کوشش کرے تو اس کی لاش ہی باہر آتی ہے۔"

مور اور کنگ نے نگاہوں کا تبادلہ کر کے بوڑھے شرابی کا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئے۔

پانچ منٹ بعد وہ بلیک پیرٹ کے سامنے، دیوار کے سائے میں کھڑے اس کے نیون سائن کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شراب خانے کا دروازہ بند ہے اور باہر دو جسیم آدمی پہرے پر کھڑے ہیں۔ ان کی کمر کی پٹیوں میں لمبے خنجر دور سے نظر آ رہے تھے، انہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ پہرے دار اندر جانے سے روکیں گے۔

"میرا خیال ہے ان سے نرمی سے بات کرنا بے کار ہو گی۔"

مور نے اثبات میں سر ہلایا۔ "پھر کیا خیال ہے؟"

"ہمیں برداشت مداخلت والا اصول استعمال کرنا چاہئے۔"

مور نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں آگے بڑھنے لگے۔ سورج کو غروب ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے اور ان کے پاس اب زیادہ وقت نہیں تھا جیسے ہی دونوں آدمیوں کی نگاہ ان پر پڑی ایک نے غرا کر دوسرے سے کچھ کہا اور پھر چیخ اٹھا۔

"جہاں ہو، وہیں رک جاؤ۔"

کنگ کی فلائنگ ہیل اس کے جبڑے پر پڑی اور وہ ٹوٹے ہوئے دانت اور خون دیوار اور فرش پر بکھیرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ رات کی نیم تاریکی میں مور کا نیلا لبادہ منتشر دکھائی دیا پھر اٹھی ہوئی ہوف کک نے نگراں کی پیشانی کو تاک لیا۔ کھوپڑی اس انداز میں چیتھڑے چیتھڑے ہو گئی۔ جیسے وہ ناریل جیسی کوئی شے تھی۔

اس کے بعد دونوں نے دروازے کو آزمایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا انہوں نے ڈریگن اسٹیمپ استعمال کئے لیکن دروازہ نہیں کھلا صرف کانپ کر رہ گیا۔ چار ایڑیاں ڈائنامیٹ جیسی قوت کے ساتھ دروازے سے ٹکرائی تھیں۔

"میرا خیال ہے ایک کوشش اور کریں تو کافی رہے گی۔" مور نے کہا۔

"دونوں پیچھے ہٹے اور ایک بار پھر ان کی ایڑیاں دروازے سے ٹکرائیں دونوں تختے اکھڑ گئے۔ مور نے ہاتھ ڈال کر حفاظتی پٹی کو ہٹایا اور دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

کمرے میں چرس کی بو اور سگریٹوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔

کمرے کے دور افتادہ حصے میں ایک جسیم آدمی تاش کے پتے میز پر پھیلا رہا تھا۔ اس نے سفید سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی گنجی کھوپڑی بلب کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ جیسے اس شخص کی نگاہ ان دونوں پر پڑی وہ آہستہ آہستہ کرسی سے اٹھا اس کے اردگرد پھیلے ہوئے چند آدمیوں نے فوراً ہی ریوالور نکال لئے تھے لیکن گنجے نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ..... آگے آ جاؤ..... میں تمہیں دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔"

اس کی آواز میں سانپ جیسی پھنکار تھی۔ بلو سرکل کے دونوں ماسٹر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

"بیٹھ جاؤ۔" میکس شیلے نے اپنا تعارف

www.paksociety.com

کراتے ہوئے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں شکریہ ہم کھڑے رہنا پسند کریں گے۔"

میکس شیلے نے کندھے اچکائے اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم دونوں مسز باب کے سلسلے میں آئے ہو۔ اس سے قطع نظر کہ تم نے میرے دو عزیز ساتھیوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔" اس نے دروازے سے باہر گلی میں پڑی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کیا اور حقارت سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

کنگ اور مور لڑنے کا انداز اختیار کئے کھڑے تھے۔ انہوں نے کن انکھیوں سے چاروں طرف دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ ان پر کس طرف سے حملہ ہوسکتا تھا۔

"تم تشدد پسند ہو لیکن میں ایسا نہیں ہوں۔ میں تو ایک سیدھا سادا کاروباری آدمی ہوں اور میرے کاروبار کا نام ہے دولت! مجھے صرف اسی ایک چیز سے دلچسپی ہے۔ کیا ہمارے درمیان کوئی ایسا کاروباری معاملہ طے ہوسکتا ہے؟"

مور نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں تکلفات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ وہ لڑکی جہاں ہے اس کے بارے میں مجھے علم ہے۔ میں تمہیں معلومات فراہم کرسکتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے کوئی دھوکہ دینے کی کوشش کی تو اڈی کا یہ اطمینان برقرار نہیں رہ سکتا۔ لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے لئے دولت کی پرواہ کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ جمعہ کی شام غروب ہونے تک پانچ لاکھ فرانک یہاں پہنچادے گا..... اور وہاں..... براہ کرم رقم کے بارے میں انکار نہ کرنا، میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس....." اس نے مور کی طرف اشارہ کیا۔ "اس بڑی رقم کی ایک قسط موجود ہے۔ ایک لاکھ فرانک! اگر تم یہ رقم میرے حوالے کردو تو میں تمہیں لڑکی کا پتہ بتادوں گا۔ اس کے بعد کے معاملات کو سنبھالنا تمہارا کام ہے۔"

مور اور کنگ خاموشی سے اسے گھورتے رہے۔

"میں ایک جواری ہوں....." شیلے کہہ رہا تھا۔ "میں تشدد پسند نہیں کرتا، اس سے مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔"

اس نے عقبی پردے کی طرف معنی خیز اشارہ کیا۔ پردہ سرکا اور ایک مشین گن کی بھیانک نال دکھائی دینے لگی۔ "تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے..... اب تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ لڑنے کی بجائے جیب ہلکی کرو اور مجھ سے معلومات حاصل کرو اور آگے بڑھ جاؤ۔ اپنی توانائی کو محفوظ رکھو کیونکہ مستقبل قریب میں تمہیں اس چیز کی اشد ضرورت محسوس ہوگی۔" اس نے رقم وصول کرنے کے لئے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھادیا۔

"پوری رقم کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟" مور کی آواز میں الجھن تھی۔

"اگر تمہارے ساتھیوں نے اس کام کے پانچ لاکھ فرانک مانگے ہیں تو تم صرف ایک لاکھ میں سودے بازی کیوں کررہے ہو؟"

شیلے نے ایک طویل سانس لی اور پھیلا ہوا ہاتھ گرادیا۔ "دراصل میں اس پرانے مقولے کا حامی ہوں۔ نو نقد نہ تیرہ ادھار۔ کیا تمہیں بھی یہ بات پسند ہے؟"

مور نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنے لبادے سے ایک نیلا لفافہ نکال کر شیلے کی طرف بڑھادیا۔ رقم دیتے ہی دونوں کے جسم تن گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب شیلے انکار کردے گا اور شراب خانے میں ایک ہولناک جنگ شروع ہوجائے گی لیکن مور کو حیرت ہوئی کہ ایسا نہیں ہوا۔

"اس آدمی کا نام کیا ہے؟" مور نے دریافت کیا۔

"بونی میلال جاؤ اور عبداللہ کا نام پوچھ لینا۔"

کنگ اور مور خاموشی سے پلٹے اور شراب خانے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد شراب خانے کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سب معمول کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگ گئے، صرف چند آدمیوں کو لاشیں اٹھانے کی زحمت ہوئی تھی اور دو آدمیوں کو شراب خانے کے اندر نگرانی کرنے کے بجائے باہر مامور کردیا گیا تھا۔

شیلے رقم کا لفافہ لئے کرسی سے اٹھا اور کمرے کے عقبی دروازے سے دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یہ دفتر تھا۔ وہاں صوفے پر ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے شیلے کو گھور رہی تھی۔ شیلے نے اپنا بیلٹ کھولا تو اس نے بھوکی نگاہوں میں چمک دیکھی۔ لڑکی کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ شیلے بھوکے بھیڑیئے کی طرح اس کی طرف لپکا۔ "میری پیاری مسز باب!" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہر بات میرے منصوبے کے عین مطابق ہورہی ہے۔"

"مجھے جو چیز الجھن میں ڈال رہی ہے وہ یہ ہے کہ....." مور نے کہا۔

آخر اس کتے کے بچے نے ہمیں زندہ کیوں چھوڑ دیا ہے جب کہ وہ ہمیں آسانی سے ہلاک کرسکتا تھا۔"

وہ ایک کیفے میں پہنچے وہاں سے فون کرکے اطلاع دی کہ ان کی اگلی منزل مقصود کون سی جگہ ہے۔ مور نے یہ کال اس عجیب شخصیت کو کی تھی جو اولڈ بل کے نام سے مشہور تھا۔ فون کرنے کے بعد وہ سفر پر روانہ ہوئے۔ وہ رات بھر سفر کرتے رہے۔ ابتداء میں انہوں نے ایک کرائے کا ٹرک اور بعد میں ایک طیارہ استعمال کیا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ صوبائی دارالحکومت بونی میلا پہنچ گئے۔

"مجھے رقم کے نقصان کی پرواہ نہیں۔" مور کہہ رہا تھا۔ "میں تو حیران ہوں کہ اسے ہماری آمد کا علم تھا، وہ مسلح حالت میں منتظر بھی تھا پھر اس نے معاً ہمارے لئے اتنا آسان کیوں بنادیا۔ بس یہی ایک بات مجھے مسلسل پریشان کررہی ہے۔"

"ایک لاکھ فرانک....." کنگ نے یاددہانی کرائی۔

"لیکن وہ اس سے زیادہ بھی طلب کرسکتا تھا۔" مور نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"اس صورت حال سے صرف کاکنان کا نام سامنے آتا ہے۔ بہرحال، اگر شیلے واقعی ریڈ سرکل اور کاکنان کو دھوکہ دے رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اسے کاکنان کی طرف سے کسی دھوکے کی توقع ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی دانست میں ہمارے ہاتھوں کاکنان کو قتل کروانا چاہتا ہے۔"

"ہاں..... یا پھر ہم اس کے ہاتھوں ختم ہوسکتے ہیں، اس طرح شیلے ایک لاکھ فرانک کے فائدے میں رہتا ہے۔"

صبح کی دھند میں بونی میلال کا شہر قبرستان کی مانند پراسرار نظر آرہا تھا۔ وہ اس وقت خیموں کے پاس سے گزر رہے تھے جن کے باہر الاؤ روشن تھے۔ دونوں نے کئی گھنٹوں سے آرام نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک گھنٹے تک آرام کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک مطلوبہ مخبر اپنے بستر سے اٹھ سکتا تھا اور وہ اس سے رابطہ قائم کرسکتے تھے۔

وہ ایک گھنٹہ بعد اٹھے اور شہر کی طرف چل دیئے۔ ابھی وہ پہلے مقام سے چند قدم دور تھے کہ انہیں ایک آدمی اپنی طرف آتا دیکھائی دیا۔ وہ ان کے قریب پہنچا۔ انہیں خوش آمدید کہا اور بتایا کہ بونی میلال کا سردار ان کو طلب کررہا ہے اس دعوت میں مور کو عیاری کی بو محسوس ہورہی تھی لیکن وہ اسے قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔

بونی میلال کی گلیوں سے گزرتے وقت کنگ حیران تھا کہ آخر اس شہر کے لوگ کہاں غائب ہوگئے ہیں! گلیاں سنسان تھیں اور کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا صرف اسے اتنا احساس تھا کہ بند کھڑکیوں اور کواڑوں کی جھریوں سے کئی آنکھیں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتے رہے حتیٰ کہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جس کے چاروں طرف پتھروں سے چاردیواری بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف فوارہ تھا اور ان کے سامنے نصف دائرے کی صورت میں سات آدمی کھڑے ہوئے تھے جن کے کڑے تیوروں سے ان کے ارادے ظاہر تھے۔

اس میدانی جگہ سے وہ کھڑکیاں بہ آسانی نظر آرہی تھیں جن سے عورتوں، مردوں اور بچوں کے چہرے جھانک رہے تھے۔ کنگ کی نگاہ اس دروازے

www.Aiourdubooks.net

پر جم گئی جہاں ایک جسیم آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی کے دکھائی دیتے ہی سات آدمیوں میں سے ایک نے سرگوشی کی۔ ''عبداللہ.....!'' اسے دیکھتے ہی کھڑکیوں سے جھانکنے والوں نے پرجوش نعرے لگانے شروع کردیئے تھے۔

عبداللہ نے ہاتھ اٹھایا تو ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ ''مراکش اور بونی میلال کے باشندو! اس وقت تمہارے سامنے سلطان کی طرف سے بھیجے ہوئے دو آدمی ہیں، ان کی موت کے منظر سے محظوظ ہونے کی کوشش کرو کہ تمہیں ایسے مناظر شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

ایک بار پھر چیخ وپکار شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی نصف دائرے سے دو آدمی آگے بڑھے۔

کنگ اور مور خاموش کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑنے کے فن میں ماہر ہیں۔ وہ نفرت آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ کنگ اور مور نے فوراً کیٹ اسٹینس اختیار کرلئے۔ حملہ آوروں نے ایلی فنٹ کک آزمائی لیکن بلوسرکل کے دونوں ماسٹر طرح دے گئے انہوں نے بیک وقت اس کا پوبلوز استعمال کئے لیکن کسی بھی حملہ آور کی کنپٹی کو نقصان نہیں پہنچا۔ جواباً انہوں نے ریم ہیڈ پنچ استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اسی دوران کنگ کو موقع مل گیا۔ اس نے حریف کے منہ پر پاؤنڈنگ دیوما را جس سے اس کی ناک ٹوٹ گئی۔ کنگ کا ہاتھ بھی فوارے کی طرح نکلنے والے خون سے سرخ ہوگیا تھا۔

مور اور اس کے حریف میں جنگ جاری تھی۔ مور نے ایک طرف ہٹتے ہوئے نائف پوائنٹ استعمال کیا۔ حملہ آور چیخا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی، اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس نے دوسرا وار کیا۔ فضاء میں کھوپڑی چٹخنے کی آواز دور تک گونجی تھی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دو نئے آدمیوں نے مردہ ساتھیوں کی جگہ لے لی۔

اس مقابلے میں کنگ کا بایاں گھٹنا زخمی ہوا۔ تکلیف زیادہ نہیں تھی لیکن وہ اس ٹانگ کو مہارت سے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ حملہ آور سے دب رہا تھا۔ وہ فوارے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ کھڑکی ہتھیلی کے جس وار سے حملہ آور نے خود کو بچایا تھا اس نے فوارے کی دیوار میں درز پیدا کردی تھی۔

مور کی بائیں آنکھ کے اوپر زخم آگیا تھا۔ خون بار بار رس کر آنکھ میں گر رہا تھا لیکن وہ اس بات کی پرواہ کئے بغیر اس وقت تک سے گرتا رہا جب تک مخالف کی دونوں ٹانگیں اور ایک کلائی توڑنے میں کامیاب نہیں ہوگیا..... کنگ کے مدمقابل نے بڑی مہارت کا مظاہرہ کیا لیکن ایک موقع پر ذرا سی لاپرواہی ہوئی اور کنگ کی انگلیوں کا خنجر اس کے سینے میں گھستا چلا گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے بڑی دردناک چیخ ماری تھی جس سے پورا ماحول کانپ گیا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر دروازے میں نظر آنے والی شخصیت غائب ہوگئی اور باقی حملہ آوروں کو بھی آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اچانک کنگ کی نگاہ ایک مکان کی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ سورج کی طرف پشت کئے ہوئے دو آدمی وہاں کھڑے تھے۔ جب ان میں سے ایک بلند آواز میں بولا تو غالباً سب نے اس کی آواز پہچان لی۔

''بونی میلال کے لوگو!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم نے عبداللہ کے آدمیوں کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ لیا اور تمہیں یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کون سچا ہے..... اب تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

''استقلال!'' کھڑکیوں سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ''استقلال! استقلال!''

دونوں آدمی نیچے کودے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ کنگ خاموشی سے ان کو گھور رہا تھا۔ ان میں سے ایک مور کی طرح سیاہ فام تھا اور دوسرا غیر ملکی تھا سیاہ فام نے مور کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تم نے بہت اچھے انداز کا مظاہرہ کیا ہے۔''

مور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کنگ کی طرف دیکھا اور ان دونوں کی طرف اشارہ کیا جو چھت سے اتر کر ان کی طرف آئے تھے۔ ''انہیں جانتے ہو کنگ! یہ دونوں میرے بیٹے ہیں۔''

ایک گھنٹے بعد وہ چاروں ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور کنگ خاموشی سے پراسرار ماسٹر مور کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے باادب بیٹھے ہوئے تھے۔ مور کہنیاں میز پر ٹکائے بڑے فخر سے باتیں کررہا تھا۔ خوب صورت لڑکیاں کھانے کی میز پر چیزوں کو رکھ رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی کنگ بھی خود کو بڑا پرسکون محسوس کررہا تھا۔

سیاہ فام ماسٹر مور کا ذہن ماضی کے خوشگوار لیکن اداس کردینے والے دھندلکوں میں کھو گیا۔ ''الامین کے محاذ پر رومیل کو شکست ہوئی تو جرمن فوج پسپا ہونے لگی۔ ہم لوگ ان کے تعاقب میں تھے۔ وہ راستے کی ہر بستی کو برباد کرکے خاک میں ملاتے چلے جارہے تھے۔ ہم ایک قصبے تک پہنچ گئے ابا کھانا ہی یہ قصبہ خوب صورت عورتوں کے لئے مشہور تھا۔ اس وقت جرمن فوج وہاں سے ایک دن کی مسافت پر تھی، ہمارے پاس بالکل وقت نہیں تھا لیکن میں وہاں رکنے پر مجبور ہوگیا۔

میرے کانوں میں کسی عورت کے کراہنے کی آواز آئی تو میں ایک جھونپڑے میں داخل ہوا۔ وہاں میں نے دنیا کی حسین ترین عورت دیکھی وہ ایک نوجوان کا سرگود میں رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ خود اس کے اپنے بال خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میری نگاہوں میں مختلف بستیوں کے وہ کنوئیں گھوم گئے جن کا پانی اپنے ہی لوگوں کے خون سے سرخ ہوچکا تھا۔ وہ عورت اپنے جوان شوہر کی لاش پر آنسو بہا رہی تھی۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پالنے میں دو بچے سو رہے تھے۔ ایک سیاہ فام تھا۔ اس نے سیاہ فام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''عبدل اور دوسرا سفید فام ابراہیم۔'' اس نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''تم نسل کے اس تضاد پر حیران ہوگے..... بہرحال عبدل، فالیہ کے مرحوم شوہر کا بیٹا ہے، اس کے بعد فالیہ نے دوسری شادی کی۔ ابراہیم کا باپ ایک غیر ملکی سپاہی تھا۔''

کنگ نے اثبات میں سر ہلایا جیسے اس الجھن کے دور ہونے سے پرسکون ہوگیا ہو۔

''میں وہاں ایک سال تک رہا۔ فالیہ ایسی عورت نہیں تھی کہ دنیا کا کوئی بھی مرد اسے آسانی سے نظرانداز کرکے چلا جاتا۔ میں اس سے زیادہ دنیا کی کسی عورت سے متاثر نہیں ہوا تھا..... فالیہ آج سے پانچ سال سے تھیبرز کی گلیوں میں مرگئی۔ ایک فرانسیسی گولی نے اس کا کام تمام کیا تھا۔ اس وقت اس کے دونوں بیٹے ساتھ تھے۔''

ماں کے ذکر پر عبدل کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

''وہ ایک ہجوم کے سامنے تقریر کررہی تھیں.....'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''وہ عظیم تھی، کسی ملکہ کی طرح پروقار..... انہوں نے دھیمے لہجہ میں ''استقلال'' کہا اور ہمیں اس آگ کو زندہ وتابندہ باقی رکھنے کی وصیت کرکے مرگئی۔''

''ایک سال بعد مراکش آزاد ہوگیا..... آج بھی رباط میں فالیہ کو انتہائی عزت واحترام سے یاد کیا جاتا ہے۔''

''اور اب تک دونوں اس کے ادھورے کام کی تکمیل کررہے ہو۔'' کنگ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا اور چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ ماحول بہت اداس محسوس ہونے لگا تھا۔

سورج ابھی پوری طرح سر پر نہیں آیا تھا۔ وہ چار عربی نسل کے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور تیزی سے پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگے۔

''ژوایا چالیس میل دور ہے۔'' عبدل نے کہا۔ ''نہیں وہاں شام سے پہلے پہنچ جانا چاہئے۔ ممکن ہے کہ راستے میں عبداللہ کے تعاقب گرگوں سے بھی ملاقات ہوجائے۔ بونی میلال میں اسے جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا وہ اس کو بھول نہیں سکتا۔ پہاڑی قبائل میں سے بیشتر اس کے اثر میں ہیں۔''

www.PdfBooksFree.pk

سفر ہر ممکن تیزی سے گزر رہا تھا۔ مور نے عبداللہ کے بارے میں عبدل اور ابراہیم سے جو کچھ سنا تھا وہ مختصراً کنگ کو بتا چکا تھا۔ عبداللہ نسلاً ترک تھا۔ اس کی باغیانہ سرگرمیوں کا آغاز مشرق وسطی سے ہوا تھا۔ یہ سوئز کے بحرانی دور کی بات تھی۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھا اور اس نے ہمیشہ مسند مراکش پر بیٹھنے کے خواب دیکھتے تھے۔ وہ ہر صاحب اقتدار سلطان سے راہ و رسم بڑھاتا اور بالآخر اس سے غداری کرتا، لیکن اصل مقصد سے ہمیشہ دور ہی رہا۔

ان دنوں وہ کاکنان کا آلہ کار تھا۔ کاکنان کو ایک ایسے مقرر کی ضرورت تھی جو عوام میں اسے مقبول بنا سکے۔ عبداللہ بستی بستی گھومتا رہا اور کاکنان کی حمایت میں تقریریں کرتا رہا۔ سادہ لوح عوام اس کی باتوں میں آتے گئے اور کی طرح حمایت کرنے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اس نے کنگ اور مور کی آمد سے ایک روز پہلے یہ افواہ پھیلائی تھی کہ وہ سلطان کے سفیر نہیں بلکہ باغی ہیں اور سلطان نے انہیں دھوکے سے اسے اس لئے بھیجا ہے کہ انہیں عوام کے سامنے ٹھکانے لگا دیا جائے۔

مور نے بلیک پیرٹ شراب خانے سے نکل کر اپنے چیف اولڈ بل کو جو کال کی تھی اس کے نتیجے میں عبدل اور ابراہیم کو یونی میلال روانہ کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر جب صورت حال کا جائزہ لیا تو استقلال کے حامیوں کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ اس کے باوجود شہر کے بیشتر لوگوں کو یقین نہیں آیا تھا لیکن جب ان دونوں نے جنگ جیت لی تو عبداللہ چپکے سے کھسک گیا...... ان حالات میں عبدل اور ابراہیم کی باتوں پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

عبدل نے یہ بھی بتایا تھا کہ عبداللہ خوب رقمیں خرچ کرتا رہا ہے۔ یہ بات سن کر مور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ہر بات اب اس کے سامنے عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ ابراہیم نے مور کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مسز باب کا اغوا پہلی واردات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی درجنوں عورتیں اور لڑکیاں اغواء ہوئی ہیں لیکن زرتاوان صرف اسی لڑکی کے لیے مانگ لیا ہے۔''

''اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے غلاموں کی تجارت بھی شروع کر رکھی ہے۔'' مور غرایا۔

اچانک آس پاس کی پہاڑیاں گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھیں۔ کنگ نے خود کو فوری طور پر جنگ کے لئے تیار کر لیا۔ دو درجن کے لگ بھگ سوار ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ان سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ انہوں نے مقامی لباس پہن رکھا تھا اور ان کے سروں پر سیاہ پگڑیاں تھیں۔ ان کا سردار آگے بڑھا۔ اس نے رائفل اٹھا کر کہا۔ ''استقلال!''

عبدل اور ابراہیم نے بھی جواباً استقلال کہا اور انہیں سردار کی زبانی یہ سن کر قدرے طمانیت حاصل ہوئی کہ وہ ان کے خیر مقدم کے لئے آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیٹی کی شادی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انہیں کھانے کے لئے مدعو کرے۔

دعوت کے دوران میں کنگ حیران ہو رہا تھا کہ آخر یہ لوگ اجنبیوں کے لئے اس قدر فیاض کیوں ثابت ہو رہے ہیں اور اتنی فراخدلی سے خرچ کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے ملتا ہے۔ شادی کے سلسلے میں رقص کا جو پروگرام ترتیب دیا گیا تھا وہ خاصا خوشگوار تھا۔ اس وقفے میں کنگ کو اپنی منگیتر یاد آتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ اس کی زندگی میں خوشی کا ایسا دن کب آئے گا۔

شادی کے ہنگامے میں انہوں نے دو گھنٹے سے زیادہ ضائع نہیں کئے۔ سردار اور اس کے ساتھیوں نے انہیں گاؤں کے کنارے تک جا کر الوداع کہا اور ان کا سفر ایک بار پھر تیزی سے شروع ہو گیا۔

''استقلال کی حقیقت کیا ہے؟'' کنگ نے سوال کیا۔

''1956ء کی آزادی تک درحقیقت یہ مراکش کی ایک نجات دہندہ فوج تھی۔'' عبدل نے کہا۔ ''لیکن اب اس کا کام صرف یہ کہ مراکش کو زیادہ سے زیادہ، قوی، صحت مند اور محفوظ بنایا جائے اور فرانسیسیوں سے ماضی

اسماءالحسنیٰ۔۔۔۔کامیابی کا راستہ
آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں
پریشانیوں سے چھٹکارہ
ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے
شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو
جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح
اولاد کا نہ ہونا یا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی
کاروباری بندش
جنات کا سایہ
دیگر مسائل
سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔
وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے
ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہو گا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی
سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ
کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر
خواہش
زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے
غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہو گی انشاءاللہ
میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمالیجئے
ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔
نوٹ: جو خواتین وحضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاءاللہ کامیابی ہوگی۔
وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ۔ وہ آنکھیں ہی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔
سید فرمان شاہ
اچھرہ شاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان
0300-6484398

کے تمام جھگڑوں کو فراموش کردیا جائے۔"

کنگ نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ہواؤں کی وادی میں پہنچ گئے۔ یہ خطرناک ترین وادی تھی۔ اس میں ہوا اتنی تیزی سے گزرتی تھی کہ قدم اٹھانا دوبھر ہو جاتا تھا۔ مور سب سے آگے تھا وہ گھوڑے سے کود گیا اور اس کی لگام تھام کر آہستہ آہستہ درے میں پہنچ گیا۔ عبدل اور کنگ اس کے پیچھے تھے اور ابراہیم سب سے پیچھے قدم جما جما کر گھوڑے کو کھینچ رہا تھا۔ تیز ہوا ان کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھی اور وہ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد ہانپنے لگے۔

درے سے گزرتے وقت اچانک کنگ رک گیا۔ اس کی نگاہ ایک ابھرے ہوئے پتھر پر پڑی۔ اسے کچھ غیر معمولی پن نظر آیا۔ مور بھی رک گیا تھا۔ کنگ نے اس پتھر کی طرف دیکھا جس کے ساتھ ایک تار نظر آرہا تھا۔ ہوا کی وجہ سے بات کرنا مشکل تھی، آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کان بہرے ہو رہے تھے۔ کنگ نے گھوڑا عبدل کے حوالے کیا۔ وہ سب گھوڑوں کی آڑ میں کھڑے ہوگئے اور کنگ اپنے طاقت ور جسم کے عضلات کو اکڑائے ہوئے ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھاتا، تھوڑا سا آگے جھکا اس چٹانی پتھر کی طرف بڑھتا رہا۔

پتھر ہوا سے لرز رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ڈائنامیٹ کا تار پتھر سے لپٹا ہوا ہے۔ یہ تار درے میں ٹھیک درمیان سے گزرتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے تار کو کاٹ دیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا ڈائنامیٹ کے قریب پہنچا۔ اس وقت تک مور بھی پوری صورت حال سمجھ کر اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ڈائنامیٹ دیکھ کر اس کا چہرہ سینکڑوں سلوٹوں میں تبدیل ہوگیا۔ اس نے کنگ کو روکا اور پھر ڈائنامیٹ کا سوئچ نکال کر اسے ناکارہ کردیا۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ درے سے گزرتے وقت اگر کسی کا پاؤں تار سے الجھ جاتا تو ڈائنامیٹ کے پھٹنے سے درے میں ہی دب کر رہ جاتے۔

درے سے نکلنے کے بعد انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ گھوڑے ابھی تک بدکے ہوئے تھے۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا نے انہیں بھی حواس باختہ کردیا تھا۔ انہیں چکار کر وہ ایک بار پھر آگے بڑھے۔ اب وہ ژوایا سے پہلے آنے والی پہاڑیوں کے آخری حصے میں پہنچ گئے تھے۔

اچانک انہیں کپڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ انہوں نے ایک آدمی دیکھا جو آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ مور نے بغور اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا..... "فادر ہانسل!"

فادر ہانسل قریب پہنچا۔ اس نے چھڑی اٹھائی اور مسکرا کر کہا۔ "استقلال"

فادر ہانسل کا قلعہ نما مکان اترائی پر واقع تھا۔ وہ اس کی رہبری میں وہاں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ اس مکان سے کچھ دور فصلوں اور ندی کی دوسری طرف ژوایا کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ فادر ہانسل بربر تھا۔ وہ انہیں پہاڑوں میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ساری عمر تبلیغ میں گزاری تھی۔ وہ اس وقت بھی پادری جیسا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مور اور فادر ہانسل جس انداز میں ملے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی مل چکے ہیں۔ جب مور نے کنگ کو بتایا کہ فادر ہانسل نے زندگی کا بڑا حصہ ریڈ سرکل سے جنگ کرتے ہوئے گزارا ہے تو وہ چونک پڑا۔ اس کی نگاہوں میں اپنے محترم اور قابل قدر استاد لن فرنگ کی تصویر گھوم گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ فادر ہانسل ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے جو اس کے استاد کی رفاقت میں رہے ہیں۔ اس نے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ وہ بھی کنگ فوماسٹر ہے۔

کھانے کے دوران فادر ہانسل نے لڑکیوں اور عورتوں کے غائب ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی بستی پر بھی حملہ کیا گیا تھا اور کئی عورتیں اغوا کرلی گئی تھیں اور یہ بھی بتایا کہ ریڈ سرکل نے ایک عشرت کدہ بنا رکھا ہے جسے "شیطانوں کی جنت" کہا جاتا ہے۔ اغوا

کر کے عورتوں کو وہاں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس جنت کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر کوئی بلا اجازت اس طرف جا نکلتا ہے تو کبھی واپس نہیں آتا۔ وہاں اغوا شدہ عورتیں ریڈ سرکل کے اشاروں پر اپنا سب کچھ لٹانے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور انہیں غلاموں جیسی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ ان کے دماغ، جسم پر حکومت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

فادر ہانسل اپنے سفید بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ کرب تھا۔ "پہاڑی قبائل نے ریڈ سرکل کی قوت کو تسلیم کرلیا ہے اور اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اس کے بدلے میں انہیں ہر طرح کا جانی و مالی تحفظ حاصل ہے۔"

"شیطانوں کی جنت کہاں ہے؟" کنگ نے دریافت کیا۔

"یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے..... میں وہاں تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ محض افواہ ہو لیکن اگر یہ حقیقت ہے تو ہم جلد ہی اسے دیکھ لیں گے۔ یہ بات صرف عبداللہ ہی کو معلوم ہے کہ....."

اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بلو سرکل کے دونوں ماسٹروں کو اشارہ کیا اور ہال کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچے جہاں چاروں طرف دیواروں پر بچوں، عورتوں، لڑکیوں، جوانوں اور بوڑھوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ "یہ میرا خاندان ہے۔" فادر ہانسل نے اشارہ کر کے فخر سے کہا۔

کنگ خاموشی سے ایک ایک تصویر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا حتی کہ وہ ایک تصویر کے سامنے رک گیا۔ یہ ایک نوجوان چینی کی تصویر تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس تصویر کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ نوجوان چینی کی آنکھیں اسے دیکھی بھالی لگی تھیں۔ اس نے وضاحت طلب نگاہ سے فادر ہانسل کی طرف دیکھا۔

فادر کے ہونٹوں پر سوگوار سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے اس وقت یہاں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ قاتل گلیوں میں آزادی سے گھومتے تھے۔ ہر ایک کا یہ عالم تھا کہ بھائی کو بھائی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔

میں ایک مبلغ سیاح کی حیثیت سے بستی بستی گھوم رہا تھا۔ میرے نزدیک تبلیغ ہی ذریعہ نجات تھی۔ اس دوران میں..... ملاقات اس نوجوان سے ہوئی۔ یہ بھی میرے ساتھ گھومتا رہا۔ اس کا مقصد امن کا پیغام دینا تھا۔ ہم لوگوں کو سمجھاتے رہے لیکن کسی نے کان لگا کر ہماری بات نہیں سنی۔ شہروں میں جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دھڑا دھڑ اسلحہ بن رہا تھا۔ ایک جگہ ہمیں تلواروں سے مسلح چھ سواروں نے گھیر لیا۔ میں خوفزدہ تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا لیکن اس نوجوان نے عجیب انداز میں لڑ کر ان شمشیر زنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ وہ جس انداز میں لڑ رہا تھا، میرے لئے نیا اور حیرت انگیز تھا۔ اس وقت تک نوجوان کئی مرتبہ میری جان بچا چکا تھا اور میں دل میں عہد کر چکا تھا کہ اس کے احسان کا بدلہ کسی نہ کسی روز ضرور چکا دوں گا۔ اب یہ نوجوان مر چکا ہے لیکن آنے والی کل بتائے گی کہ میں اس عہد کو کس طرح نبھاؤں گا۔ کئی کہانیاں ختم ہو جائیں گی اور کئی کا آغاز ہوگا۔"

کنگ نے فادر ہانسل کی طرف دیکھا اور پھر مور کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ اس کی نگاہ تصویر کی طرف لوٹ آئی اور وہ تعظیم سے جھک گیا۔ لن فونگ کبھی ایسا بھی تھا یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا، اپنے محترم استاد کی یاد نے آنکھوں میں نمی پیدا کردی تھی۔

ایک سو پچاس میل دور بلیک پیرٹ شراب خانے میں میکس شیلے اطمینان سے بیٹھا ان لذت آمیز گھڑیوں کو یاد کر رہا تھا جو کہ اس سے کیری کے نوجوان جسم کو بھنبھوڑتے ہوئے گزری تھیں۔ آج وہ بہت عرصے بعد خود بھی چرس پی رہا تھا۔ اس نے کاکنان سے دس فیصد پہ سودا طے کیا تھا لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل کر چکا تھا۔ لڑکی بھی اس کے قبضے میں تھی۔ عبداللہ کے بارے میں اسے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ کنگ اور

مور کو دیکھ چکا تھا کہ وہ اسے ٹھکانے لگا سکتے تھے اور اس طرح وہ عبداللہ کے سر الزام ڈال کر کا کنان کو بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

وہ جتنے خوش گوار موڈ میں تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کیری کا جوان جسم اسے کچھ زیادہ ہی پسند آیا تھا۔ چرس کے کش لگاتے ہوئے وہ اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دلہن بنی لیکن شوہر کی بجائے اس کی آغوش میں آ گری۔ وہ دل ہی دل میں کا کنان کا شکر گزار تھا کہ اس نے ایسے لذت آمیز موقع سے استفادے کی مہلت دی۔ لڑکی کو ریڈ سرکل کے ''شیطانوں کی جنت'' نامی مقام پر پہنچا کر اس کا فرض ختم ہو جاتا، لیکن اس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر دوسرا ہی کھیل شروع کر دیا۔

اچانک دروازہ کھلا، اس کی نگاہ بیلانو پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر کیری کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن اس آدمی کو دیکھ کر اس نے پروگرام کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ بیلانو اس کا پرانا واقف کار تھا۔ ان کے درمیان میں کچھ کاروباری معاہدے بھی ہوئے تھے۔ دراصل وہ کرائے کا قاتل تھا اور شیلے اسے کئی بار استعمال کر چکا تھا۔ اب کے وہ بہت دنوں بعد آیا تھا۔ اس لئے شیلے سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ چند منٹ باتیں کرنے کے بعد ہی عشرت کدے کی طرف جائے گا۔

''آؤ بیلانو! اس مرتبہ تو تم نے بہت دنوں بعد صورت دکھائی۔'' اس نے بے تکلفی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

بیلانو نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور خاموش بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں شیلے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ شیلے الجھن میں پڑ گیا۔ بیلانو کی شخصیت شروع ہی سے پراسرار رہی تھی۔ وہ ہر بار کسی نہ کسی عجیب ہی رنگ میں سامنے آتا تھا۔ شیلے نے اس کے چہرے پر سختی دیکھی تو مسکرانے لگا۔ مسکرانے کا انداز خوشامد سے بھرپور تھا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے بیلانو! کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آ رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''ہاں....'' بیلانو نے جواب دیا۔ ''تمہارے پاس ایک ایسی چیز ہے جو تمہاری ملکیت نہیں ہے۔''

''ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟'' شیلے نے حیرت سے کہا۔

''ایک عورت!''

''کس سے تمہیں غلط اطلاع مل گئی۔''

''کیا ایک لاکھ کے بارے میں بھی میری اطلاع غلط ہے؟''

''خیر...... شیلے خود کو سنبھالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ''تمہیں ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''میری خدمات کسی دوسرے نے خریدی ہیں اور اس کا نام عبداللہ ہے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' شیلے اب نمایاں طور پر خوفزدہ نظر آنے لگا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''ایک لاکھ فرانک۔''

''ٹھیک ہے'' شیلے نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی لاتا ہوں، رقم تجوری میں محفوظ ہے۔''

''فی الحال بیٹھے رہو۔'' بیلانو نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور جیسے ہی شیلے کرسی پر بیٹھا اسے اپنے جیکٹ سے گزر کر پیٹ میں چبھنے والی خنجر کی نوک کا بہت ہی معمولی سا احساس ہوا۔ یہ بیلانو کا وہ ماہرانہ وار تھا جس سے آس پاس بیٹھے ہوئے چرسیوں اور شیلے کے آدمیوں کو علم بھی نہیں ہوا کہ شیلے کی جان جسم کو چھوڑ کر پرواز کر گئی ہے۔

شیلے منہ کے بل میز پر جھک گیا۔ چند لمحوں تک بیلانو اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھا اور عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ نشے میں دھت کسی آدمی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

کمرے میں دو محافظ کیری کے نیم برہنہ جسم پر بادام کے تیل سے مالش کر رہے تھے۔ ان کے اپنے جذبات مشتعل تھے لیکن وہ ان جذبات کی تسکین کر کے شیلے کے عتاب کو دعوت دے نہیں سکتے تھے۔ وہ جانتے

تھے کہ شیلے کسی بھی لمحے اس عورت کے لئے واپس آئے گا۔ دروازہ کھلا تو انہوں نے یہی سمجھا کہ شیلے ایک بار پھر اس عورت سے کھیلنے کے لئے آ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ بیلانو کے خنجر نے بڑی خاموشی سے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔

ان سے نمٹ کر بیلانو نے ایک نظر کیری کی طرف دیکھا۔ ہیجان خیز جسم دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے اس کی سرخ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تجوری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے تجوری کھولی اور رقم نکال کر اپنے لبادے میں ٹھونس لی۔ بستر سے ایک کمبل اٹھایا، بے ہوش برہنہ کیری کو اس میں لپیٹا اور عقبی دروازے سے باہر نکل آیا اور چپ چاپ اندھیروں میں غائب ہو گیا۔

صبح: اداس تھی۔ کنگ سب سے پہلے سو کر اٹھ گیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اسے ژدایا کے ایک نوجوان یوسف سے متعارف کرایا گیا۔ یہ نوجوان گھڑ سواری میں کمال رکھتا تھا۔ وہ اسے لے کر ایک میدانی جگہ پہنچا اور تین گھنٹوں تک کنگ کو گھڑ سواری کی مشق کراتا رہا۔ کنگ کو احساس ہوا کہ گھڑ سواری بھی کنگ فو کی طرح ایک باقاعدہ فن ہے۔ وہ خوش تھا کہ یوسف جیسے باکمال نوجوان سے اسے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد دوبارہ مشق کے لئے نکل گئے اور یوسف کو اس شاگرد نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ دنیا کا کوئی آدمی چند گھنٹوں میں گھڑ سواری کے کٹھن مراحل سے گزر سکتا ہے۔

سورج مغرب میں جھکتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔

یوسف کے چہرے پر جوش و خروش کے گہرے تاثرات تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ بلند کر کے استقلال کا نعرہ لگایا۔ ایک عجیب آواز اس کے حلق سے نکلی اور اس آواز کو سنتے ہی مور، فادر ہانسل اور

دس......!

درویش جنگل میں سفر کر رہے تھے کہ راستہ بھول گئے۔ سفر کٹھن تھا اس لئے کچھ دیر ستانے کے لئے بیٹھے تو پیاس نے ستایا۔ صورتحال یہ تھی کہ ان کے پاس صرف ایک قدح پانی تھا اور دس کے دس پیاسے تھے۔ چنانچہ جب ایک کو قدح آب دیا جاتا تو وہ بغیر ایک گھونٹ لئے دوسرے کی طرف بڑھتا دیتا، اس طرح پیالہ مخالف ہاتھوں میں گھومتا رہا اور پانی کسی نے نہ پیا نتیجہ یہ نکلا کہ شدت پیاس سے نو درویش ہلاک ہو گئے جو درویش بچ گئے تھے انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے نو رفیق خالق حقیقی سے جا ملے ہی تو وہ قدح پی لیا اور راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔ گھومتے گھومتے ایک شہر میں پہنچے جہاں ایک شناسا ملے تو پورا واقعہ سنا دیا شناسا نے کہا۔ اگر وہ پانی تو بھی نہ پیتا تو بہتر تھا۔

انہوں نے کہا عقلمند کیا تجھے نہیں معلوم کہ نو آدمیوں کے مر جانے کے بعد بھی میں اگر وہ پیالہ نہ پیتا تو خودکشی کا مجرم بنتا۔

وہ کہنے لگا۔ آپ کے خیال میں وہ نو آدمی بھی خودکشی کے مجرم ہوئے؟ انہوں نے کہا نہیں اس لئے کہ وہ ایثار کر رہے تھے۔ اپنی حاجت کے مقابلے میں دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے یہاں تک کہ ایثار کرتے کرتے ہلاک ہو گئے۔ پھر جب میں تنہا رہ گیا تو کس کے لئے ایثار کرتا؟ اس لئے ایسے موقع پر مجھے وہ پانی پینا واجب تھا۔

کشف المحجوب

(مرتب: ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مور کے دونوں بیٹے مکان سے باہر نکل آئے۔

چند لمحوں بعد یہ چھ سوار تیزی سے اس طرف بڑھ رہے تھے جدھر سے گھڑ سواروں کا دستہ آندھی اور طوفان کی طرح آرہا تھا۔ فاصلہ کم ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ ان کے گھوڑے آنے والے تیز رفتار گھوڑوں سے ٹکرا گئے۔ ان سواروں کی تعداد سو سے کم نہیں تھی لیکن ابتدا میں ہی چھ سواروں کو ان میں گھسنے کا موقع مل گیا تھا اس لئے انہوں نے پہلے ہی ہاتھ میں کئی آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

کنگ کے قریب آنے والا ہر گھڑ سوار خون اور دانت تھوکتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں تلوار تھی جس سے وہ اپنی حفاظت کر رہا تھا۔ یوسف کا نیزہ تڑپ تڑپ کر عبداللہ کو چھید رہا تھا۔ بوڑھا فادر بیک وقت تین شمشیر زنوں سے نمٹ رہا تھا۔ عبدل اور ابراہیم شراروں کی طرح ادھر سے ادھر رقص کر رہے تھے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتے چیخیں اور کراہیں اپنے پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔

مور کی نگاہیں بے چینی سے عبداللہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اسے نظر آ گیا لیکن ان کے درمیان میں بہت فاصلہ تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس طرف بڑھنے کے لئے عبداللہ کے آدمیوں سے بھڑ گیا۔ کنگ نے ایک گھڑ سوار کو تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ ابھی وہ ایک آدمی سے نمٹا ہی تھا کہ اس کی نگاہ یوسف پر پڑی۔ ایک آدمی کا خنجر پشت سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے پھرتی سے گھوڑا موڑا اور بائیں پاؤں کے عضلات کو سخت کر لیا۔ ایلیفنٹ کک اس سوار کے گھوڑے کے پیٹ پر پڑی اور وہ ڈھول کی طرح پھٹ گیا۔ سوار گرا اور درجنوں گھوڑے اسے کچلتے ہوئے نکل گئے۔ نیزہ کنگ پر پھینکا جا چکا تھا۔ اس نے تڑپ کر تلوار گھمائی اور نیزے کے ساتھ ساتھ اس کی تلوار بھی گر گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ گھوڑے ٹکرا گئے اور اس کی کھڑی ہتھیلی نے نتھنے گھڑ سوار کی کھوپڑی کو دو نیم کر دیا۔

فادر ہانسل نے تین تلواروں کو اپنی تلوار پر روکا اور ایک گھوڑے کی انگ پر ایلیفنٹ کک ماری۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی تلوار ہٹی تو فادر ہانسل نے پیٹی سے خنجر کھینچ مارا جو دوسرے سوار کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ تیسرے سوار کی تلوار اس کے لبادے کی ایک دھجی اچک لے گئی۔ اسی لمحے عبدل کی تلوار اس سوار کی گردن کو کچی مولی کی طرح کاٹتی ہوئی نکل گئی۔

مور نے عبداللہ کے قریب پہنچنے کے لئے بہت جتن کیا لیکن فاصلہ کم نہ ہوا۔

کنگ نے پھرتی سے گھوڑا ہٹایا۔ دونوں طرف سے لپکتے ہوئے نیزہ بردار ایک دوسرے کو چھیدتے ہوئے نکل گئے۔ دو کربناک چیخیں فضا میں ابھریں اور چیخوں میں دب گئیں جوان کے گرتے ہی بلند ہوئی تھیں۔ کنگ کی دونوں ٹانگیں اور دونوں ہاتھ چل رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں یوسف کا شکر گزار تھا کہ اس نازک موقع کے لئے اس نے قبل از وقت اسے گھڑ سواری کے چند اہم اصول سکھا دیئے تھے۔

ابراہیم کے گرد چار گھڑ سوار تھے۔ اس کی ایک کلائی زخمی ہو گئی تھی اور بائیں رخسار سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ کنگ نے گھوڑا اسی سمت موڑ لیا۔ اس نے فنگر ڈریگن استعمال کیا۔ ایک کی آنکھیں حلقوں سے نکل گئیں۔ دوسرے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی اور تیسرے نے دانت اور جبڑے کی ہڈی تھوکنے کی کوشش کی لیکن سانس جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ زمین پر گر گیا۔

اچانک اس کی نگاہ عبداللہ پر پڑی۔ اس نے گھوڑے کو موڑا تو ایک نیزہ اس کی دائیں ران کے قریب گھوڑے کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ کنگ بروقت اچھل کر اس سوار پر جا پڑا تھا ورنہ وہ گر پڑتا۔ سوار فضا میں اچھلا اور جب وہ دوبارہ نیچے آیا تو کئی نیزوں اور تلواروں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اسے چیخنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اس دوران میں عبداللہ کنگ کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر بھیڑ میں کھو گیا تھا۔

مور اور کنگ کے گھوڑے ٹکرا گئے۔ دونوں زمین پر گرے اور گھوڑوں کو سنبھالنے کے بجائے انہوں نے زمین پر کھڑے کھڑے ہی دفاعی جنگ شروع

کر دی۔ بیک وقت چھ گھوڑے ان کی طرف لپکے۔ دونوں اچھلے۔ بیک ہینڈ نائف سلیش استعمال ہوئے اور دو گھوڑوں کی کھوپڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ ان کی اگلی ٹانگیں گھومیں اور دائرے میں آگے بڑھنے والے چاروں گھوڑوں کے ٹخنے ٹوٹ گئے۔ سوار چیختے ہوئے نیچے گرے اور دوسری سمت سے آنے والے گھڑ سوار منہ زور گھوڑوں پر بروقت قابو نہ پا سکے۔

کنگ بے چینی سے کانان کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اس دستے میں صرف عبداللہ ہی موجود تھا۔ عبداللہ مور اور کنگ دونوں کی دسترس سے باہر رہا حتیٰ کہ اسے بچے کھچے گھڑ سواروں کے ساتھ بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ فتح کا نعرہ یوسف کے حلق سے بلند ہوا اور بھگوڑے سواروں کی رفتار کچھ تیز ہو گئی۔

وہ افق پر منڈلاتے منڈلاتے شکست خوردہ سواروں کے سائے دیکھتے رہے اور پھر اچانک فضا چیخوں اور نعروں سے کانپ گئی۔ ژوایا میں موجود استقلال کے حامی پہنچ گئے تھے۔ لیکن بھگوڑے ان کی پہنچ سے بھی باہر تھے۔ اس معرکے میں فادر ہانسل خاصا زخمی ہوا تھا لیکن اس کے چہرے سے زیادہ کمزوری ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

''تم بہت اچھی طرح لڑے.....'' یوسف نے کہا۔

''ہاں! تم جیسے استاد سے کچھ سیکھ کر ایسی ہی اچھی جنگ کا مظاہرہ کیا جا سکتا تھا۔'' کنگ نے مسکرا کر کہا تھا اور مور کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میرا خیال ہے کانان دستے میں نہیں تھا۔''

''تمہارا خیال درست ہے البتہ عبداللہ دستے میں تھا لیکن میں کوشش کے باوجود اس کے قریب نہیں پہنچ سکا۔'' اس نے زخمی ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ژوایا سے آنے والے استقلال کے دستے کے سردار کی طرف متوجہ ہوا۔ ''زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد ہمیں فی الفور آگے بڑھنا ہے۔''

ان کے گھوڑے آہستہ آہستہ ژوایا گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ جو چٹانوں کی دوسری جانب شہر خموشاں کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور فضا ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہنہنانے کی آوازوں سے کانپ رہی تھی۔ افق پر اب گہری سیاہی تھی۔ بھگوڑے گھڑ سواروں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔

ژوایا میں انہوں نے صرف دو گھنٹے گزارے۔ مرہم پٹی کے بعد وہ واپس اسی جگہ آ گئے جہاں جنگ ہوئی تھی۔ مور اور کنگ اس سمت دیکھ رہے تھے جدھر عبداللہ اور اس کے ساتھی فرار ہوئے تھے۔ فادر ہانسل، عبدل اور دوسرے دونوں جوان خاموش کھڑے تھے۔ کنگ نے فادر ہانسل کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''شیطان کی جنت؟''

''میرا خیال ہے ہمیں اس جگہ کو دن کے اجالے میں تلاش کرنا چاہئے۔'' فادر نے کہا۔

''نہیں فادر!'' مور نے سنجیدگی سے مداخلت کی۔ ''اس کام میں جتنی دیر ہو گی اتنی ہی دشواریاں بڑھتی جائیں گی۔''

''ہمیں اسی طرف آگے بڑھتے جانا چاہئے حتیٰ کہ.....''

وہ خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ پھر چٹانوں تک پہنچنے کے بعد رک گئے، فادر ہانسل کے خیال کے مطابق شیطانوں کی جنت کا آغاز وہیں کسی جگہ سے ہوتا تھا۔ گہری تاریکی تھی اور انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں انہیں چوٹی پر تھوڑی سی روشنی نظر آئی۔ غالباً وہی ان کی منزل مقصود تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کو وہیں چھوڑ دیا اور چوٹی کی طرف چڑھنے لگے۔

کچھ آگے جانے کے بعد راستہ ختم ہو گیا۔ اب ان کے سامنے ایک عمودی، بلندی چٹان تھی۔ اس بلندی پر چڑھنے کے لئے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے کمند پھینکی۔ مور اور کنگ اوپر چڑھنے لگے لیکن بیس فٹ اوپر جانے کے بعد معاً انہیں خطرے کا احساس ہوا۔ کنگ نے بمشکل توازن برقرار رکھا اور چھپکلی کی طرح

www.pdfbooksfree.pk

پٹ سے اپنے ساتھیوں کے قریب گرا۔ فوراً ہی مور بھی اس کے پہلو میں آ گرا تھا۔ ان کی کمندوں کو اوپر سے کاٹ دیا گیا تھا۔

دفعتاً اوپر سے کسی کی ٹارچ روشن ہوئی۔ مور نے فائر پھینک مارا۔ ایک کراہ سنائی دی۔ اسی لمحے پانچ ٹارچیں روشن ہوئیں اور کنگ کی رائفل سے دو مزید آدمی کام آئے۔ مور نے بھی نشانہ لگایا تھا لیکن چوٹی پر موجود آدمیوں کو فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ روشنی بجھا کر پیچھے ہٹ گئے اور ٹارچیں بجھتے ہی اوپر سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔

''تم لوگ انہیں الجھاؤ۔'' مور نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور کنگ کے ساتھ عمودی چٹان کے عقبی حصے کی طرف رینگ گیا۔ نیچے سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ پہاڑیاں فائرنگ سے گونج رہی تھیں اور گولیاں آندھی کی طرح سنناتی ہوئی ادھر ادھر سے گزر رہی تھیں۔ کنگ اور مور نے عقبی حصے سے کمندیں پھینک کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

چٹان کے اوپر چار آدمی تھے۔ ان کی فائرنگ سے بھی یہی اندازہ ہوا تھا اور اب تو وہ ان کے بالکل سامنے تھے۔ کنگ اور مور نے بیک وقت چھلانگیں لگائیں۔ ایک کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ پڑا۔ وہ چیخا، فضا میں بلند ہوا اور پھر چوٹی سے نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ دو آدمیوں کی کھوپڑیاں پوری قوت سے ٹکرائی تھیں اور تیسرا فرار ہونے کی کوشش میں ہڈیوں اور گوشت کا خون آلود ڈھیر بن کے رہ گیا تھا۔

مور نے نیچے اشارہ دیا ساتھی جلدی اوپر پہنچ گئے۔

چٹان کے اس حصے میں ایک پتھر کا دروازہ تھا۔ انہوں نے اسے کھولا تو سامنے طویل سرنگ تھی۔ اس سرنگ میں مشعلیں روشن تھیں۔ غار سے باہر نکلے تو انہیں ایک پوری بستی نظر آئی جو چاروں طرف سے فلک بوس پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔

مدھم چاندنی میں انہیں کئی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ بستی کے درمیان سے ایک چھوٹی سی ندی گزر رہی تھی۔ اس کے کنارے درختوں کے نیچے کھلے دروازوں کے جھونپڑوں میں ہر طرف رنگینی کا عجیب سا بازار لگا ہوا تھا۔ مرد عورتوں کو بھنبھوڑ رہے تھے، کراہیں اور لذت آمیز سسکاریاں سنائی دے رہی تھیں۔ کنگ نے آنکھیں ملیں۔ اس نے اتنے وسیع پیمانے پر بے حیائی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ پھر اچانک انہیں سات محافظ نظر آئے جو انہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے یہ نئے پہرے دار ہیں جو پچھلے پہرے داروں کی جگہ لینے جا رہے ہیں۔'' فادر ہانسل نے کہا۔

''ہاں..... اور میرا مشورہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص خاموش رہے۔'' یوسف بولا۔

وہ پہرے داروں کے قریب پہنچے۔ ایک پہرے دار نے بربر زبان میں کچھ کہا جس کا جواب یوسف نے دیا۔ وہ اور قریب پہنچ گئے۔ تب ان نئے پہرے داروں کو احساس ہوا کہ ان کے سامنے کھڑے ہوئے آدمی ان کے ساتھی نہیں ہیں لیکن اب ان کا سمجھنا بیکار تھا۔ مور اور کنگ نے دو کی گردنیں توڑ دی تھیں اور عبدل نے ایک کا گلا دبا کر اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا۔ فادر ہانسل، یوسف اور ابراہیم نے تین آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

لاشوں کو ایک طرف جھاڑیوں میں ڈال کر انہوں نے پہرے داروں کے کپڑے پہن لئے اور بندوقیں اٹھائے آگے بڑھنے لگے۔

دفعتاً پانچ نیم برہنہ لڑکیاں ان کے سامنے نہ جانے کہاں سے پہنچ گئیں اور ان میں سے ایک نے کنگ سے لپٹنے کی کوشش کی لیکن اس نے اسے دور دھکیل دیا۔

''ہمیں کچھ اور بھی کام کرنے ہیں!'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہاں، کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا.....'' لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

کنگ نفرت سے منہ موڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے لڑکی کی بائیں ران کے اندرونی رخ ایک سرخ دائرہ دیکھ لیا تھا۔ یہ شان ریڈ سرکل کی ان مخصوص لڑکیوں کا تھا جنہیں گناہ کے لئے خاص طور سے تربیت دی جاتی تھی۔

کنگ حیران تھا کہ کاکنان کا شیطانوں کی جنت سے کیا تعلق ہے۔ وہ عیاش نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وہ عورتوں کی طرف راغب ہو گیا تو پھر اس کی جسمانی قوت مشکوک ہو سکتی تھی لیکن یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں تھی کیونکہ کنگ فو کے کسی ماسٹر کے لئے جسمانی قوت کے علاوہ دنیا کی کسی چیز میں کوئی دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ آگے بڑھے تو انہیں ایک محل نظر آیا۔

چٹانی پتھروں کو کاٹ کر محل بنایا گیا تھا۔ کنگ نے اب تک جتنے بھی محل دیکھے تھے ان میں یہ سب سے مضبوط محل تھا۔ وہ اس محل کی طرف بڑھنے لگے۔ کنگ سوچ رہا تھا کہ کیا کاکنان اس محل میں موجود ہو گا۔ محل کے چاروں طرف گہری خندق تھی اور اس میں گاڑھے سیال جیسا پانی تھا۔ خندق پر ایک پل تھا جو پھاٹک تک بنا ہوا تھا۔ دروازے یا پل پر کوئی محافظ نہیں تھا۔

وہ دروازے سے اندر داخل ہوئے تو کنگ کے ذہن میں بلیک پیرٹ شراب خانہ بھول گیا۔ اسے محل میں اس قدر آسانی سے داخلے پر حیرت تھی۔ محل میں چرس کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ دروازے سے اندر جاتے ہی ایک برہنہ لڑکی ان کے سامنے آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس پر کانچ کا ایک خوب صورت حقہ تھا۔ حقے کی نے سے دھواں نکل رہا تھا۔ لڑکی نے ٹرے والے ہاتھ آگے بڑھائے۔ ''آپ کو کتنی لڑکیوں کی ضرورت ہے؟''

یوسف جلدی سے آگے بڑھا۔ کنگ نے حقے کی نے اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ایک کش لگایا اور بربر زبان میں لڑکی سے بولا۔ ''ہم عظیم کاکنان سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔''

لڑکی کی نشے سے بوجھل آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کاکنان مصروف ہے اور اسے نہیں بلایا جا سکتا۔ اس کے پاس ایک نئی سفید فام لڑکی ہے اور وہ اسے چھوڑ کر جلدی باہر نہیں آ سکے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم انتظار کریں گے۔'' یوسف نے جواب دیا۔ ''اور انتظار کی کوفت دور کرنے کے لئے.....'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کنگ کمرے میں موجود آدمیوں کو دیکھنے لگا۔ ہر طرف چٹائیوں اور قالینوں پر برہنہ اور نیم برہنہ مرد اور عورتیں اخلاق و آداب کو بالائے طاق رکھ کر چرس کے نشے میں ڈوبے پڑے تھے۔ کنگ نے جھرجھری لی اور ان چار سرخ لبادے والوں کی طرف نظریں گھما لیں جو ایک طرف بیٹھے ایک جوڑے کی خرمستیاں دیکھ رہے تھے چونکہ وہ خود اس محفل نشاط میں شامل نہیں تھے اس لئے کنگ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کنگ فو کے ماسٹر ہیں۔

لڑکی جلدی واپس آئی۔ اس کے ساتھ چھ لڑکیاں اور تھیں جن کے چہرے جذبات سے عاری تھے۔ ان کے برہنہ جسم زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ نگاہیں جھکائے کھڑی تھیں۔ لڑکی انہیں کنگ اور ان کے ساتھیوں کے حوالے کر کے چلی گئی اور وہ لڑکیوں کے ساتھ ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گئے لڑکیوں نے محسوس کیا کہ ان میں سے کوئی بھی گناہ کی طرف راغب نہیں ہے تو آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھی رہیں۔ ان کے چہروں پر مایوسی، خوشی یا حیرت کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ کنگ اور اس کے ساتھیوں کو بے چینی سے کاکنان کے باہر آنے کا انتظار تھا البتہ یوسف حیرت سے آنکھیں پھاڑے چھ میں سے ایک لڑکی کو مسلسل گھور رہا تھا۔

کاکنان چرس کے دم لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے کیری کو گھور رہا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے وہ مراکش ایکسپریس سے اٹھا لایا تھا۔ پھر وہ پانچ لاکھ فرانک کے لئے بلیک پیرٹ کے مالک شیلے کے حوالے کر دی گئی تھی لیکن شیلے کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے صرف ایک لاکھ فائرنگ اور کیری

www.paksociety.com

پر قناعت کرلی تھی۔ حالانکہ لڑکی دکھا کر اور رقم حاصل کر کے اسے دونوں کو عبداللہ تک پہنچا دینا تھا تاکہ رقم اور لڑکی کو شیطانوں کی جنت میں کانکان کو پہنچا دیا جاتا۔

کیری اس وقت بھی برہنہ تھی اور شیلے کے قاتل ایلبانو اسے بری طرح کچل رہا تھا۔ اس شیطانی کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کانکان سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی قوت بحال رکھنے کے لئے کتنی بڑی قربانی دینا پڑتی ہے۔ وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کیری کو گھورنے لگا جس نے چند منٹ تک جدوجہد کی تھی اور پھر اس کا پورا جسم ایلبانو کے رحم و کرم پر تھا۔

اچانک اسے عبداللہ کے پے در پے شکستوں کا خیال آ گیا۔ اس نے دونوں برہنہ جسموں سے منہ موڑ لیا۔ آنکھوں کی سرخی خون آلود محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم غم و غصے سے تن گیا۔ اس کے جسم کے ایک حصے سے توانائی پھوٹ رہی تھی۔ اس قدر ناکام آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ اندر داخل ہوا۔

وہ تعظیماً جھکا۔ ترک مقرر نے کانکان کی طرف دیکھا جو بغور اسی طرف دیکھ رہا تھا جہاں وہ جھکا کھڑا تھا۔ خود عبداللہ کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات تھے۔ وہ کوئی بڑی رقم وصول کرنے کے لئے اسی طرح ناراضگی کا اظہار کرتا تھا اور کسی بھی مشن سے واپسی پر اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔

"عظیم عبادت خانے میں چند آدمی تم سے ملاقات کے لئے آئے ہیں کانکان!" اس نے کہا۔

"ان سے کہو کہ فی الحال اصطبل میں لیٹ کر سو جائیں۔" کانکان غرایا۔

عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے چرس کا وزنی حقہ فرش سے فضا میں بلند ہوا اور پھر اڑتا ہوا عبداللہ کی طرف آیا حقے کا نچلا حصہ دھات کا بنا ہوا تھا، وہ پوری قوت سے عبداللہ کے سینے سے ٹکرایا اور اس کا سینہ یوں کھل گیا جیسے کاغذ کا بنا ہوا تھا وہ ابھی دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ الٹ کر گرا اور کروٹ بدل کر اٹھنے لگا لیکن لڑھکتا ہوا زینے پر پہنچ گیا۔ اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش درجنوں سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی اس بڑے ہال میں آ گری جہاں چرس کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور ہر طرف برہنہ جوڑے بکھرے ہوئے تھے۔

یوسف اس وقت بھی برہنہ لڑکی کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پیدا ہو گئی تھی اور ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا لیکن فادر ہانسل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "نہیں بیٹے....." یوسف کی سرگوشی سانپ کی پھنکار جیسی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔ خاموش ہو، تم جذبات میں آ کر کھیل بگاڑ دو گے۔" فادر ہانسل اسے سمجھانے لگا۔

کنگ کے کانوں میں بھی ان کی باتوں کی بھنک پڑ گئی تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف بغور دیکھا۔ وہ ایک خوبرو لڑکی تھی۔ لیکن اب تک اس نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر یوسف کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ کنگ جانتا تھا کہ یہ یوسف کی منگیتر اور چچازاد بہن غزالہ ہے جسے کانکان کے گرگے بستی پر حملہ کر کے اٹھائے لائے تھے اور یوسف اس کی تلاش میں ایک عرصے سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

اچانک وہ چونک پڑے۔ عبداللہ کی خون میں نہائی ہوئی لاش زینے سے لڑھک کر فرش پر آ گری تھی۔

وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے لیکن ان سے پہلے ہی ایک آدمی برہنہ حالت میں لاش کے قریب پہنچا۔ اس نے جھک کر لاش کو دیکھا اور چھت کی طرف منہ کر کے ایک کریہہ چیخ حلق سے نکالی۔ "یہ عبداللہ ہے..... ہمارا استاد اور سردار..... اسے قتل کیا گیا ہے۔" پھر اس کا لہجہ بدل گیا۔ "کانکان اور اس کے ساتھیوں کے لئے موت کا پیغام بن جاؤ..... دوستو اٹھو..... اب ہمارے لئے ہر عیش حرام ہے..... ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔"

اس کی چیخوں سے ہال میں کہرام برپا ہو گیا۔ عبداللہ کے ان گنت شکست خوردہ ساتھی وہاں داد عیش دے رہے تھے لیکن اب ان میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ نشے نے ان کا حلیہ خراب کر رکھا تھا۔ ان کی حالت اندھوں جیسی تھی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے عبداللہ کی لاش

کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کنگ اور اس کے ساتھیوں نے تاریک گوشے سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مور کا اشارہ پا کر رک گئے۔ انہیں وہ چار سرخ لبادوں والے زینے کے سامنے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ جنہیں وہ چرس پیتے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے چیخ و پکار کرنے والے عبداللہ کے ساتھیوں کو روک رکھا تھا۔ اچانک ان کی طرف لپکے اور پھر ایک ہولناک جنگ کا آغاز ہو گیا۔

بڑے ہال میں چیخوں، کراہوں اور دردناک آوازوں کا شور بلند ہوا۔ خون کے چھینٹے برسنے لگے اور ہڈیاں بکھرنے لگیں۔ ریڈ سرکل کے چاروں کنگ فیوماسٹر ان کے لئے ضرورت سے زیادہ تھے۔ ان کے نزدیک جانے والا ہر آدمی ہڈیوں اور گوشت کا خون آلود ڈھیر بن رہا تھا۔ کنگ کے بازوؤں کی مچھلیاں کانپ رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کمرے میں انسانی جسموں کا قیمہ بنانے کی چار مشینیں لگی ہوئی ہوں۔

غلام لڑکیاں سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض اس ہجوم میں پس کر رہ گئی تھیں۔ مور اور فادر ہانسل اگر نہ روکتے تو شاید ان کے ساتھی بھی اس خونریز جنگ میں اندھا دھند کود چکے ہوتے۔ کنگ جانتا تھا کہ عبداللہ کو ہلاک کرنے والا کانکان ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوئی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عبداللہ کو جس انداز میں قتل کیا گیا تھا وہ بھی اس بات کو ظاہر کر رہا تھا کہ ماسٹر ہاتھ کے علاوہ یہ کسی اور ہاتھ کا کمال نہیں ہو سکتا۔

دیواروں سے لگی ہوئی برہنہ لڑکیاں چیخ رہی تھیں۔ مرنے والوں کی آخری چیخیں، للکارنے والوں کی دھاڑ اور ہڈیاں چٹخنے کی آوازوں سے در و دیوار کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب بڑے ہال میں لاشیں ہی لاشیں نظر آنے لگیں تو شکست خوردہ سپاہی بھاگنے لگے۔ ریڈ سرکل کے ماسٹروں نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ انہیں اوپر جانے سے روکنا چاہتے تھے اور اس مقصد میں انہیں کامیابی ہوئی تھی۔

وہ چاروں خاموشی سے زینے کی طرف بڑھے۔ ابھی انہوں نے سیڑھیاں طے کی تھیں کہ مور نے کنگ کو اشارہ کیا اور خود بھی ہال کے روشن حصے میں کود گیا۔ "رک جاؤ دوستو..... تمہیں نرم گوشت کاٹنے کا موقع مل چکا ہے۔" اس کی غراہٹ خوفناک تھی۔ "اب تمہیں اپنے برابر کے چند آدمیوں سے بھی نمٹ لینا چاہئے۔"

چاروں ماسٹر رک گئے انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سرخ لبادوں میں انہیں اپنے ہی آدمی نظر آئے۔

"کیا تم سب بغاوتوں پر آمادہ ہو۔" ایک نے کہا۔

"نہیں....." مور نے ہنس کر کہا۔ "بلکہ تمہیں بغاوت پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے اپنا سرخ لبادہ اتار کر پھینک دیا۔ نیچے سے نیلے لبادے کی جھلک دیکھتے ہی وہ چاروں بجلی کی سی تیزی سے نیچے آئے اور آہنی دیواروں کی طرف چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ انہوں نے ان گنت جسموں کو انہی کے خون میں نہلایا تھا لیکن خود ان کے جسم پر خون کا خفیف سا دھبہ بھی نہیں تھا۔ ان کے چہرے خراشوں سے پاک تھے۔

یوسف جوش و غصے سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ کنگ نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور بروقت اسے پیچھے کھینچ لیا ورنہ وہ بھی قیمہ بن چکا ہوتا۔

"نہیں....." کنگ نے نرمی سے کہا لیکن لہجہ تحکمانہ تھا۔ "تم جس انداز میں لڑنے کے ماہر ہو اس کا مظاہرہ کر چکے ہو۔ اب یہ ہمارا کام ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہئے۔ کیا میں امید رکھوں کہ تم ہمارے لئے کوئی دشواری نہیں پیدا کرو گے۔"

نوجوان یوسف کی انگلیاں سفید پڑ گئیں۔ اس کے جبڑے اور انگلیاں بری طرح بھنچ گئی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں پر آ گئے تھے۔ اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مور کے دونوں بیٹے اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں سامنے کھڑے ہوئے چار حریفوں میں سے اپنے مقابل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مور سیاہ فام تھا لیکن اس کے سیاہ

www.paksociety.com

چہرے سے خوشی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس نے اپنا حریف تلاش کرلیا تھا اور غالباً ریڈ سرکل کے اس ماسٹر نے بھی اس کی نگاہوں کے چیلنج کو پڑھ لیا تھا۔ وہ بے خوفی سے براہ راست مور ہی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

جنگ کا آغاز اچانک اور بڑی پھرتی کے ساتھ ہوا۔

سہمی ہوئی لڑکیوں کے منہ اور آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ دونوں ٹانگیں اور دونوں ہاتھ، چار ہتھیاروں کی طرف ایک دوسرے پر استعمال کرتے ہوئے وہ دائرے میں گھوم رہے تھے۔ کنگ کا ذہن اس مرحلے پر دو حصوں میں بٹ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس مرتبہ بھی کاکنان اس کی دسترس سے دور نہ ہوجائے۔ وہ ایک بار پہلے بھی اسے دھوکا دے کر نکلنے میں کامیاب ہوچکا تھا اور کنگ کو اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ایک عرصہ ہوا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں مور کا شکریہ ادا کیا جس نے انہیں روک کر ریڈ سرکل کے ماسٹروں کے لڑنے کا اندازہ دیکھنے کا موقع دیا تھا۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر کنگ سوچ رہا تھا کہ اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

وہ کوئی داؤ استعمال نہیں کررہا تھا۔ اس کے لڑنے کا انداز دفاعی تھا۔ حریف یہ سمجھا کہ وہ کمزور پڑ رہا ہے۔ بس اسی میں وہ مارا گیا۔ اس کی ٹانگ بار بار کنگ کے سر کے اوپر سے گھوم کر گزر رہی تھی۔ کنگ مسلسل پیچھے ہٹ رہا تھا اور پھر..... اس کی دائیں اور بائیں ہتھیلیاں سخت ہونے لگیں۔ وہ گھوما اور ٹانگ لہرانے کے بعد دونوں ہتھیلیاں تلواروں کی طرح گھمائیں۔ حریف دائیں ہتھیلی سے بچنے کے لئے بائیں طرف جھکا اور اسی وقت بائیں ہتھیلی اس کی گردن پر پڑی۔

وار اتنا کارگر تھا کہ اس کی گردن ٹوٹ کر کندھوں کے درمیان لٹک گئی۔ کنگ نے پھرتی سے اچھل کر اس وار کو بچایا جو مرتے مرتے بھی حریف نے کردیا تھا۔ اس کی گھومتی ہوئی ٹانگ کے سامنے اس نے پاؤں جمادیا۔ گھٹنا ٹوٹ گیا اور ٹانگ ٹوٹ کر نازک شاخ کی طرح فرش پر گرگئی۔

ابراہیم اور عبدل بجلی کی طرح ایک طرف سے دوسری طرف کود رہے تھے لیکن ابھی تک ان دونوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اسی لمحے مور کا داؤ چل گیا۔ اس کی دائیں انگلی خنجر کی طرح اپنے مقابل کے نرخرے میں گھس گئی تھی۔ چیخ بڑی دلدوز تھی لیکن جب وہ لاش سے ہٹا تو کنگ نے دیکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ میں انگلیوں کا خنجر حریف کے سینے کو چیرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

مرنے والے کی چیخ تھی یا کوئی شیطانی آواز! ہال کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھا۔ پسلیاں ٹوٹنے کی آواز کسی سوکھے درخت کی شاخیں ٹوٹنے جیسی آواز تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی موت پر ہراساں ہوگیا لیکن اسے زیادہ دیر تک حیرت اور خوف کا مظاہرہ کرنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ ابراہیم کا ہاتھ اس کی پیشانی کو دو حصوں میں پھاڑ چکا تھا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور تڑپے بغیر ہی ٹھنڈا ہوگیا۔

اچانک عجیب حادثہ ہوا۔ ایک خنجر بجلی کے کوندے کی طرح چمکا تھا۔ لیکن فادر ہانسل نے جس برق رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا کنگ اسے دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا اور اسے یہ سمجھنے میں تھوڑی سی دیر بھی لگ گئی کہ درحقیقت ہوا کیا تھا۔ فادر ہانسل فرش پر گرا تو اس کے سینے سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا تھا۔ خنجر نے کنگ کے بجائے اسے اپنا نشانہ بنالیا تھا۔

مرنے سے پہلے فادر ہانسل نے صرف یہی کہا۔

''میں نے تمہارا قرض ادا کردیا ہے..... تمہارا قرض ادا کر.....''

وہ ایک پراسرار جسم تھا جس کی موجودگی کنگ نے فوراً ہی محسوس کی۔

اس نے زینے سے اوپر نگاہ دوڑائی۔ وہ پراسرار وجود بالکونی میں کھڑا تھا۔ یہ سفید فام لیلبانو تھا۔ کنگ کے ساتھ ساتھ باقی ساتھیوں کی نگاہ بھی ادھر اٹھ گئی۔ انہیں متوجہ دیکھ کر لیلبانو مسکرایا۔ فوراً ہی کنگ کے دو ساتھی زینے کی طرف لپکے۔ مور اور کنگ ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک ایک جست میں تین تین سیڑھیاں طے

کیں مگر جب وہ بالکونی میں پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

ان کے سامنے ایک طویل راہداری تھی۔ وہ ایک کے بعد دوسرے دروازے پر پہنچے۔ تمام دروازے بند تھے۔ ڈریگن سے بار بار ہزاروں برزوں میں تقسیم ہوکر دروازے منتشر ہوتے چلے گئے لیکن کمرے خالی تھے۔ پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا کمرہ بھی خالی تھا۔ کنگ حیران تھا کہ کاکنان کہاں چلا گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ریڈ سرکل کی اس برہنہ لڑکی نے جھوٹ بولا ہو؟ جب وہ آخری دروازے پر پہنچے تو کنگ حیران تھا کہ آخر لیلبانو کس قسم کا حریف ہے؟ کیا وہ کنگ کو جانتا ہے؟ غالباً اس کے خیالات مور نے پڑھ لئے تھے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''محتاط رہو..... بہت عیار قاتل ہے۔ خنجر کے معاملے میں شاید اب تک اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔''

انہوں نے بیک وقت پاؤں اٹھائے۔ ڈریگن اسٹیپ نے آخری دروازے کو بھی ان گنت حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس کمرے میں انہیں عیار قاتل تو نہیں البتہ کیری ضرور مل گئی۔ کیری جو پانچ منٹ پہلے لیلبانو کے نیچے کچلی جارہی تھی۔ وہ بے ہوش تھی یا بے ہوش ہونے والی تھی، کنگ کاکنان اس کی دھڑکن سننے میں ناکام رہا۔

''کمینے کتے.....'' مور نے نفرت سے تھوک کر کہا۔ اس کا سیاہ ہاتھ بڑھا اور کیری کا دودھیا ہاتھ پکڑ کر اس نے بازو کو کنگ کی طرف گھمایا۔ ''اس کے سینے میں جو زخم ہے وہ ابھی ابھی بنایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ لڑکی دس منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''کیا یہ کاکنان کی حرکت ہے؟''

''ممکن ہے یہ لیلبانو کا کیا دھرا ہو۔'' مور نے کہا۔

کنگ نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف واپس مڑا۔ چند لمحوں کے بعد راہداری میں کھڑے اس بالکونی کو دیکھ رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے لیلبانو موجود تھا اب وہ خالی پڑی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ کنگ نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ اسے ایک سایہ نظر آیا۔ وہ تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

''میں اسے دیکھتا ہوں۔'' مور نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم کاکنان کو تلاش کرنا پسند کرو گے۔''

کنگ خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں ملگجے اندھیرے میں گھور رہی تھیں۔ مور کھڑکی سے اچھل کر زمین کی طرف گرنے لگا۔ وہ خندق کے اوپر سے گزرتا ہوا زمین پر جا گرا اور چند لمحوں بعد اس نے بھی ایک ہیولے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ کنگ چند لمحوں تک مور کے سائے کو دیکھتا رہا پھر اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سارا علاقہ خالی ہوگیا ہو یا پھر سب کے سب گہری نیند سو رہے تھے۔ کہیں ہلکی سی بھی حرکت نظر نہیں آرہی تھی۔ کنگ کو پوری بستی مردوں کا گاؤں محسوس ہورہی تھی۔

اچانک نیچے سے اسے ایک عجیب آواز سنائی دی۔ کنگ کی آنکھیں فوراً ہی سکڑ گئیں۔ اس نے خندق کی طرف دیکھا اور اس کے ذہن میں فوراً ہی خیال آیا۔

''خندق.....'' وہ زیر لب بولا۔ اس کے ذہن میں ماضی کا ایک منظر گھوم گیا جب تھائی لینڈ کے ایک دریا میں وہ تقریباً ڈوب ہی گیا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یقیناً کاکنان اس مرتبہ بھی اسی انداز میں لڑنا پسند کرے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاکنان خندق میں موجود ہے اور اس کا انتظار کررہا ہے۔

چند سیکنڈ بعد کنگ نے کھڑکی سے خندق میں چھلانگ لگائی اور اس کا طاقتور جسم پانی کی سطح سے ٹکرایا۔ پانی میں گرتے ہی اسے احساس ہوا کہ پانی عجیب گاڑھا اور لیس دار ہے۔ دلدل کی پتلی کیچڑ جیسا یہ پانی اس کے جسم سے چپک رہا تھا اور کنگ کو نیچے کھینچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید تکلیف ہونے لگی لیکن اس کی وجہ پانی کا نمک نہیں تھا۔ پانی میں کودنے کے بعد اسے ایک احساس یہ بھی ہوا کہ اس کا بہاؤ ایک خالی سمت میں ہے۔ وہ خاموشی سے اسی طرف تیرنے لگا لیکن گاڑھے پانی کی وجہ سے اسے تیرنے میں دشواری ہورہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے اور پیلے سے دھبے

www.paksociety.com

چکرانے لگے۔

کنگ کو اپنے پھیپھڑوں میں تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ بہاؤ ختم ہوتے ہی کاکنان سے آمنا سامنا ہو جائے گا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کاکنان نے ہی اس کے لئے منصوبہ بندی کی تھی۔ مور نے ایلبانو کا پیچھا کیا اور وہ تنہا رہ گیا۔ یہ بات کاکنان کے منصوبے کے مطابق تھی۔

اچانک اس نے اپنا جسم گرتا ہوا محسوس کیا۔ یہ ایک خالی جگہ تھی۔ دونوں طرف رنگین چٹانی پتھر تھے۔ اس نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پچاس فٹ کے فاصلے پر ایک جگہ سے چاند نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اسی طرف تیرنے لگا۔ کنگ کے ذہن پر غبار چھا رہا تھا۔ اسے وہ چمکیلا خلاء میلوں دور محسوس ہونے لگا۔

اس نے غصے سے سر کو جھٹکا دیا۔ ذہن پر چھانے والا غبار بڑھتا جا رہا تھا تب اسے احساس ہوا کہ خندق کے گاڑھے پانی میں کوئی نشہ آور چیز ملی ہوئی ہے۔ یہ اس پانی کا کمال تھا کہ اس کا جسم نشے کی حالت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ جب وہ اس چمکیلے خلاء کے قریب پہنچا تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں پہنچنے میں چند منٹ نہیں بلکہ کئی گھنٹے لگ چکے ہوں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ غنودگی اور سستی کی یہ حالت کاکنان کا سامنا ہونے سے پہلے ختم ہو جانی چاہئے۔ وہ اسے کوئی بھی ایسا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ جس سے کاکنان کو ایک بار پھر فرار ہونے کا موقع ملتا۔ صحرائے گوبی سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اب تک کئی بار اسے غچہ دے کر صاف نکل گیا تھا اور کنگ اس موقع پر اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جب وہ اس خلا کے پاس پہنچا اور سر باہر نکالا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جگہ اس مقام سے ایک فٹ کے فاصلے پر ہے۔ جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ وہ باہر نکلا اور چٹان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا جسم میٹھے میٹھے درد سے جکڑا ہوا تھا اور وہ اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے نشے میں دھت ہو۔

دفعتاً اس کی ٹانگیں بے جان ہونے لگیں اور وہ گر گیا۔ چٹان اس سے چند قدم دور تھی۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے وہ سیاہ پرندہ دیکھ لیا تھا جو اس سے چند فٹ دور زمین پر پڑا ہوا تھا۔ یہ کاکنان کی طرف سے ایک مخصوص اشارہ تھا۔ ایک ایسا اشارہ جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کا چیلنج قبول کر چکا ہے۔

یوسف نے بوڑھے فادر ہانسل کی لاش سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آنسوؤں کی نمی رخساروں پر بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ چند لمحوں تک اپنے ساتھیوں کو گھورتا رہا جو اس کے قریب خاموش کھڑے تھے۔ اس نے سر کو جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فادر ہانسل کی موت نے اس کے دل و دماغ میں عجیب تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ خود کو جیالا نوجوان نہیں بلکہ ایک ذمے دار آدمی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے زیر لب کہا۔ ''الوداع...... بوڑھے باپ...... الوداع...... تم نے ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے۔ خدا تمہیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آخری آنسوؤں کو بھی رخساروں پر بہہ جانے دیا۔

وہ اپنی چچازاد بہن غزالہ کی طرف بڑھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کی روح ابھی زندہ ہے۔ جس وقت درجنوں درندے اس کے جسم کو پامال کر رہے تھے اور اسے دشنام آمیز نگاہیں برداشت کرنا پڑی تھیں تو اس دوران میں غزالہ نے اپنی پاکیزہ روح کو ان سب سے پہلے ہی بچا لیا تھا۔

غزالہ آگے بڑھی۔ اس کی آنکھیں فادر ہانسل کی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے حرکت میں آتے ہی بڑے ہال میں موجود سارے برہنہ جسم حرکت میں آ گئے۔ لاشوں جیسے بدن اپنے باپ کی لاش پر آنسو بہانے لگے تو یوسف کا جی ایک بار پھر بھر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر لاش اٹھالی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازے کے قریب غزالہ رک گئی۔ اس نے ایک نظر یوسف کی طرف دیکھا۔ اس کے جذبات سے پرنم آنکھوں میں پہلی بار شرم و حیا کے تاثرات ابھرے۔

اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''یوسف!...... استقلال!''

یوسف کا حلق خشک ہو رہا تھا وہ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا۔

''ہمیں گھر لے چلو یوسف!'' غزالہ نے سرگوشی کی۔

وہ باہر چاندنی میں نکل آئے۔

جس وقت یہ قافلہ رواں دواں تھا تو نیم تاریکی میں چھپے ہوئے جسموں میں بھی حرکت پیدا ہوئی اور برہنہ لڑکیاں چاروں طرف سے دوڑ پڑیں۔ ان کی چیخ و پکار سے زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ چاند کی نرم و نازک کرنیں آگ برساتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان بے جان جسموں میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی جنہیں پے در پے ذلتوں نے مردہ کر دیا تھا۔

اچانک سینکڑوں خنجر چمکے جن مردوں کو چھوڑ کر وہ عورتیں اس قافلے کی طرف بڑھی تھیں انہوں نے جوش انتقام میں حملہ کر دیا تھا۔ یوسف اور اس کے ساتھیوں کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ حملہ آور کیا چاہتے ہیں۔ یوسف نے فادر ہانسل کی لاش آہستگی سے زمین پر اتاری اور پیٹی سے خنجر کھینچ کر مقابلے پر ڈٹ گیا۔

برہنہ لڑکیاں بھی ان کے ساتھ حملہ آوروں پر پل پڑی تھیں۔ انہوں نے جوش انتقام میں اپنے ناخنوں سے حملہ آوروں کے چہروں کو سینکڑوں زخموں سے بجا دیا۔ ان کی آنکھیں نوچ لیں اور زخمیوں کو پتھروں سے کچل دیا۔ یوسف اور اس کے ساتھی بڑھ بڑھ کر باقی ماندہ آدمیوں سے نمٹ رہے تھے۔

چند منٹوں میں ندی کا پانی سرخ ہو گیا۔ اب اس میں صرف خون ہی خون بہہ رہا تھا۔

اس ہولناک جنگ میں چند لڑکیاں کام آ گئیں لیکن ان کی موت کا کسی کو غم نہیں تھا۔ لڑکیوں کو محفوظ مقام پر پہنچا کر یوسف اور اس کے ساتھی واپس آئے اور ایک جگہ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ انہیں ایلبانو کی صورت نظر آئی۔ یہ سفاک قاتل اس وقت سہمے ہوئے بیل کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا اور ہاتھ پاؤں شل تھے۔ مور نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایلبانو کی پہلے ایک کلائی توڑی پھر دوسری، اس کے بعد وہ اس کی آنکھوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جب فنگر ڈیگر نے اس کی دونوں آنکھیں باہر نکال دیں تو ایلبانو کی چیخیں شیطانوں کی جنت کے ذرے ذرے کو لرزانے لگیں۔

''اسے سنبھالو یوسف! میں اسے جان سے نہیں ماروں گا۔ یہ نشان عبرت بن کر بستی میں رہے گا۔'' مور نے سپاٹ لہجے میں کہا اور یوسف نے آگے بڑھ کر ایلبانو کو جکڑ لیا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ دیوانگی میں وہ بار بار ان سے اپنی موت کی درخواست کر رہا تھا لیکن کسی کے کان ان آوازوں کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

گزرتے ہوئے قافلے پر خاموشی طاری تھی ان کے قدموں کی آہٹ سے چٹانیں لرز رہی تھیں۔

کنگ کو ہوش آیا تو اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک مشعل بردار جلوس جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ جسم ابھی تک میٹھے میٹھے درد میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا۔ اسے زیادہ دیر غافل نہیں رہنا پڑا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک سائے پر پڑی جو اس سے کچھ فاصلے پر منتظر کھڑا تھا۔ یہ کاکنان کا پورا جسم تن گیا۔ وہ دل ہی دل میں اس طاقت و حریف کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا جو اس کی غفلت سے فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کی توقع کسی کنگ فو ماسٹر سے نہیں کی جا سکتی تھی۔

دونوں شاہانہ انداز میں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے کی طرف سے حملے کا انتظار کرنے لگے۔ کنگ نے پورے جسم کے عضلات اکڑا کر اس نشہ آور کیفیت کو ختم کر دیا تھا اور اب وہ نہ صرف ہر لحاظ سے تازہ دم تھا بلکہ اس کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ لڑائی کے دوران دماغ بے قابو نہ ہونے پائے۔ غصے کی حالت میں کنگ فو کی کسی تکنیک کو صحت کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کنگ نے بے

قراری کے ہاتھوں مجبور ہوکر آہستہ آہستہ کاکنان کی طرف کھسکنا شروع کردیا۔

تین گز کے فاصلے سے اس نے گلائڈنگ لیپ کے ساتھ کاکنان کے سر کو نشانہ بنایا۔ کاکنان نے ڈبل ڈریگن اسٹمپ کو آسانی سے رد کردیا۔ کنگ واپس زمین پر پہنچا تو کاکنان پلٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ کاکنان نے لاسٹنگ کک اس کی ریڑھ کی ہڈی پر مارنے کی کوشش کی تھی لیکن کنگ پھرتی سے اس کی زد سے باہر نکلا اور کاکنان کی ٹانگ اس سے ایک انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔

کاکنان جیسے ہی زمین پر پہنچا کنگ اچھلا۔ اس نے فضا میں بلند ہوتے ہی ہدف دیکھ لیا تھا۔ کاکنان بھی ہوشیار ہو چکا تھا۔ دونوں حریف پہلے بھی آمنے سامنے آچکے تھے اس لئے وہ بڑی حد تک ایک دوسرے سے واقف تھے۔ کاکنان نے کنگ کے حملے سے پہلے ہی پھرتی سے کھوپڑی توڑنے والی ضرب لگائی لیکن کنگ کی پاؤنڈنگ دیو نے کاکنان کی ضرب کو پانی بنادیا۔ اس نے سر کو دائیں جانب جھکایا اور فوراً ہی دایاں پاؤں ضرب لگانے کے لئے سخت ہوگیا جیسے ہی کنگ نے کاکنان کی طرف دھوکے کا وار کیا اور سخت سخت ٹانگ لہرائی کاکنان کی آہنی ایڑی کی تیز دھار نے اس کے پشت پر چرکہ لگادیا۔ کنگ تڑپ کر پلٹا اور اس کا بایاں ہاتھ گھوم گیا۔ کاکنان کی ناک کے سامنے تباہ کار گولے کی طرح گھومتا ہوا ہاتھ بغیر کوئی نقصان پہنچائے گزر گیا۔ کنگ نے چاندنی میں کاکنان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے عضلات میں سختی پیدا ہوگئی تھی لیکن آنکھیں اس کی پھرتی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ غالباً کاکنان کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ کنگ واقعی اس کے مقابلے کا ماسٹر ہے۔

کنگ کے دونوں پاؤں چٹان پر گھومے۔ اس نے پشت کاکنان کی طرف کرلی، وہی پشت جو ابھی چند لمحے پہلے کاکنان کے حملے سے ریزہ ریزہ ہونے والی تھی، اب وہاں خون کا دھبہ نمودار ہو رہا تھا۔ اس زعم نے کنگ کو مزید ہوشیار کردیا نشے کی رہی سہی قوت بھی زائل ہوگئی اور وہ پوری طرح بیدار ہوگیا۔ کنگ کا ٹائیگر کلا، کاکنان کے چہرے کی طرف لپکا۔ کاکنان بڑی صفائی سے جھکا اور ہیڈ بٹ سے جواب دیا لیکن وہ کنگ کی رانوں کے درمیان میں ضرب لگانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ کنگ نے دایاں گھٹنا اٹھایا اور ضرب کی سمت بدل دی۔ کاکنان کی ہتھیلی ہڈی پر پڑی اور رائیگاں گئی۔ اسی دوران میں کنگ کی دائیں کہنی کاکنان کے جھکے ہوئے سر کی طرف لپکی لیکن کاکنان نے بیک وقت مونگی بلو اور لاسٹنگ کک استعمال کرکے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ اسی مہلت میں کنگ کے پیٹ سے ایک بار پھر کاکنان کی تیز دھار آہنی ایڑی ٹکرائی اور خراش میں خون بھر گیا۔

دوسرا زخم لگتے ہی کنگ رقص کے انداز میں دائیں طرف کودا اور کاکنان کی پیچھے اٹھتی ہوئی ٹانگ پر ہیمب بلو لگائی۔ اس کی مٹھی کاکنان کے کھلے پائنچوں والی پتلون کی تہوں کو کاٹتی ہوئی نکل گئی۔ کنگ کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ کاکنان کو بغور دیکھ رہا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

رات گزر چکی تھی اور اب افق پر سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ کاکنان نے فضا میں کچھ سونگھا اور خود کو چٹان پر گرادیا، پھر وہ پھرتی سے فضا میں بلند ہوا۔ یہ ایک خطرناک حملہ تھا۔ اگر کنگ سے ذرا سی چک ہو جاتی تو آج کا سویرا اس کی زندگی کی شام بن جاتا۔ کاکنان کا ڈریگن اسٹمپ بیکار کرکے اس نے نائب سلیش استعمال کیا۔ اس کی تلوار جیسی کاٹ رکھنے والی انگلیاں کاکنان کے نرخرے سے ایک انچ کے فاصلے سے گزر گئیں کنگ نے بیک وقت بچھو کے ڈنگ کی طرح اسکارپین بلو اور بندر کے پنجے کی طرح مونگی بلو استعمال کئے۔ کاکنان ایک فٹ کے فاصلے پر گر گیا۔ اس نے گرتے ہی راک ایلمش سے اپنا دفاع کیا لیکن کنگ کے وار اس کے ہاتھوں کو زخمی کر رہے تھے۔ کنگ نے اسی دوران میں اپنا خطرناک ترین وار کیا، لیکن کاکنان

بجلی کی طرح تڑپ کر اپنا گلا بچا گیا۔ لائٹنگ کک اس مرتبہ بھی رائیگاں گئی تھی۔

کاکنان کا کندھا اور دایاں ہاتھ ٹائیگر کلا سے زخمی ہوا تو اس نے کنگ کی ران کے گوشے میں چوٹ مارنے کی کوشش کی لیکن اس وقت کنگ کا بازو نصف دائرے کی شکل میں گھومتا ہوا اس کے اپنے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنا وار ملتوی کرکے اس جان لیوا وار سے بچنے کے لئے بڑی پھرتی سے سوو پنگ برڈ استعمال کیا۔ یہ اس کی حاضر دماغی ہی تھی جو پھرتی کے ساتھ ساتھ اسے بچا گئی ورنہ اس کی کھوپڑی کئی ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر آس پاس بکھر گئی ہوتی۔

کنگ نے فوراً ہی پاؤنڈنگ دیو استعمال کی جسے بھینسے کی ٹکر جیسے انداز میں ریمز ہیڈ سے بچا گیا۔ کنگ نے اس کی ٹکر سے بچنے کے لئے دائیں طرف جھکائی لی اور لیپنگ ڈئر سے کاکنان کو زمین سے اچھال کر فضا میں بلند ہونے پر مجبور کردیا۔ اسی لمحے اس کے ہاتھ کا نائف پوائنٹ کاکنان کے نرخرے کی طرف بڑھا۔

کاکنان نے دوبارہ وار بچایا اور کنگ کے تیز ناخن اس کی گردن پر خراشیں ڈالتے ہوئے نکل گئے۔ ہر خراش فوراً ہی خون آلود ہوگئی۔ اب دونوں ہی ماسٹر آف فائٹ زخمی ہو چکے تھے اور ان کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر حملے کرتے رہے۔ ان کے لڑنے کا انداز وحشیانہ رقص سے مشابہ تھا۔ یہ وحشیانہ رقص جاری رہا۔ یہاں تک کہ دو گھنٹے گزر گئے۔ ان کے جسم خون اور پسینے سے تر ہو چکے تھے اور ہونٹوں پر خشکی نظر آنے لگی تھی۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔

کاکنان نے جسمانی قوت کو زائل ہوتے ہوئے محسوس کیا تو اس نے روحانی قوت کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن روحانی قوت تو نہ جانے کب کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس نے اپنے استاد کے بتائے ہوئے سبق کو دہرانا چاہا لیکن وہ ایک لفظ بھی زربلب نہ لا سکا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

کنگ کا جسم اب پتھر کی طرح سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ کاکنان اپنی ظاہری اور باطنی دونوں قوتوں کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جسم کے اس تناؤ کے ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ کاکنان پسپا ہو رہا ہے۔ کاکنان کے چہرے پر جابجا خراشیں تھیں۔ پیشانی کی خراش سے خون بہہ بہہ کر اس کی آنکھوں میں گر رہا تھا۔ کاکنان نے اپنے خطرناک ترین داؤ استعمال کئے تھے لیکن ایک آدھ وار کامیاب بھی ہوا تو کنگ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس قوت کو ہلانے میں اسے ناکامی ہوئی ہے وہ کنگ کے پاس موجود ہے۔

زندگی میں پہلی بار کاکنان کو احساس ہوا کہ چونکہ اس نے نیکی کی راہ چھوڑ کر بدی کا راستہ اپنا لیا تھا اس لئے اب اس کا انجام قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار حملے کرنے لگا۔ کنگ اور اس کے ہیولے دور سے دیکھنے والوں کو دو کے بجائے ایک ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اتنی پھرتی سے ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے اور اپنے آپ کو حریف کے واروں سے بچا رہے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

سورج دھیرے دھیرے بلند ہو رہا تھا اور دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔

کنگ نے دل ہی دل میں اپنے حریف کی طاقت اور فن کو داد دی۔ وہ واقعی اس کا مدمقابل تھا۔ خود اس کے دل سے اپنے مرنے کا خوف زائل ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں کیری باب کی لاش گھوم گئی اور پھر اس کے بدنصیب باپ کا چہرہ اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں نظر آنے لگیں۔ ہاتھ پتھر کے محسوس ہونے لگے۔ کاکنان نے ریمز ہیڈ کو بائیں طرف جھکائی دے کر بچایا اور اس کے بائیں بوٹ کی تیز دھار ایڑی دائرے کی شکل میں گھومتی ہوئی کنگ کے رخسار کی طرف بڑھی۔ فضا میں بلند ہونے والی چیخنے کی آواز نے اسے بتادیا کہ وہ حریف کی ہڈی کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ کنگ کا ہاتھ اس کی آنکھوں اور گلے کے سامنے تیز دھار چاقوؤں کی طرح

گھوم رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا۔

ایک پتھر سے اس کا پاؤں ٹکرایا۔ ذرا سا توازن بگڑا۔ اسی لمحے کاکنان کے سر سے ہتھیلی گزر گئی۔ اسے کھوپڑی کے بالائی حصے میں حرارت کا احساس ہوا۔ ہتھیلی نے چند بالوں کو اڑا دیا تھا۔ وہ پہاڑیوں سے لڑتے لڑتے ریتیلے میدان میں پہنچ گئے۔ نصف میل کا یہ فاصلہ انہوں نے تین گھنٹوں میں طے کیا تھا۔

اچانک کنگ آگے بڑھا۔ اس نے دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں بیک وقت استعمال کی تھیں۔ یہ ایک فیصلہ کن وار تھا جس کا جواب اس کے اپنے استاد کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس وار میں ایک خوبی تھی کہ چاروں میں سے ایک ہدف ضرور نشانہ بن جاتا ہے۔ کاکنان اس ناگہانی افتاد سے بوکھلا گیا۔ پھر بھی وہ تین وار بچانے میں کامیاب ہوگیا لیکن کاٹ ڈالنے والی ہتھیلی کے چوتھے وار کے سامنے اس کی پیش بینی نہیں گئی، ہتھیلی اس کی کلائی پر پڑی اور ہاتھ یوٹوٹ کر ریت پر گر گیا جیسے خشک لکڑی تیز دھار کلہاڑے کے وار سے ٹوٹ جاتی ہے۔

کاکنان تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگا۔ کنگ نے اچھل کر دونوں ٹانگیں پھینکیں اور دونوں ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر گھورنے لگے۔ ''نہیں کاکنان!'' کنگ نے کہا۔ ''تم بچ کر نہیں جاسکتے، میں نے قسم کھائی تھی کہ مرجاؤں گا یا تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔''

کنگ نے بایاں ہاتھ چلایا انگلیوں کا خنجر کاکنان سے ٹکرایا۔ رخسار سے گوشت کا پارچہ اتر گیا اور کاکنان کے چہرے پر خون ہی خون پھیل گیا۔ وہ جھکا لیکن دوسرا وار اس کے بائیں گھٹنے پر پڑا تھا۔ ٹانگ بروقت ہٹانے سے ٹوٹی تو نہیں البتہ اس کا جوڑ نکل گیا۔ کاکنان زمین پر گر گیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس نے مرنے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ ماضی کی دھندلی دھندلی تصویریں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں اور وہ ان جرائم کو دیکھ رہا تھا جن کی پاداش میں وہ اس انجام کو پہنچا تھا۔

اور جب کہانی ختم ہوگئی تو شاگرد بولا۔ ''استاد محترم کہانی کا اختتام ہوگیا۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''بہت اچھی کہانی تھی۔ اس کہانی سے سبق ملتا ہے کہ اوپر والے کی دی ہوئی طاقت، شہرت اور دولت کے بل بوتے پر ظالم اور جابر نہیں بننا چاہئے اور جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے نشے میں دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے تو پھر ایک دن وہ بھی ایک ادنیٰ اور حقیر کیڑے سے بھی بدتر ہوجاتا ہے اور وہ اوروں کے لئے نشان عبرت بن جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ غرور کرنے کے بجائے ہر دلعزیز بن کے رہنا چاہئے۔''

اس کے بعد رولوکا اپنے سامنے بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ''محترم آپ لوگ اب تشریف لے جائیں، مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔''

یہ سن کر ایک شخص بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہم لوگوں کو اچھی اچھی سبق آموز باتیں بتاتے ہیں اور پھر ہمارا قصبہ تمام آفات و بلیات سے محفوظ ہے، ہم سب کی دعائیں ہیں کہ اوپر والا مالک آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے، اب ہم لوگ چلتے ہیں۔''

پھر سارے لوگ آستانے سے نکلتے چلے گئے۔

جب سارے لوگ چلے گئے تو رولوکا نے آستانے کا دروازہ بند کیا اور کونے میں پڑا ہوا ٹھوس سانپ کو اٹھایا اور اپنے سامنے تھوڑے فاصلے پر رکھ دیا۔

اس کے بعد رولوکا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا اور اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی کا رخ سانپ کی طرف کردیا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سانپ اپنی اصلی حالت میں آگیا اور اس نے اپنے سر کو حرکت دینے لگا۔

رولوکا کی انگلی بدستور سانپ کی طرف ہی تھی کہ اچانک ایک دل دہلاتا منظر رونما ہوا۔ سانپ کا حجم بڑھنے لگا اور اس کا حجم بڑھتے بڑھتے کوئی چار فٹ اونچا ہوگیا۔

(جاری ہے)

(فروری کے شمارے میں ایم اے راحت کی نئی قسط وار کہانی ''دشمن روحیں'' ضرور پڑھیں)

لکشمی

ساحل ابڑو۔ ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

صدیاں بیت گئیں مگر یہ حقیقت روز اول کی طرح آج بھی عیاں ہے کہ اس خاندان میں جب بھی کسی نئی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو وہ ماں بننے کے بعد مرجاتی ہے لاکھ جتن کے بعد بھی.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ جانور بھی ذہین ہوتے ہیں، ثبوت کے لئے کہانی پڑھ کر دیکھیں

کلکتہ کے نواح میں ایک گاؤں لکھن پور کے نام سے جانا جاتا ہے، جہاں ہندوؤں کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ برسوں قبل اس گاؤں کا کھیا راجیش نامی شخص تھا۔ گاؤں میں اس کی زمین سب سے زیادہ تھی۔ اس کے کئی نوکر چاکر تھے۔ اس کی اولاد میں صرف تین بیٹیاں تھیں۔ اسے ایک وارث کی شدید خواہش تھی مگر قدرت نے اسے اس نعمت سے محروم ہی رکھا تھا۔ اسی لئے اس نے بڑی بیٹی بسنتی کی شادی کرنے کے بعد اس کے شوہر کو گھر داماد بنالیا تھا۔ اس کا داماد سریندر بہت ہی شریف اور بے ضرر شخص تھا۔ وہ اپنے سسر راجیش کی تابعداری کرتا اور اس کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا۔

سریندر کا تعلق غریب خاندان سے تھا۔ اس لئے وہ حویلی میں آکر بہت ہی خوش تھا۔ کیونکہ یہاں آکر اس کی محرومیاں ختم ہوگئی تھیں، یہاں اسے ہر خوشی اور آسائش

حاصل تھی۔

سریندر اور بسنتی کی شادی ہوئے پانچ سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ مگر ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ان دونوں کو اولاد کی بہت ہی آرزو تھی۔ سریندر بسنتی کے علاج کے لئے بہت ہی بھاگ دوڑ کرتا رہتا تھا۔ اس نے انگریزی علاج سے مایوس ہوکر سادھوؤں اور سنیاسیوں کی خدمات حاصل کرنی شروع کردیں۔

ان ہی دنوں لکھن پور سے ایک سپیرے کا گزر ہوا۔ اس کی ملاقات راجیش سے ہوئی، تو اس نے راجیش کو ایک خاص قسم کا منکا دیا اور تاکید کی کہ وہ کسی بھی طرح یہ منکا پیس کر آدھا بیٹی اور آدھا داماد کو کھلا دے، تو بسنتی کی گود ہری ہوجائے گی اور راجیش کے من کی مراد بھی پوری ہوجائے گی۔

کھیا راجیش نے سپیرے کے کہنے پر عمل کیا پھر بسنتی اور سریندر کو وہ منکا پیس کر آدھا آدھا کھلا دیا۔ سپیرے کا دعویٰ سچ ثابت ہوا، یوں ہی دن گزرنے لگے اور جب وہ دن قریب آئے جب بسنتی ماں بننے والی تھی۔ حویلی میں گاؤں کی تمام بڑی بوڑھیاں جمع ہوگئیں۔ ان سب کو راجیش نے خصوصی طور پر بلایا تھا راجیش اور اس کا داماد سریندر حویلی کے ایک کمرے میں خوشخبری سننے کے لئے بے تابی سے ٹہل رہے تھے کہ اچانک سنتی کے کمرے سے عورتوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر وہ خوف سے چیختے ہوئے باہر صحن میں آگئیں۔ ان کی چیخ وپکار سن کر راجیش اور سریندر بھی کمرے سے باہر نکل آئے۔ راجیش نے آگے بڑھ کر ایک بوڑھی سی عورت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے ناں؟"

مگر اس عورت کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور بھاگ کر حویلی سے باہر نکل گئی۔ راجیش اور سریندر بسنتی کے کمرے کی طرف بڑھے اور جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ لرز گئے اور جیسے سکتے میں آگئے۔

بسنتی نے ایک بچی کو جنم دیا تھا۔ وہ بچی فرش پر پڑی رو رہی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں ایک آٹھ انچ لمبا سانپ کا بچہ لہرا رہا تھا۔

کچھ عورتیں سہمی ہوئی ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ جبکہ بسنتی نیم بے ہوش تھی۔

راجیش نے چند لمحے سوچا اور پھر ہمت کرکے بچی کی مٹھی کھول کر سانپ کا بچہ اس سے علیحدہ کیا پھر بچی کو اٹھا کر اسے بسنتی کے پہلو میں لٹا دیا۔ اور سانپ کے بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر کمرے سے باہر لے آیا۔

اس نے غصہ سے اس کو زمین پر پھینکا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سپولئے کو جوتوں سے مسل دیتا۔

"ایک سادھو حویلی میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا۔"

"ٹھہر جا کھیا! اس کو نہ مارنا یہ بے ضرر ہے۔ اس نے اگر بچی کو نقصان پہنچانا ہوتا تو یہ پیٹ کے اندر ہی اسے ڈس لیتا۔ یہ تم پر بھگوان کا خاص کرم ہوا ہے۔ یہ اسی کا ایک روپ ہے۔ یہ بھید بھگوان ہی جانتا ہے۔ بھگوان نے اپنا روپ تمہارے گھر بھیج کر تم پر احسان کیا ہے۔"

گاؤں کے مندر کا پنڈت بھی سادھو کے ہمراہ تھا۔ اس کے سادھو الفاظ کی تائید کی اور کہا۔

"کھیا! بھگوان تم پر مہربان ہوگیا ہے۔ تمہارے دن پھرنے والے ہیں۔"

یہ کہہ کر پنڈت زمین پر بیٹھ گیا اور سانپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر پنڈت کے کہنے پر ہی ایک خوب صورت بڑا سا پیالا منگوایا گیا جس میں دودھ تھا پنڈت نے اپنے ہاتھوں سے سانپ کے بچے کو دودھ پلایا اور اسے پیالے کے اندر رکھ کر کہا۔

"یہ اس کا گھر ہے۔" پیالے میں جانے کے بعد سانپ نے کلبلانا شروع کردیا۔ بسنتی کے گھر سانپ کے جنم کی خبر ارد گرد دیہاتوں میں پھیل گئی، لوگ بسنتی کی بچی اور سانپ کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ بسنتی کی بچی کا نام شانتی رکھا گیا۔ جبکہ سانپ کے بچے کا نام لکشمی رکھا گیا "کیونکہ وہ مادہ تھی۔"

راجیش، سریندر اور بسنتی نے سادھو اور پنڈت کی باتوں کو سچ جانا اور ان کے کہنے پر عمل شروع کردیا۔ لکشمی کو وہ سب بھگوان کا دوسرا روپ ہی سمجھتے تھے۔ اس لئے شانتی اور لکشمی میں کوئی فرق نہ رکھا گیا۔ جس روز شانتی کو نہلایا گیا اسی روز لکشمی کو بھی نہلایا گیا بسنتی، لکشمی کو بھی اپنی بیٹی سمجھنے لگی۔

شانتی اور لکشمی ساتھ ساتھ پرورش پانے لگیں۔ جو کوئی شانتی کو دیکھنے آتا۔ وہ لکشمی کو بھی ضرور دیکھتا۔ لکشمی کا ٹھکانہ اب ایک خوبصورت سی ٹوکری تھی۔ جس میں نرم اور ریشمی کپڑے کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ بسنتی جب شانتی کو دودھ پلاتی تو لکشمی کو بھی ساتھ ہی دودھ پلاتی۔

شانتی، لکشمی کو اپنی بہن ہی سمجھنے لگی لکشمی صرف بول نہ سکتی تھی اس کے علاوہ وہ تمام باتوں اور اشاروں کو بخوبی سمجھتی تھی اس کا نام لے کر مخاطب کیا جاتا تو وہ سمجھ لیتی کہ اسے مخاطب کیا جارہا ہے۔

جب شانتی اور لکشمی بڑی ہوگئیں تو وہ حویلی سے باہر گاؤں کی دیگر لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے نکل جاتیں۔ لکشمی ہر جگہ شانتی کے ساتھ ساتھ رہتی۔ شروع میں گاؤں کے بچے لکشمی کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ سب لکشمی سے مانوس ہوگئے۔ کیونکہ لکشمی کسی کو نقصان نہ پہنچاتی تھی۔ شانتی اور دیگر بچیاں کھیل رہی ہوتیں تو لکشمی دور بیٹھ کر ان کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ اور جب شانتی گھر کو روانہ ہوتی تو لکشمی بھی بل کھاتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔

سادھو اور پنڈت کی پیشن گوئیاں سچ ثابت ہونے لگی تھیں۔ راجیش کی فصل پہلے سے دوگنی ہورہی تھی۔ راجیش نے سریندر کو گاؤں میں کریانہ کی دکان ڈال دی تھی۔ جو خوب چل رہی تھی سریندر، راجیش بسنتی اور شانتی سب خوش تھے کہ لکشمی نے ان کے دن پھیر ڈالے ہیں۔ مگر بسنتی کی دونوں بہنیں سیتا اور گیتا لکشمی کو ناپسند کرتی تھیں لکشمی کو اکثر ان کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ مگر وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرلیتی اور کبھی بھی احتجاج نہ کرتی۔

ایک روز ایک کتے نے حویلی کی ایک مرغی پکڑ کر مار ڈالی اور اس کو کھا گیا لکشمی کو کتے کی یہ حرکت بہت بری لگی اس نے دو دن بعد کتے کو جالیا اور اس کا راستہ روک کر پھن پھیلا کر کھڑی ہوگئی اور پھر آگے بڑھ کر کتے کی گردن پر اپنے دانت گاڑ دیئے وہ کتا کچھ ہی دیر بعد مر گیا تھا۔ اس روز سے بچے لکشمی سے ڈرنے لگے۔ مگر اس کے بعد لکشمی نے کسی اور کو کوئی نقصان نہ پہنچایا تو بچوں کا اعتماد بحال ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

لکشمی اکثر سریندر کی دکان پر چلی جاتی۔ بسنتی کوئی کام کہتی تو وہ سریندر کی دکان پر جا کر اسے سر کے اشاروں میں سمجھاتی تو وہ سمجھ جاتا۔ اسی طرح سریندر اسے کوئی بات کہتا تو وہ جا کر اشاروں میں بسنتی کو سمجھا دیتی وہ گھر سے سیدھی دکان پر جاتی اور دکان سے سیدھی گھر آتی۔ راستے میں وہ کسی کی بھی کوئی بات نہ سنتی ویسے بھی گاؤں کے سارے لوگ اس سانپ یعنی لکشمی سے مانوس ہوچکے تھے لکشمی کو جہاں جانا ہوتا تیزی سے چلی جاتی تھی۔

سیتا اور گیتا کا وہی حال اور انداز تھا وہ لکشمی اور بسنتی دونوں ہی سے نالاں رہتی تھیں بسنتی سے اب ان کی لڑائی بھی ہونے لگی تھی جب شانتی اور لکشمی دس سال کی تھیں تو سیتا کی شادی ہوگئی سیتا کا شوہر راج کمار بھی اسی حویلی میں رہنے لگا اور وہ بھی سیتا اور گیتا کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ اس نے ایک بار لکشمی کو جوتا بھی دے مارا۔ مگر لکشمی نے اس کی مار کا برا نہ منایا۔ بسنتی نے کئی بار اپنی بہنوں کو سمجھایا کہ لکشمی بے زبان ہے۔ اسے کچھ نہ کہا کرو۔ ورنہ بھگوان ناراض ہوگا مگر وہ بسنتی کی باتیں سن کر کہتیں۔

"بسنتی تو..... تو پاگل ہے۔ بھلا سانپ بھی کسی کا متر ہوا ہے یہ ایک نہ ایک دن اس حویلی کی خوشیوں کو ڈس لے گی۔ سانپ کو جتنا بھی دودھ پلاؤ یہ ڈستا ہے۔ کیونکہ ڈسنا اس کی فطرت ہے۔ اور فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔"

"یہ سوچیں تمہاری ہیں۔ میں نے اس کو جنم دیا ہے۔ میں اس میں اور شانتی میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ اگر اس نے کچھ کرنا ہوتا تو میرے پیٹ کے اندر ہی

کرڈالتی۔"

بسنتی کا جواب سن کر بھی وہ نہ مانتیں اور کہتیں۔

"اگر یہ ہمارے کمرے میں آئی یا بستر پر چڑھی تو ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔" ان کی بحث وتکرار سن کر لکشمی بھی آجاتی اور ان کی باتیں غور سے سنتی اور بسنتی کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ بسنتی اسے اٹھا کر گود میں بیٹھا لیتی تو وہ بہت خوش ہوتی۔"

☆.....☆.....☆

ایک روز لکشمی حویلی سے باہر گئی ہوئی تھی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہمراہ ایک سانپ بھی تھا۔ سانپ کو دیکھ کر گھر والے تو ڈر ہی گئے۔ لکشمی فوراً ہی سمجھ گئی اس نے سانپ سے پیار و محبت جتائی اور پھر اسے حویلی سے باہر چھوڑ آئی۔ اس کے بعد بھی کبھی کبھی لکشمی سانپ کو حویلی کے اندر لے آتی۔ مگر وہ جلد ہی حویلی سے باہر نکل جاتا۔

بسنتی اور گھر والے یہ سمجھ گئے کہ لکشمی اس سانپ سے محبت کرتی ہے بسنتی اور شانتی دونوں ہی خوش ہوتیں۔

☆.....☆.....☆

سردیوں کے دن تھے۔ بسنتی نے لکشمی کے لئے رسوئی میں رات کو سونے کے لئے جگہ بنادی تھی کیونکہ رات کو کھانا پکانے کے بعد رسوئی کافی گرم ہوجاتی تھی۔ ان دنوں لکڑیاں اور اپلے جلانے کا رواج تھا۔ اب لکشمی رات بڑے آرام سے گزارتی تھی صبح جب بسنتی ناشتہ تیار کرنے کے لئے رسوئی کھولتی تو لکشمی جاگ جاتی۔ بسنتی صبح سب سے پہلے اٹھتی تھی اور سب کا ناشتہ بناتی تھی مگر سیتا اور راج کمار دیر سے اٹھتے تھے اپنا اور راج کا ناشتہ سیتا خود بناتی تھی۔

ایک روز سیتا اور راج کمار نے دہلی جانا تھا۔ لہٰذا وہ سب سے پہلے بیدار ہوگئے سیتا جب ناشتہ بنانے رسوئی میں گئی تو وہاں لکشمی اور اس کا محبوب سانپ اکٹھے مزے سے سو رہے تھے سیتا نے راج کمار کو بلایا اور کہنے لگی۔ "آج نادر موقع ہے کیوں نہ ہم لکشمی اور اس کے محبوب سانپ کا خاتمہ کردیں۔"

راج کمار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تو انہوں نے مل کر اپلوں پر مٹی کا تیل چھڑکا اور پھر ان کو آگ لگا کر ان کو لکشمی اور اس کے ساتھی سانپ پر پھینک دیا اور پھر رسوئی کا دروازہ بند کردیا۔ اپلوں نے اتنی تیزی سے آگ پکڑی کہ پوری رسوئی آگ کی لپیٹ میں آگئی۔

لکشمی اور اس کا ساتھی سانپ جب باہر نکلے تو وہ بری طرح جھلس گئے تھے وہ زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے اتنے میں بسنتی اور دیگر گھر والے بھی جاگ گئے۔ لکشمی اور اس کا ساتھی تڑپتے ہوئے غصے سے پھنکار رہے تھے بالآخر انہوں نے بسنتی کے قدموں میں دم توڑ دیا۔ بسنتی اور شانتی دونوں رونے لگیں مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

"سیتا اور راج کمار بغیر ناشتہ کئے دہلی روانہ ہوگئے تھے۔" حویلی میں ماتم کا سماں پیدا ہوگیا۔ گیتا کے علاوہ ہر آنکھ اشکبار تھی کچھ ہی دیر بعد حویلی کے در و دیوار سے غیبی آوازیں گونجنے لگیں۔

"آوازیں کچھ یوں تھیں۔"

"بسنتی کی اولاد دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اس کے علاوہ حویلی کی کسی بھی عورت کا سہاگ زندہ نہ رہے۔"

اس وقت تو کسی نے ان آوازوں کی طرف توجہ نہ دی۔ مگر جب وہ آوازیں حقیقت کا روپ دھار گئیں تو سیتا اور گیتا بھی پچھتانے لگیں۔

سیتا جب دہلی سے لوٹی تو وہ بیوہ ہوچکی تھی۔ گیتا کی بعد میں شادی ہوئی تھی مگر وہ بھی دو ماہ بعد ہی بیوہ ہوگئی، راج کمار کی موت کے بعد سیتا ایک بیٹے کی ماں بنی تھی۔

صدیاں بیت گئیں مگر اس خاندان میں اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ سیتا اور گیتا کے خاندان کی جس لڑکی کی شادی ہوتی ہے وہ بچی ماں بننے کے بعد بیوہ ہوجاتی ہے۔

اس کے برعکس بسنتی اور شانتی کا خاندان ہمیشہ سے سکھی اور خوشحال ہے۔ وہ لکشمی کو نہیں بھولے ہیں۔ اور ہر سال اس کی موت والے دن اس کی یاد میں دیا جلاتے ہیں اور دو پیالوں میں دودھ بھر کر جنگل کی جھاڑیوں میں رکھ آتے ہیں۔

روح کا عشق

مدثر بخاری-شہر سلطان

خوبرو حسینہ نے اچانک ہیبت ناک شکل اختیار کرلی اس کا نچلا دھڑ جلی ہوئی ہڈیوں جیسا تھا اس کے ہاتھ میں خون میں ڈوبی ہوئی ایک تلوار تھی، اس نے تلوار پر اپنی گرفت سخت کی اور پھر.....

لفظ لفظ سے خوف ٹپکتا اور جسم و جاں کے رونگٹے کھڑے کرتی خوفناک اور حیرت انگیز ڈراؤنی کہانی

رات کافی بیت چکی تھی اندھیرا جوبن پر تھا۔ لوگ سردیوں کے ٹھنڈے موسم میں گھروں میں دبکے لحافوں میں گھسے نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ گلیاں آوارہ کتوں سے بھری پڑی تھی۔ لیکن کتے بھی خاموش تھے۔

میں انسپکٹر کامران بذات خود لحاف میں دبکا ہوا تھا اگر آپ کو ہلکا سا یاد ہو تو ایک اہم بات واضح ہوجائے گی کہ میں کون ہوں۔ میں بذات خود نفس نفیس بالکل مکمل ہوش وحواس میں تحریر کررہا ہوں کہ مجھے انسپکٹر کامران کہتے ہیں۔ زندگی پولیس تھانوں اور جیلوں میں گزری فرق صرف اتنا تھا کہ میں ان ہوشربا چالاک اور مکار قسم کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاتا جو ملک وقوم کے دشمن ہوتے تھے۔ لیکن ایک بات مزید عرض کرتا چلوں میری زندگی میں رومانس اور ہارر کا ایسا رشتہ قائم ہوا

WWW.PAKSOCIETY.COM

جو ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ میں نے اپنی جوانی میں خوبرو حسیناؤں کو اپنے چکر میں بھی کبھی نہیں پھنسایا البتہ اتنا ضرور تھا کہ بیسیوں بار کئی حسینائیں میری سحر انگیز شخصیت پر مرمٹیں۔

لیکن بھلا ہو کچھ روحوں کا جو مرنے کے بعد میرے خواب میں آنے لگیں میں گردن تک ان مردہ حسیناؤں کے عشق میں مبتلا ہو جاتا اور زندگی کے حسین اور رنگین ہونے کے خواب دیکھتا رہا لیکن انجام صرف روح کے عشق تک محدود رہا۔

زیر نظر کیس کا تعلق ایک گمنام حسینہ سے ہے جو اپنی قبر سے مجھے فون کرتی ہے، رات کا منظر اور ایک گمنام کال کی آمد اور ایک نئے انوکھے کیس کی ابتداء کچھ یوں ہوئی۔

میں فون کی گھنٹی پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے پرسنل سیل فون پر ایک نمبر ڈسپلے ہو رہا تھا۔ وہ ایک گمنام نمبر تھا دل نے چاہا کہ اگنور کر دوں اور سیل آف کر کے نیند کے مزے لوں لیکن مجھے اپنے فرض اور حساس نوعیت کی ڈیوٹی کا خیال بھی کوندے کے مانند آیا تھا میں نے بلا شرکت غیرے فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو..... انسپکٹر کامران۔" آواز نسوانی، سریلی اور شیرینی سے بھرپور۔ البتہ ہلکا سا گھبرایا ہوا لہجہ ضرور تھا۔

"جی..... آپ کون؟" میں نے پوچھا۔

"سر..... میں نائلہ بات کر رہی ہو..... قبرستان سے....." اس نے بتایا۔

"کیا مطلب؟ قبرستان سے بول رہی ہیں۔ گورکن کی بیوی ہیں کیا آپ؟"

"نہیں سر..... دراصل میری فیملی مجھے مردہ سمجھ کر دفن کر گئی اس وقت میں قبر سے بات کر رہی ہو۔" اگر آپ کو یقین نہ آئے تو پھر اس قبرستان کے شمال میں ایک نئی قبر نظر آئے گی۔ وہاں آجایئے۔"

"حیرت ہے.....!! دیکھئے..... آپ کو اس قسم کے بھونڈے مذاق کی اجازت قطعی نہیں دی جاسکتی..... فرض کرتے ہیں آپ کو مردہ سمجھ کر دفن کیا گیا ہے تو آپ کے پاس سیل فون کہاں سے آ گیا؟ اور دوسری بات آپ کو دفنایا گیا ہوگا تو آپ یقیناً بے ہوش ہوں گی اس صورت میں آپ کو یہ کیسے معلوم ہے کہ آپ کی قبر قبرستان کے شمال میں ہے.....؟"

"سر..... میں خود حیران ہوں کہ میرے کفن میں سیل فون کہاں سے آ گیا..... جہاں تک قبرستان کی لوکیشن کا تعلق ہے تو میرے سیل میں لوکیشن سافٹ ویئر ہے جس سے کرنٹ لوکیشن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔"

وہ بڑے اطمینان سے جواب دے رہی تھی۔

"اوکے..... مان لیا آپ اس وقت کسی قبر سے بات کر رہی ہیں..... نفسیاتی طور پر آپ کو ڈرا ہوا سہما ہوا اور خوف زدہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن آپ تو ایسے گفتگو کر رہی ہیں جیسے کسی بیڈ روم کے نرم و گداز بیڈ پر لیٹ کے بڑے اطمینان سے بات کی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

میں ایک بہادر قسم کی لڑکی ہوں اس قسم کی سچویشن کو ہینڈل کرنا جانتی ہوں..... آپ پلیز میری مدد فرمائیں اور مجھے باہر نکالیں..... میں حبس اور گرمی سے کسی بھی لمحے موت کا شکار ہو سکتی ہوں....." وہ بولی۔

لڑکی تیز اور حاضر دماغ تھی جدید دور کے جدید انداز قبر سے فون آنے لگے تھے۔ لڑکی کی موت کی تصدیق کسی ڈاکٹر نے کی ہوگی۔ یہاں غلطی کا امکان تھا مگر لڑکی کے ساتھ فون کیسے دفن ہو گیا.....؟ بہرحال وقت بہت کم تھا میں نے اے ایس آئی شام خان اور حوالدار رحمت خان کو ایمرجنسی طور پر جگایا..... میں نے سب سے پہلے قبرستان کے گورکن کو بیدار کیا..... اس نے کچھ یوں کہا۔

"صاحب جی..... آج صبح ہم نے ایک لڑکی کی قبر تیار کی تھی۔ وہ نوجوان تھی۔"

"وہ قبر کس طرف ہے؟"

"قبرستان کے شمال کی طرف....." اس نے بتایا۔

ہم لوگ رات کے اندھیرے میں قبرستان کے شمال میں جا پہنچے..... وہاں واقعی ایک نئی قبر نظر آ رہی تھی جس پر پھول پڑے ہوئے تھے۔ میں نے قبر میں موجود

نائلہ کو فون کیا..... اس نے اٹینڈ کیا۔

پاؤں کی طرف قبر میں ایک بڑا سا سوراخ بھی نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ سوراخ کیسے وجود میں آ گیا تھا۔

"ہم پہنچ چکے ہیں تم ہمت رکھو۔"

"اوکے سر..... مجھے یقین تھا آپ میری مدد کو ضرور آئیں گے۔" پلیز ذرا جلدی کریں..... میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔" اس کی آواز آئی۔ پھر رابطہ ختم ہو گیا۔

گورکن نے احتیاط سے قبر کھودنا شروع کر دی۔

میرا دل ایک سو بہتر دفعہ دھڑک رہا تھا۔ بہت سے سوالات جنم لے رہے تھے..... ہو سکتا ہے کسی شاطر دماغ دشمن کی چال ہو..... قبر کے اندر لڑکی واقعی مر چکی ہو اور اس کی قبر کی کھودائی۔ قانونی طور پر جرم تھا..... لیکن مجھے قانونی اختیارات حاصل تھے اور مزید کسی قسم کی خطرناک صورتحال کے لئے میرے پاس نائلہ کا فون ریکارڈ تھا۔ جو بہ وقت ضرورت میرے تحفظ کے لئے کافی تھا۔ لیکن فی الحال ذہن بھٹکا ضرور ہوا تھا کچھ بھی ممکن تھا..... لیکن اب کیا ہو سکتا تھا گورکن نے قبر شک کر لی اور میری طرف دیکھنے لگا میں نے سپر ٹارچ آن کی..... اور قبر کے اندر روشنی کی..... وہاں ایک کفن میں لپٹی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ فوراً اپنی جگہ کسمسائی اور اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ پھر میں نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرے ہاتھ کا سہارا لے کر وہ فوراً سے پہلے قبر سے باہر نکلی اور میرے قریب آ گئی وہ کفن میں ہی لپٹی کھڑی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو میرے دل کے قریب ترین رہی تھی۔ وہ نائلہ ضرور تھی لیکن وہ نائلہ جسے میں جانتا تھا جو میری زندگی تھی..... میری محبت..... کسی زمانے میں، میں نے نائلہ سے محبت کی تھی..... جو اس وقت میرے سامنے کھڑی تھی۔

"کامران..... بہت شکریہ..... مجھے زندہ بچانے کا..... میرے اپنے تو مجھے مردہ سمجھ کر دفن کر کے چلے گئے لیکن تم نے آج ثابت کر دیا..... کہ اصل رشتے دل کے ہوتے ہیں۔"

"یہ میرا فرض تھا۔ لیکن تحقیق ہونی چاہئے کہ کس پاگل ڈاکٹر نے تمہیں مردہ قرار دیا اور پھر تمہیں دفن بھی کر دیا گیا۔"

"چھوڑو ان باتوں کو ڈیئر..... میں زندہ ہوں اس موبائل فون نے مجھے زندہ بچا لیا۔"

"اب تم کہاں جاؤ گی..... تمہارے گھر والے تو تمہیں مردہ سمجھ کر دفن کر کے چلے گئے اور اگر تم اس حالت میں گھر جاؤ گی تو سب لوگ نہ صرف حیران ہوں گے بلکہ تمہیں بھوت پریت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر وہ مسکرا اٹھی..... "تم آج بھی ویسے ہی ہو۔ مزاحیہ قسم کے زندہ دل انسان..... میں اکیلی رہتی ہوں..... میرے والدین کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا صرف ایک بھائی ہے جو امریکہ میں رہتا ہے وہ کچھ دن پہلے پاکستان آیا تھا لیکن میری موت ہو جانے کی وجہ سے واپس چلا گیا ہوگا..... میں آرام سے اپنے گھر رہ سکتی ہوں۔"

"لیکن تمہارے محلے والے تمہیں مردہ سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں تم مر چکی ہو۔ لیکن جب تم ان کو زندہ نظر آؤ گی تو پھر کیا خیال ہے تمہاری بات کا یقین کریں گے؟"

"مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے کسی کو یقین نہیں دلانا کے میں زندہ ہوں..... البتہ مجھے نئی جاب تلاش کرنی پڑے گی مجھے یقین ہے کہ نئی جاب بہت جلد مل جائے گی۔"

"اوکے۔" آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں..... رات کا وقت ہے..... اکیلے سفر کرنا تمہارے لئے مناسب نہیں۔"

"شکریہ..... چلئے..... آپ کی کسٹڈی میں گھر پہنچ جاؤں..... یہ ٹھیک ہے....." وہ جیپ میں بیٹھ گئی۔

میں نے گورکن کو کچھ پیسے دیئے اور اس سے بولا کہ اپنے گھر سے کسی لیڈیز کا سوٹ لے آئے تاکہ وہ پہن لے۔ گورکن بھاگا ہوا گیا اور فوراً ایک لیڈیز جوڑا

لے آیا جو کہ اس کی جوان بیٹی کا تھا۔ نائلہ نے وہ جوڑا پہن لیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم نائلہ کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔

"ایک مرتبہ پھر شکریہ..... اور میں آپ سے اپنی تمام غلطیوں پر معافی مانگتی ہوں جو یونیورسٹی لائف میں مجھ سے سرزد ہوئیں..... خاص طور پر میرے جارحانہ انداز کو معاف کر دینا۔"

"وہ دل سے معافی مانگ رہی تھی تو میں بھی پگھل گیا میں تو پہلے ہی اس سے محبت کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ نائلہ نے مجھے کبھی گھاس نہیں ڈالی تھی۔ لیکن میں ہمیشہ ہی اس کی محبت میں جلتا رہا تھا۔ آج ایک عرصہ بعد وہ سامنے آئی تو مصیبت میں گھری ہوئی تھی اور میرا دماغ ماضی کے اس دور میں جا پہنچا جہاں زندگی کے سارے رنگ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جوبن پر تھے۔

مجھے یونیورسٹی میں ایک چہرہ پسند آیا وہ نائلہ تھی..... میں نے اسے پرپوز بھی کیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ نائلہ کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرا ہونا نہ ہونا اس کے لئے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا کچھ عرصہ تک تو میں عشق کے نامراد بخار میں مبتلا رہا لیکن پھر جب نائلہ نے میرا باقاعدہ مذاق اڑانا شروع کر دیا تو میں نے سائیڈ لے لی۔ البتہ انہی دنوں نائلہ کا چکر ایک لڑکے سے سامنے آ گیا تو میں ناکام عاشق کی مانند کچھ دن تو اپنی بربادی پر ماتم کرتا رہا۔

میری حالت بہت ابتر ہو گئی تھی میں حقیقت میں جیسے دیوانہ بن گیا تھا۔ لیکن بھلا ہو محترم اسد اللہ کا جنہوں نے دن رات مجھے لیکچر دیئے اور میری زندگی بدلی ورنہ نائلہ نے تو مجھے برباد کر دیا تھا۔

خیر..... پرانی باتیں ماضی کا حصہ بن گئی مگر آج وہی نائلہ میرے سامنے ایک مرتبہ پھر آ گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔ اسے پشیمانی تھی۔

"تم نے شادی نہیں کی.....؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں..... آج تک جتنے ملے سب ٹائم پاس والے ہی ملے کوئی شادی کے لئے راضی نہ ہوا....." وہ سر جھکا کر بولی۔

"شادی کر لو۔ اتنی لمبی زندگی اکیلے کیسے گزارو گی۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی جیپ سے اترتے ہوئے بولی۔

"آپ سے مل کر اچھا لگا..... کیا ہم کسی جگہ مل سکتے ہیں..... اگر آپ برا نہ منائیں تب.....!"

"ہاں..... کیوں نہیں..... آپ جب بھی ایزی ہوں..... مجھے بتایئے گا۔"

"ضرور.....!" وہ اپنے لمبے بالوں کو دلربا انداز سے سہلانے لگی..... اور مست چال چلتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ سرخ لباس میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ میری فرسٹ محبت تھی۔ پہلا پیار زندگی میں کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ میں آج بھی نائلہ کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کا احساس مجھے اس سے مل کر ہوا۔ کیونکہ اس سے ملتے ہی میری چاہت کی جو آگ راکھ میں دب چکی تھی وہ اچانک چنگاری بن کر بھڑک اٹھی تھی۔ وہ سہانی شام تھی میرے دماغ میں صرف نائلہ کا خیال تھا جو رومانس سے بھرپور تھا۔ وہ مجھے ہوٹل البرکہ میں ملی..... ملاقات کے لئے اس نے مجھے فون کیا تھا۔

"کامران..... تم فری ہو تو آج شام مجھ سے مل سکتے ہو؟"

وہ میٹھے اور دلربا انداز میں بول رہی تھی کہ میرا دل خود بخود کھنچا چلا گیا۔ میں نے فوراً ہی ملنے کی حامی بھر لی۔

"ضرور..... تم بلاؤ اور میں نہ آؤں..... یہ ممکن ہی نہیں..... کہاں ملنا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"شام سات بجے..... ہوٹل البرکہ میں، میں تمہارا انتظار کروں گی۔ آؤ گے ناں.....؟" وہ لاڈ سے بولی۔

"ہاں..... ضرور آؤں گا....." میری زبان سے خود بخود لفظ نکلتے چلے گئے۔

"گڈ بائے..... سویٹ ہارٹ..... آئی ول

ویٹ....." اس نے آخر کے الفاظ کچھ زیادہ ہی شیرین انداز سے ادا کئے کہ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔

"او کے..... آئی ول کم....." میں نے کہا۔ لیکن رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

وہ دن میں نے صرف انتظار میں گزارا۔ آفس میں وقت کا احساس نہ ہوتا تھا لیکن اس دن جیسے وقت رک گیا تھا اور میرا دماغ بار بار بوجھل ہوا جاتا تھا۔ میں ہر دفعہ گھڑی کی مدھم چلتی سوئی کو دیکھتا اور بے چین ہو جاتا..... میں نے سارے کیس فائل بند کر کے الماری میں رکھوا دیئے اور شام جلدی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

کہتے ہیں انتظار موت سے شدید تر ہوتا ہے شدید ترین انتظار کے بعد ہی شام اتری۔ میں نے آفس سے ملحقہ اپنے سرکاری کوارٹر میں جا کر خوب تیاری کی۔ تھری پیس سوٹ نکالا..... اور سرخ ٹائی لگا کے گاڑی سڑک پر لے آیا۔

میرے دماغ میں صرف نائلہ کا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اتنی محبت تو مجھے شروع کے دنوں میں بھی نائلہ سے نہیں ہوئی تھی جب وہ مجھے ملی تھی۔

محبت ایک مرتبہ پھر میرے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ وہ میرے رگ و پے میں دوڑتے خون میں روح کی مانند تھی روح کے بغیر جسم بے کار ہے اس طرح نائلہ نے بھی ایک روح کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور میں ہوٹل البرکہ میں جا پہنچا۔

محبت کا یہ عالم میرے لئے حیران کن تھا کیونکہ نائلہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کا حسن مزید نکھر گیا تھا اس کے گلابی ہونٹوں نے میری اندرونی کیفیت کو اتھل پتھل کر دیا۔

"کامران ڈارلنگ..... تم بہت ہینڈسم ہو۔ نہ صرف ہینڈسم ہو بلکہ دل کے بھی بہت اچھے ہو....." وہ اپنی آنکھوں کے اشاروں سے میرے ہوش اڑائے جا رہی تھی۔

دیکھو!!

چاند کی ٹھنڈک دیکھو، سورج کی تپش دیکھو، مشرق کی سفیدی دیکھو، مغرب کی لالی دیکھو، شام کے پرندوں کی غوں دیکھو، کوئل کا نغمہ سنو، بلبل کا گیت سنو، چڑیا کی چہک سنو، سانپ کی پھنکار سنو، عقاب کی اڑان دیکھو، پتنگے اور پروانے کو اڑتا دیکھو، تتلی کو پکڑ کر اس میں چھپا پرنٹ دیکھو، ناچتے ہوئے مور کا نخرہ دیکھو اور اس کے پروں پر چھپا پرنٹ دیکھو، سمندر کی تہہ میں اتر کر اس میں حسین و جمیل مچھلیاں دیکھو، گلاب کو دیکھو کیسے سرخ لباس میں ہے، چنبیلی کو دیکھو کیسی سفید پوشاک میں ہے، اس کی مہک کو دیکھو، آم کی مٹھاس دیکھو، کریلے کی کڑواہٹ دیکھو، کیلے کا تہہ بہ تہہ لگنا دیکھو، ناریل کا بلند درخت پر لگنا دیکھو، اس میں پانی کا بھرنا دیکھو، دودھ کا دہی میں بدلنا دیکھو، دہی کا مکھن میں بدلنا دیکھو، مکھن کا گھی میں بدلنا دیکھو، آسمان سے برستی بارش دیکھو، پہاڑوں پر برف کو گرتا دیکھو، سورج سے اسے پگھلتا دیکھو، پھر ندی اور نالوں میں اسے چلتا دیکھو، چشموں کا جھرنا دیکھو اور ان کا ابلتا دیکھو، پانی کی آبشاریں دیکھو اور پانی کی روانی دیکھو، پہاڑوں کی سختی دیکھو، زمین کی کثافت دیکھو، ہوا کی لطافت دیکھو، اپنی آنکھوں کے بلب دیکھو، اپنے کانوں کا ٹیلیفون دیکھو، اپنے دل کی دھڑکن دیکھو، اپنی زبان کا بولنا دیکھو، اپنے جگر گردے دیکھو، سر سے پاؤں تک اپنے آپ کی کاریگری دیکھو، اس کی قدرت دیکھو، اس کی تخلیق دیکھو، یہ سب دیکھ کر بھی تجھے اللہ کا یقین نہیں آیا کہ اللہ ہے، تو اللہ نے مجھے کیو بنایا، ناچنے کے لئے، گانے کے لئے، دوسروں کا حق مارنے کے لئے، دولت کدہ میں محوِ خواب رہنے کے لئے..... تجھے تو اشرف المخلوقات بنایا..... مگر مگر تو اپنا ہی پجاری بن بیٹھا۔

(احسان سحر۔ میانوالی)

"تمہاری تعریف میں کیا کہوں۔ میں تو یونیورسٹی سے ہی تمہارے عشق میں ڈوبا ہوا ہوں۔"

"تم اس دور کو یاد مت کیا کرو..... میں نے تم سے بہت زیادتی کی تھی اس دور میں..... تم آج کی بات کرو۔ جب میں تمہارے بہت قریب ہوں۔" وہ انداز دلربائی سے بولی۔

"تم قریب ہو تو لگتا ہے جیسے زندگی کے سارے رنگ ایک مرتبہ پھر واپس لوٹ آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر تم چاہو تو یہ لمحے ہمیشہ کے لئے تمہارے ہو سکتے ہیں۔" تم چاہو تو تم مجھے اپنا ہم سفر بنا سکتے ہو....." وہ بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟ مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ میری محبت مجھے ایک مرتبہ پھر اس خوبصورت انداز میں ملے گی..... اور مجھے پرپوز کردے گی۔ کیا یہ حقیقت ہے....." میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"یہ سب حقیقت پر مبنی ہے تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں نے اپنی تقدیر کا فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں دے دیا ہے چاہو تو ایک بے بس، کمزور عورت کو ماضی میں کی گئی غلطیوں کی سزا دو چاہو تو اپنی محبت سمجھ کر گلے سے لگالو۔" وہ بولی۔

"تم میری ہو صرف میری..... ماضی کو دہرانا مناسب نہیں..... زندگی میں سرد، گرم دن آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں دنیا والوں کی طرح ظالم بن جاؤں۔"

نائلہ اور میں، زندگی کے نئے دور میں قدم رکھنے کے لئے تیار ہو گئے تھے..... نائلہ نے مجھے رومانس کی نئی دنیا سے متعارف کرایا۔

میری ہر شام نائلہ کے نام رہتی۔ میرا فرض لوگوں کی حفاظت کرنا تھا مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا سچ اور جھوٹ کو بے نقاب کرنا تھا ظلمت کے اندھیرے میں جگنو بن کر روشنی پھیلانا تھا۔

لیکن جب سے نائلہ کا وجود میری زندگی میں آیا تھا میرے سارے فرض خاک میں مل گئے تھے۔ میں فرض سے غافل صرف شام ہونے کا انتظار کرتا تھا جہاں نائلہ کا حسین جسم ہوتا اس کی گدگداتی بانہیں مجھے دنیا جہاں سے غافل کردیتی وہ ہر شام اپنے گھر کے دروازے پر سرخ لباس پہنے میری منتظر ہوتی..... میں بے قرار سا اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کا دباؤ ڈال دیتا سرور و مستی اور لطف ولذت کے مسحور کن دور کے بعد نائلہ سے اجازت لیتا اور اپنے اپارٹمنٹ آجاتا۔

میرے سارے کولیگ میری غفلت اور بے چینی سے پریشان تھے۔ وہ محسوس ضرور کرتے تھے لیکن کبھی شکایتوں کو زبان پر نہ لاتے تھے۔

پہلے پہل تو نائلہ سے ملاقات صرف شام کے وقت ہوتی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ نائلہ اور میری جنسی خواہشات بڑھتی چلی گئیں..... وہ مجھے دوپہر کے وقت اپنے گھر بلالیتی اور میری بانہوں میں سما کر اپنا سب کچھ وار دیتی۔ نائلہ مدہوش رہتی تھی اس کی آنکھوں میں پیاس رہتی تھی ایسی خوف ناک پیاس جو بڑھتی ہی چلی جاتی تھی اس کی ہیت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دن میں تین دفعہ مجھے اپنے گھر بلاتی تھی اور ہر دفعہ مقصد صرف جنسی پیاس کو ٹھنڈا کرنے کا ہوتا تھا۔

میری حالت ایک بدمست گھوڑے جیسی تھی جو ہوش و عقل سے بیگانہ ہو کر صرف مالک کی چابک دستی پر سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے نائلہ کا جادو میرے دل و دماغ پر گہرائی تک اثر کر چکا تھا۔ وہ ایک ماہر ہپناٹائز تھی۔ جو میرے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھنے لگی تھی۔

ایک شام جب وہ میرے بہت قریب کھڑی تھی اور اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی میرے ہوش اڑے جارہے تھے میں اسے اپنی بانہوں میں لینے کے لئے بے قرار سا ہو گیا تھا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پرے کیا اور بولی۔

"کامران..... تم مجھ سے شادی کرو گے؟ بولو.....؟" اس کا انداز دلربا تھا۔

"ہاں..... شادی تو کرنی ہے اور صرف تم سے

....." میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"کب کرو گے مجھ سے شادی.....؟" وہ میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور بولا۔ "جب تم چاہو گی۔"

"اسی ہفتے میں ہم دونوں شادی کریں گے تم تیاری کرلو..... مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا ڈارلنگ....." وہ اپنی حسین کلائیوں سے میرے چہرے کو پیار سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"اوکے..... اور حکم..... امیں نے کسی غلام کی طرح جواب دیا..... تو نائلہ میرے اندر سمانے لگی اور میں مدہوش ہونے لگا اور ہم جذبات کے طوفانی تھپیڑوں میں ڈبکیاں لگانے لگے۔

وہ ایک ڈارک روم تھا جہاں ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہ دے رہا تھا۔ میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے ایک بلیک تابوت کو کمرے کے وسط میں رکھے پایا۔ وہ ایک مضبوط لوہے کا تابوت تھا جس کے کناروں پر پرانی طرز کے نقش ونگار کندہ کئے گئے تھے البتہ تابوت کے مضبوط لوہے کے ڈھکن پر ایک سانپ کی تصویر نقش کی گئی تھی۔ وہ ایک زہریلا ناگ تھا جس نے پھن پھیلا رکھا تھا اور اس کی زہریلی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

ابھی میں تابوت پر موجود دوسری چیزوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک سے تابوت کا ڈھکن کھلا اور خود بخود اوپر اٹھتا چلا گیا۔ تاریکی اور موت جیسی خاموشی جیسے ماحول میں اچانک سے تابوت کے ڈھکن کا اوپر اٹھنا اور پھر ڈھکن کے چرچرانے کی آواز پیدا ہونے سے سکوت ٹوٹ گیا تھا۔

اگلا منظر حیران کرنے والا تھا وہاں ایک زندہ لاش تھی جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی البتہ نچلا دھڑ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک عورت کا جسم تھا جو گل چکا تھا۔ اور ہڈیاں کالے سرمے کی طرح سیاہ ہو چکی تھیں۔ البتہ چہرہ پرنقاب تھا اور صرف آنکھیں واضح تھی جو کھلی ہوئی تھی یہ منظر میرے لئے دہشت ناک تھا۔

میں ایک جیتا جاگتا انسان تھا جس کے دل میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا انسانی دل اس قسم کے مناظر دیکھنے کے بعد اپنی دھڑکن میں اضافہ کردیتا ہے میرا دل زوردار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

پھر ایک اور عمل وقوع پذیر ہوا چہرے سے نقاب ہٹنے لگا..... کالا نقاب مکمل طور پر چہرے سے اتر گیا تو جو شکل میرے سامنے آئی وہ ناقابل یقین تھی وہ سعدیہ تھی میری یونیورسٹی فیلو..... وہ اچانک تابوت سے اٹھ بیٹھی تھی اور زوردار چیخ برآمد ہوئی تھی سعدیہ نے اپنے ہڈیوں نما ہاتھ برق رفتاری سے میری طرف بڑھائے اور میری گردن کو جکڑ لیا۔ میری گردن اس کے شکنجے میں آگئی تھی..... اس کی گرفت بڑھتی چلی جارہی تھی۔

"میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی..... تم میرے ہی ہاتھوں مرو گے۔" وہ چیخی تھی اور خوف ناک آواز میں بول رہی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے ایک زوردار چیخ ماری اور خواب سے بیدار ہو گیا..... میرا جسم مکمل طور پر پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور خوف و دہشت کی وجہ سے سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میں نے خواب دیکھا تھا جس نے میری روح تک ہلادی تھی۔ میری سانس انتہائی بے قراری سے چل رہی تھی میں نے پانی کا گلاس حلق میں انڈیلا تو جسم میں کچھ جان آئی میں نے اپنے حواس کنٹرول میں کئے اور لائٹ آن کردی..... کمرے میں روشنی نے مجھے نئی طاقت دی۔

میں بیڈ پر نیم دراز ہونے لگا تھا کہ مجھے اپنی گردن پر درد محسوس ہونے لگا۔ میں نے گردن کو ہاتھ سے سہلانے لگا لمحہ حیران کن تھا میرے ہاتھ میں خون تھا۔ وہ سرخ گاڑھا خون تھا یک لخت آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا میری عقل دنگ رہ گئی میری گردن پر ناخنوں کے زخم تھے۔ جہاں سے خون رسنے لگا تھا۔ میرے

سامنے تابوت میں قید سعدیہ کی لاش آ گئی جس نے خواب میں میری گردن دبوچ لی تھی۔ لیکن وہ تو خواب تھا حقیقت سے کیا تعلق۔ لیکن زخم کے نشان تو حقیقی تھے۔ اور خون بھی سچائی پر مبنی تھا...... مطلب کوئی حقیقت میں میرے کمرے میں آیا تھا...... وہاں کون آیا تھا؟ سعدیہ...... ایک مظلوم سا کردار مگر اس حالت میں کیوں؟

سعدیہ کا کردار آگے جا کر واضح ہوگا یہ اس کہانی کا اہم کردار ہے اس کے بغیر کہانی نامکمل ہے۔

☆......☆......☆

وہ سہانی شام تھی۔ نائلہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے گھر آ گئی۔ ہم نے باقاعدہ شادی کر لی تھی مگر ایک بات بتاؤں...... میں دل سے پریشان تھا۔ میرے دل میں ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا۔ دہشت ناک سا ،خوف ناک سا، انجانا سا خوف میرے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی محبت کو حاصل کر لیا تھا۔ نائلہ سے بے پناہ چاہت کے بعد اسے حاصل کرنے کے بعد میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ نائلہ میری شریک حیات بن چکی تھی اچھی تھی خوبصورت بیوی مل گئی تھی زندگی کو ہنسی خوشی گزارنا چاہئے تھا۔ لیکن میرے ساتھ سہاگ رات میں جو کچھ ہوا وہ خوف ناک تھا۔

نائلہ عروسی لباس میں بیٹھی ہوئی تھی حالانکہ ہم دونوں نے اس رات کے لئے بے تاب وقت گزارا تھا گو کہ ہم ایک دوسرے کے جسم اور لطف و سرور کی چاشنی سے باخبر تھے۔ لیکن آج کی رات کی بے تابی پھر بھی قائم تھی۔

میں نے محبت بھرے دل موہ لینے والی باتوں سے اس رات کا آغاز کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ گھونگھٹ اٹھا دیا...... نائلہ آج شرم و حیاء کا پیکر بنی بیٹھی تھی...... اس کی نگاہیں نیچی تھی اور آج وہ پہلے سے زیادہ حسین نظر آنے لگی تھی...... میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی ٹھوری کو اوپر اٹھایا اور میرے ہوش اڑ گئے۔

کیونکہ وہ سعدیہ تھی نائلہ کی شکل معدوم ہوگئی تھی اب وہاں سعدیہ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں بیڈ سے نیچے اتر گیا تھا وہ میری طرف بڑھنے لگی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ میں واضح اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''تم کون ہو؟ اور کیا چاہتی ہو؟'' میرا دماغ ایکدم سے مفلوج ہو گیا تھا۔

بھول گئے اتنی جلدی مجھے...... یعنی سعدیہ کو...... تم نے مجھے ہر جگہ ذلیل کیا مجھے اگنور کیا...... میری محبت کا مذاق اڑایا۔ میرے دل کے ٹکرے ٹکڑے کئے...... وہ میری طرف بڑھنے لگی اور پھر سسکنے لگی تھی اس کے انداز سے کچھ واضح نہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔

میں ایک دفعہ پھر ماضی کی دھندلی کتاب میں کھو گیا۔ وہاں تین کردار تھے کامران میں خود، نائلہ میری محبت اور سعدیہ جس نے ہر دفعہ مجھے پیار دیا...... سعدیہ کا پیار مثالی تھا وہ میری یونیورسٹی فیلو تھی۔ عام سے نقوش والی متوسط فیملی سے تعلق تھا ذہین اور نفیس لڑکی...... ہم دونوں کا سبجیکٹ ایک ہی تھا۔ میری اس سے پہلی ملاقات لائبریری میں ہوئی تھی پھر کچھ لیکچرز بھی ایک ساتھ تھے وہ میرے ساتھ بیٹھتی۔ بہت سے ٹاپک ایک ساتھ ڈسکس کرتے...... دوستی کے بعد بے تکلفی بڑھتی چلی گئی نجانے کیوں سعدیہ کو لگا کہ جیسے میں اس سے پیار کرتا ہوں اس سے بے خبر کہ میں نائلہ کو پسند کرتا تھا یہ دوسری بات تھی کہ نائلہ نے ہمیشہ مجھے نظر انداز کیا تھا میں نے نائلہ کو پرپوز کیا لیکن اس نے میرا خوب مذاق اڑایا انہی دنوں سعدیہ نے مجھے پرپوز کر دیا۔

''تم خود کو فلمی ہیروئن سمجھتی ہو۔ شکل دیکھی ہے اپنی...... گھر میں آئینہ نہیں تو کسی ہیئر ڈریسر پر جا کے اپنی شکل دیکھو...... ایک ہینڈسم لڑکا دیکھا تو اس پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیئے۔'' یہ سن کر سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

''آئی ریئلی لو یو کامران...... پلیز مجھے اگنور مت کرو۔ میں تمہاری زندگی میں غلام بن کر رہ سکتی تھی...... میں چلی جاؤں گی تم سے دور...... مگر پلیز مجھے اس طرح اگنور مت کرو...... میری محبت کو مت ٹھکراؤ۔'' وہ رونے لگی تھی۔ لیکن مجھے عورت ذات سے شدید نفرت سی ہوگئی

تھی لیکن نائلہ کی محبت نے مجھے اندھا کر دیا تھا میں نے نائلہ کا سارا غصہ اور نفرت سعدیہ پر نکالا۔

سعدیہ نے مجھے کتنے ہی لیٹرز لکھے رو رو کر شکایتیں کی۔

''کامران ...... محبت کو سائیڈ پر رکھو۔ ہم دوست بن کے تو رہ سکتے ہیں پلیز دوستی سے انکار مت کرو۔'' وہ بولی۔

''تم لڑکیاں دوستی کے قابل بھی نہیں ہوتیں...... اور پلیز! مجھے آئندہ فون مت کرنا......'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم سمجھتے ہو ساری لڑکیاں نائلہ جیسی ہوتی ہیں اوکے...... تم خوش رہو میں دعا کروں گی کہ تمہیں نائلہ ضرور ملے۔'' وہ یہ کہہ کر سسکتی ہوئی چلی گئی۔

پھر میرا سعدیہ سے بہت کم واسطہ پڑنے لگا وہ اداس اور اکیلی رہنے لگی تھی ادھر مجھے صرف نائلہ سے سروکار تھا۔ لیکن نائلہ کا عشق کسی دوسرے لڑکے سے چل رہا تھا...... فائنل سمسٹر کے بعد سب کی پریکٹکل لائف اسٹارٹ ہوگئی...... اور پھر کسی سے رابطہ نہ ہوا۔

آج ایک عرصہ بعد سعدیہ اور نائلہ کے گمشدہ کردار میرے سامنے آ گئے تھے۔ سعدیہ کا خواب میں آنا اور نائلہ کا مجھ سے محبت کے بعد شادی کرنا، پھر نائلہ کا اچانک سعدیہ بن جانا...... سب کچھ حیران کن تھا۔

اس وقت سعدیہ میری طرف بڑھنے لگی تھی اس کا انداز جارحانہ تھا...... جیسے مجھے مار ڈالنا چاہتی ہو...... سعدیہ کا یہ قاتلانہ روپ آج کیونکر اور کیسے؟

میں نے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ میں نے سرخ لباس میں اپنے پیچھے ایک چڑیل کو دیکھا...... میں نے ایک نظر پھر اسے رک کے دیکھا۔

وہ ایک خوف ناک شکل اختیار کر چکی تھی اس کا نچلا حصہ بلیک جلی ہوئی ہڈیوں جیسا تھا اور شکل سعدیہ کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون سے رنگی ہوئی تلوار تھی اور اس سے خون ٹپک رہا تھا میں روڈ پر آ گیا تھا۔ روڈ سنسان تھی میں دوڑ رہا تھا اپنی پوری طاقت سے۔

سعدیہ نے آج مجھے مار کے ہی چھوڑنا تھا۔

کون نائلہ تھی اور کون سعدیہ؟ آخر یہ چکر کیا تھا کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

میری رفتار بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک مجھے زوردار دھکا لگا اور میں منہ کے بل روڈ پر جا گرا۔ مجھے رات میں ستارے تو صاف نظر آ رہے تھے لیکن اب تو خفیہ سیارے بھی دکھائی دینے لگے تھے اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا اور میں سعدیہ کے رحم و کرم پر روڈ کے کنارے بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

جب دماغ میں جگنو سا چمکا اور مجھے ہوش آیا تو میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں وہ ایک سادہ سا مگر صاف ستھرا سا کمرہ تھا جس کی مرمت کچے گارے سے کی گئی تھی اور وہاں ٹھنڈک تھی میرے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھی میں نے کمرے کا جائزہ لیا وہاں ضروریات زندگی کا سادہ سا سامان موجود تھا۔ میں جس چارپائی پر سویا ہوا تھا وہ کھجور کی چھال کی تھی البتہ میرے سرہانے تکیہ اور پاؤں پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ فی الحال تو یہ جگہ نامعلوم تھی لیکن وہاں سکون تھا۔ دل مطمئن تھا غرض وہاں میری کیفیت اطمینان بخش تھی۔

میرے ہوش میں آنے کے چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور پیر فرمان علی شاہ اندر داخل ہوئے۔ وہ ہمارے خاندانی پیر تھے میں نے تعظیماً چارپائی سے کھڑا ہونا چاہا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔

''تمہارے زخم ابھی تازہ ہیں بیٹا...... لیٹے رہو۔ مطمئن رہو تم اب محفوظ ہو۔'' وہ محبت بھرے انداز میں بولے تو میں تکیہ کے سہارے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری اب بیٹا......؟'' انہوں نے پوچھا۔

بہت بہتر باباجی...... مگر میں یہاں کیسے پہنچا؟''

''ایک بدروح نے تمہارا کام تمام کر دینا تھا اگر ہم وہاں سے نہ گزر رہے ہوتے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی ورنہ وہ بدذات تمہیں مار ڈالتی۔''

www.aiourdubooks.net

میرا سر شرم سے جھک گیا۔ ''بابا مجھے شرمندگی ہے کہ مجھ سے جو کچھ پچھلے دنوں سرزد ہوا.....''

''ہم جانتے ہیں..... وہ بدذات تمہیں مار ڈالتی کچھ دعائیں تمہارے کام آ گئیں..... اور اللہ سے توبہ کرو۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے انسان بھٹکتا ہے پٹڑی سے اتر جاتا ہے مگر جب آنکھیں کھل جائیں تو معافی مانگ لینی چاہئے۔ اللہ بزرگ و برتر معاف کر دینے والا ہے۔''

☆.....☆.....☆

میں نے اپنے منصب کو مکمل طور پر Positivc استعمال کرنے کا عہد کیا میں نے نائلہ کے گھر کا وزٹ کیا لیکن وہاں جا کے حیرت ہوئی اس کے والدین زندہ تھے لیکن نائلہ کا سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ نائلہ کی شادی ہو گئی تھی لیکن شادی کے دو سال بعد اسے طلاق ہو گئی پھر ایک رات وہ اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی اور اسے پرانے قبرستان کے شمال میں ہی دفن کیا گیا تھا۔

میں اے ایس آئی اور حوالدار سمیت نائلہ کی قبر پر پہنچا وہاں نائلہ کے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا اور قبر کا تعویز ٹھیک ٹھاک تھا۔

میں نے گورکن کو بلایا۔

''کیا تمہیں یاد ہے، تم نے اس قبر کو کھودا تھا اور ہماری نگرانی میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور اس قبر میں سے ایک زندہ لڑکی برآمد ہوئی تھی؟''

گورکن نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

''سر..... عرصہ دراز سے اس قبرستان میں کام کر رہا ہوں ایسا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا نہ ہی کبھی آپ آئے اور نہ ہی یہ قبر کھودی گئی۔'' گورکن نے جواب دیا۔

میں نے حیرت سے اے ایس آئی کو دیکھا۔

''تمہیں تو یاد ہو گا..... کچھ..... تم میرے ساتھ تھے۔'' میں نے اے ایس آئی سے کہا۔

''سر..... میں تو نہیں آیا تھا یہاں.....'' وہ بھی مکر گیا۔

حیرت کا جھٹکا مجھے لگا کیونکہ کسی کو کچھ یاد نہیں تھا۔

حالانکہ نائلہ کی قبر کشائی کے وقت یہ سب میرے ساتھ تھے اور اب انکار کر رہے تھے۔

میں نے قبرستان کے وزٹ کے بعد سعدیہ کے گھر کی راہ لی وہاں بھی کچھ الگ کہانی تھی۔

میں نے سعدیہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں وہ حیرت انگیز تھی۔

سعدیہ نے اسٹڈی کے بعد اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا اس کی سہیلیوں نے یہ بات بتائی کہ وہ کسی کامران کو مسخر کرنے کے لئے جادو سیکھ رہی تھی وہ اپنے کمرے میں ہر وقت اندھیرا رکھتی اور کوئی خاص عمل کرتی رہتی۔ کچھ خاص تو پتہ نہ چل سکا البتہ ایک رات عمل کرتے ہوئے اس کی موت ہو گئی اس کی لاش اس کے کمرے سے ملی جو کافی مسخ ہو چکی تھی لیکن اس کا چہرہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ بہت کوششوں کے بعد اسے دفن کیا گیا لیکن اسکی روح گھر کے ارد گرد کئی دفعہ دیکھی گئی تھی۔

سعدیہ کے گھر سے بہت سے خط بھی برآمد ہوئے تھے جس کے متن کچھ یوں تھے۔

کامران..... تم سے انتقام ہر صورت لوں گی میرا عمل مکمل ہو جائے گا..... نائلہ کے روپ میں، میں تم سے انتقام لوں گی۔ تم نے مجھے ذلیل کیا میں مرنے کے بعد بھی تمہیں نہیں بخشوں گی۔'' اور بھی اسی قسم کے خطوط ملے۔

وہ میرے عشق میں بالکل ہی پاگل ہو گئی تھی اور کسی عامل سے جادو ٹونہ کرانے گئی تھی۔ اور پھر خود بھی جادو سیکھنے لگی، مگر افسوس کہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ دونوں کے دھڑ مردہ ہو چکے تھے مگر میری زندگی کے چند دن رنگین ہو گئے تھے لیکن دامن آلودہ بھی ہوا تھا۔ خیر میں نے گڑگڑا کر توبہ کی کیونکہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ویسے میری بھی موت یقیناً تھی مگر بھلا ہو بابا فرمان شاہ کا کہ جنہوں نے مجھے اس عفریت سے نجات دلائی۔

عفریت

ایس حبیب خان۔ کراچی

خاموش بیٹھی ہوئی لڑکی نے اچانک اپنا سر پٹخنا شروع کر دیا پھر اس کے جسم سے جلتا ہوا ایک ہیولہ نکلا اور چنگاریاں بن کر ہوا میں بکھر گیا، فضا میں ہزاروں چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگی کہ.....

خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی خونی کہانی جس نے قرب و جوار کے لوگوں کو تھرا کر رکھ دیا

جے نا کار کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جبکہ اس کی جان اس کا ننھا ٹومی اپنا ایک پنجہ جے نا کی ٹانگ پر رکھے اس کے برابر میں سو رہا تھا ایڈگر فیملی تین لوگوں پر مشتمل تھی۔ جے نا ایڈگر، اس کی مام بینا ایڈگر اور ڈیڈ مچل ایڈگر، ان کی رہائش برطانیہ کے شمالی علاقہ چیسٹر میں تھی اور وہ چھٹیاں گزارنے فارم ہاؤس جا رہے تھے جو ان کے علاقے سے کافی دور تھا اور انہوں نے اسے بک کروایا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا ملازم ڈیوڈ بھی تھا۔

جے نا نے سولہویں سال میں قدم رکھ دیا تھا مگر اس سنہری بال اور نیلی آنکھوں والی معصوم گڑیا کی حرکتیں اب بھی بچگانہ تھیں دیگر ٹین ایج لڑکیوں کے برعکس اس میں کوئی فضول عادت نہ تھی اسموکنگ، لیٹ نائٹ گیدرنگ، موویز کچھ بھی نہیں، اس کا وقت یا تو ٹومی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKURDUBOOKS.NET

کے ساتھ گزرتا یا کتابیں پڑھنے میں باہر کی تازہ ہوا لگنے سے جے نا کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بک چھوٹ کر اس کی گود میں گر گئی جو وہ باہر دیکھنے سے پہلے پڑھ رہی تھی۔ اس کے سامان میں پورا ایک بیگ بکس سے بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کی مام ہینا نے چلنے سے پہلے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ وہاں انجوائے کرے۔ بکس تو وہ یہاں پڑھتی ہے ہی مگر جے نا نے پھر بھی اپنی بکس ساتھ لے لیں تھیں۔

ہینا نے اس کی گود سے بک اٹھالی۔ جب وہ لوگ فارم ہاؤس پہنچے تو دوپہر ہوگئی تھی حالانکہ وہ صبح سات بجے نکل گئے تھے۔ فارم ہاؤس لگژری تھا جس کے سامنے ایک خوب صورت جھیل تھی۔ جہاں بوٹنگ ہوتی تھی، بیک یارڈ میں چھوٹا سا گارڈن بنا ہوا تھا۔ وہاں بہت بڑا جھولا بھی لگا ہوا تھا۔

جے نا کی آنکھ کھل گئی۔ پھر وہ لوگ اندر چلے گئے ان لوگوں نے پیک کھانے کو گرم کر کے لنچ کیا اور اپنے اپنے رومز میں آرام کرنے چلے گئے جے نا تھوڑی دیر اپنے کمرے میں لیٹی مگر اسے نیند نہ آئی کیونکہ وہ راستے میں کافی دیر سو گئی تھی۔ ٹومی اس کے ساتھ ہی بستر میں سویا ہوا تھا جے نا نے پیار سے ٹومی کے سر کو کھجایا، اس نے کسمسا کر آنکھ کھولی پھر دوبارہ موندھ لیں جے نا نے اسے سونے دیا اور خود روم سے باہر نکل آئی۔

شام ہو رہی تھی وہ سارے فارم ہاؤس کا جائزہ لینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ جے نا نے ٹومی کو پیچھے سے لگا کر خوب پیار کیا جواب میں ٹومی نے بھی اپنی ننھی زبان سے جے نا کی ٹھوڑی کو چاٹ کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ جے نا ٹومی کو لے کر بیک یارڈ کی طرف چلی گئی۔ فارم ہاؤس ختم ہونے پر سامنے سڑک تھی جس کے دوسری طرف درخت ہی درخت تھے۔ درخت بے حد گھنے اور بڑے بڑے تھے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک جے نا کو درختوں میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جیسے کہ کوئی کھڑا ہو۔

''جے نا! آجاؤ بیٹا۔'' مام نے آواز دی تو جے نا ٹومی کو لے کر اندر چلی گئی۔ وہاں اسے ایک خوب صورت عورت اور چھوٹا بچہ نظر آئے، بچہ پانچ سال کا ہوگا وہ لوگ برابر والے فارم ہاؤس سے آئے ہوئے تھے۔ خاتون نے اپنا تعارف لوسی اور بچے کا مائیکل کے نام سے کروایا جو اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔

''ہیلو!'' جے نا نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ماں بیٹے اکیلے تھے۔ لوسی کا شوہر اس دنیا میں نہیں تھا اور وہ جاب کر کے اپنا اور مائیکل کا پیٹ پال رہی تھی۔ اس کی پوسٹ کافی بڑی تھی اس لئے مالی لحاظ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی، وہ بھی چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ اور کچھ روز میں مائیکل کے انکل اور ان کی فیملی ان دونوں کو جوائن کرنے والی تھی۔

لوسی نے بتایا کہ ''مائیکل کو تو یہاں آنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ یہاں اس کے مطلب کا کچھ خاص نہیں ہے جبکہ میں شہر کے ہنگامے سے دور رہ کے کچھ وقت پرسکون انداز میں گزارنا چاہتی ہوں۔''

جے نا کو مائیکل پر ترس آیا اس لئے اس نے مائیکل سے دوستی کرنے کا ارادہ کیا۔ حالانکہ وہ اس سے عمر میں کافی چھوٹا تھا۔

جے نا جھولے میں بیٹھی جھولا جھول رہی تھی اور ٹومی اس کی گود میں تھا۔ ''ہائے جے نا!'' مائیکل نے اپنے فارم ہاؤس کے حصے سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ بیچ میں لکڑی کی باڑ لگی ہوئی تھی۔

''ہیلو! وہاں کیوں کھڑے ہو یہاں آجاؤ مائیکل!'' جے نا نے مسکراتے ہوئے اسے کہا تو مائیکل لکڑی کی باڑ پر چڑھا اور اسے پھلانگ کر دوسری طرف کود کر آ گیا۔

جے نا نے مائیکل کو اپنے برابر میں جھولے پر بٹھالیا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ ''مائیکل تم کتابیں پڑھتے ہو؟''

''نو!'' مائیکل نے کہا۔

''کامک؟'' جے نا نے پوچھا۔

''نو!'' مائیکل نے ناں میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

تو پھر تمہارا فیورٹ گیم کیا ہے؟'' جے نا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میں تو اپنے ٹرک میں مٹی بھر کر لاتا ہوں اور پھر ان سے گھر بناتا ہوں۔'' مائیکل نے اسے اپنے فیورٹ کھیل کے بارے میں بتایا تو جے نا مسکرا دی۔

''کیا ہو رہا ہے بچو؟'' لوسی نے آ کر پوچھا۔ ''ہم باتیں کر رہے تھے۔''

''بچو آر بوٹنگ کرتے ہیں!'' مچل ایڈگر نے کہا وہ لوسی اور ہینا سب ساتھ میں تھے۔

جے نا جھٹ جھولے سے اتر گئی اور مائیکل سے بولی۔ ''آجاؤ مائیکل مزہ آئے گا۔''

''نہیں تم لوگ جاؤ میں کھیل رہا ہوں۔'' مائیکل بولا۔

''مائیکل چلو! تم انجوائے کرو گے۔'' مچل ایڈگر نے اسے فورس کیا۔

''تھینکس انکل! میں یہیں کھیلوں گا۔'' مائیکل نے صاف منع کر دیا۔

''چھوڑیئے اسے ہم چلتے ہیں۔'' لوسی نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ سب جھیل کی جانب چل پڑے وہاں کنارے پر کھڑی بوٹ میں وہ سب سوار ہو گئے۔ بوٹ اسٹارٹ ہوئی تو مائیکل انہیں ہاتھ ہلا کر بائے بائے کہنے لگا۔ بوٹ آگے بڑھ گئی تو مائیکل کود کر جھولے سے اتر آیا اور اپنے فارم ہاؤس سے اپنا ٹرک لے آیا پھر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائیں تو سامنے رکھے گملوں کے درمیان اسے کھرپی پڑی نظر آئی۔ مائیکل نے آگے بڑھ کر کھرپی اٹھائی اور ایک کونے میں بیٹھ کر زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔ کھودتے ہوئے ایک دم کھرپی اس کے ہاتھ میں لگی اور مائیکل کے ہاتھ سے خون نکل آیا۔ ''اوہ مام!'' مائیکل کے منہ سے درد سے آواز نکلی۔ خون زیادہ تیزی سے بہنے لگا اور پھر خون بہہ کر گڑھے میں جذب ہونے لگا۔

مچل ایڈگر، ہینا، لوسی اور جے نا واپس کنارے پر آ گئے۔ ابھی وہ بوٹ سے اترے بھی نہ تھے کہ ٹومی نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ ''کیا ہوا ٹومی۔'' جے نا نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا مگر وہ مسلسل بھونک رہا تھا اور ساتھ جے نا کی گود میں مچل رہا تھا۔ پھر وہ لوگ اتر کر فارم ہاؤس آئے قریب آنے پر انہوں نے دیکھا کہ مائیکل ایک کونے میں زمین پر پڑا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی زمین میں گڑھا بنا ہوا تھا اس کا کھلونا ٹرک موجود تھا۔

سب مائیکل کی جانب لپکے مگر جب انہوں نے اسے چیک کیا تو ان سب کے ہوش گم ہو گئے کیونکہ ''مائیکل مر چکا تھا۔''

لوسی نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا۔ ہینا اسے چپ کرا رہی تھی مگر وہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

مچل ایڈگر نے ڈاکٹر اور پولیس دونوں کو کال کر لیا۔ ڈاکٹر نے مائیکل کو چیک کیا اسے ایک خراش تک نہیں آئی تھی حتیٰ کہ اس کے ہاتھ پر کھرپی چبھنے کا نشان تک نہ تھا۔

مائیکل کی ڈیڈ باڈی کو پولیس اپنے ساتھ پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئی سب بہت افسردہ تھے خاص کر جے نا، اس کی آنکھوں کے آگے بار بار ننھا مائیکل آ رہا تھا۔

لوسی کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ مائیکل کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ چیخ چیخ کر رونے لگتی پھر کہتی۔ ''کاش میں مائیکل کی بات مان لیتی اور یہاں نہیں آتی تو آج مائیکل زندہ ہوتا۔''

ہینا نے اسے دوا کھلا کر سلا دیا۔ لوسی انہی کے فارم ہاؤس میں تھی۔

ادھر جے نا کا ٹومی بستر میں ڈرا ہوا چھپا بیٹھا تھا، جے نا کے آواز دینے پر بھی وہ باہر نہیں نکلا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی اور مائیکل کی موت کی وجہ اس کے دل کا بند ہونا تھی مگر سوال یہ تھا کہ مائیکل کا دل بند کیوں ہوا تھا۔ جبکہ وہ تو ایک صحت مند بچہ تھا۔ مائیکل کی ڈیڈ باڈی اسپتال کے سرد خانے میں رکھی ہوئی تھی ایڈگر فیملی مائیکل کے انکل کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

مائیکل کے والد کا چھوٹا بھائی روجر تھا۔ جیسے ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے انفارم کیا گیا وہ فوراً اپنی بیوی مارگریٹ اور بیٹی سارہ کے ساتھ پہنچ گیا۔ سارہ، جے نا کی ہم عمر تھی مگر اس کا انداز جے نا سے بالکل مختلف تھا۔ وہ دیگر عام لڑکیوں کی طرح رنگین مزاج تھی جے نا نے پہلے تو اس سے دوستی کرنے کا ارادہ کیا مگر اس کا انداز دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی اس کی اور سارہ کی دوستی چلنے والی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ جے نا نے کر لیا تھا مگر وہ اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔

نامی نے تو حد کر دی تھی وہ کھانے کے لئے بھی باہر نہیں نکل رہا تھا۔ مجبوراً جے نا نے اس کا برتن بستر پر رکھ دیا جسے نامی نے ڈرتے ڈرتے کھایا اور پھر بستر میں دبک گیا جے نا نے اسے نکال کر اٹھایا تو وہ اس کے سینے سے چمٹ گیا جے نا نے اسے خوب پیار کیا اور واپس بستر پر چھوڑ دیا۔ جے نا نے کپڑے سمیٹ کئے اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی اس کا ذہن اب بھی ننھے مائیکل کو سوچ رہا تھا۔

ایک دم اسے لگا دور سامنے کوئی کھڑا ہوا ہے جے نا نے غور سے دیکھنا چاہا مگر اسے سمجھ نہ آیا تو وہ اپنی دوربین اٹھا لائی اور اسے آنکھوں کے آگے لگایا۔ سامنے دور ایک لڑکا کھڑا تھا، بارہ، تیرہ سال کا وہ اشارے سے جے نا کو بلا رہا تھا۔ جے نا نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر ادھر ادھر دیکھا کہ شاید وہ کسی اور کو بلا رہا ہو۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا جے نا نے دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگائی تو وہ لڑکا اب بھی اسے اشارے کر رہا تھا۔ جے نا ڈر کے پیچھے ہٹ گئی اور کھڑکی بند کر دی اور بستر میں آ کر لیٹ گئی اس کے ذہن میں سوال گونج رہا تھا کہ آخر وہ کون ہے؟ اور مجھے کیوں بلا رہا ہے؟ جے نا خوف زدہ تھی اور پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

جے نا حسب معمول اپنی کتاب لے کر جھیل کے کنارے بیٹھی تھی۔ مائیکل کی آخری رسومات ادا کر دی گئی تھیں۔ مائیکل کی تدفین کے لئے انکل روجر خود گئے تھے۔ لیوی مارگریٹ اور سارہ یہیں تھے۔ دو دن بعد ان کی واپسی تھی۔

جے نا کتاب پڑھنے میں مگن تھی ایک دم اسے ناگوار بو کا احساس ہوا اور اسے کھانسی اٹھنے لگی۔ اس نے کھانستے ہوئے نظریں اٹھائیں تو اس کے برابر میں سارہ بیٹھی سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بنا رہی تھی۔ ''سارہ !تم اسموکنگ کرتی ہو؟'' جے نا نے حیرانی سے سوال کیا۔

''ہاں!'' سارہ نے لاپروائی سے شانے اچکائے اور دوبارہ سگریٹ ہونٹوں سے لگا لی۔ جے نا نے اس سے دوری کو بہتر جانا اور بولی۔ ''اف یو ڈونٹ مائنڈ! میں کہیں اور بیٹھ جاؤں، مجھے سگریٹ سے الرجی ہے!''

تو سارہ نے لاپراوئی سے کہا۔ ''ایز یو وش۔'' اور سگریٹ کو اپنی سینڈل سے مسل کر دوسری سگریٹ سلگائی جے نا وہاں سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس نے مڑ کر سارہ کو دیکھا تو وہ لائٹر اپنی جینز میں رکھ رہی تھی اسے جے نا کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی مطلب نہ تھا وہ اپنے آپ میں مگن تھی۔ جے نا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فارم ہاؤس کے مین گیٹ سے باہر آ گئی۔ وہ جگہ اسے پرسکون لگی تو گیٹ کے ساتھ اگی گھانس پر کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ کسی نے اس کا نام پکارا ہے ''جے نا!'' تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ سامنے گئی۔

وہاں روڈ کی دوسری سائیڈ پر وہی لڑکا کھڑا تھا جو اسے اشارے سے بلا رہا تھا جے نا اسے دیکھ کر ایک دم خوف زدہ ہو گئی اور بدحواسی میں اندر جانے کے بجائے سڑک پر بھاگنے لگی وہ بغیر دیکھے اندھا دھند بھاگ رہی تھی اور مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی کہ وہ لڑکا اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا، بھاگتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھا اور پھر جب وہ واپس سامنے مڑی تو خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ''اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹرک فل اسپیڈ سے آ رہا تھا۔'' اس سے پہلے کہ وہ جے نا کو ہٹ کرتا، جے نا کو زور سے دھکا لگا اور وہ سڑک کے کنارے گر گئی اور ٹرک دھواں اڑاتا گزر گیا۔

جے نا نیچے گری گہرے گہرے سانس لے رہی تھی پھر جے نا کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے نظر اٹھائی تو خوف سے زمین پر گھسٹتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔

اس کے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا۔ ''ڈرو مت جے نا!'' اس لڑکے نے نرمی سے کہا۔ مگر جے نا پیچھے ہٹتی رہی۔ ''جے نا اگر مجھے تمہیں نقصان پہنچانا ہوتا تو میں اس ٹرک سے تمہاری جان نہیں بچاتا۔'' لڑکے نے کہا تو جے نا رک گئی۔ بات اس کی سمجھ آنے لگی۔

وہ لڑکا اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اب جے نا کچھ نارمل لگ رہی تھی۔ ''مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے جو بے حد ضروری ہے۔'' اس لڑکے نے کہا۔

''تم کون ہو؟ اور مجھے کیسے جانتے ہو؟'' جے نا نے پہلی مرتبہ اس لڑکے سے بات کی۔

''میں تمہیں کیسے جانتا ہوں یہ چھوڑو بلکہ اپنے بارے میں بتاتا ہوں، میرا نام جیرڈ ہے۔''

''تم رہتے کہاں ہو؟'' جے نا نے پوچھا۔

اس کی بات پر جیرڈ خاموش رہا، پھر رک کر بولا۔ ''جے نا! تمہارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ اس لئے بیکار کی باتوں میں وقت برباد مت کرو۔''

''کیا مطلب میں سمجھ نہیں!'' جے نا حیرانی سے بولی۔

''میری بات دھیان سے سنو! جے نا، میں نے تمہیں پہلے بھی بتانے کی کوشش کی مگر تم نے میری بات نہیں سنی تم جہاں رہنے آئی ہو وہ جگہ.....''

''اوہ گاڈ! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' جے نا نے جھنجھلا کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''ش ش ش!'' جیرڈ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرایا۔ ''خاموشی سے سنو!'' پھر بولا۔ تقریباً سو سال پہلے کی بات ہے۔ یہاں ایک عورت آئی ڈیلفن، پتا نہیں یہ اس کا اصلی نام تھا یا اس نے لوگوں سے جھوٹ بولا تھا جانے وہ کہاں سے آئی تھی، بالکل جھکی ہوئی اور لمبا سا ہڈ والا چوغا پہنے ہوئے، اس کی آستینیں لمبی تھیں اور وہ زمین کو چھو رہا تھا اس نے اپنے آپ کو سب کے سامنے بے سہارا ظاہر کیا تو لوگوں نے اس پر ترس کھا کر اسے یہاں رہنے کی جگہ دے دی۔

وہ لوگوں کے کپڑے برتن دھو دیتی جس کے بدلے لوگ اسے پیسے دے دیتے۔ پھر اس نے سوپ بنا کر بیچنا شروع کر دیا اس کا سوپ لوگوں کو انتہائی لذیذ لگا اور جھٹ ختم ہو جاتا۔ اس کا سوپ ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔ مگر وہ سوپ صرف شام کو بیچتی دن میں وہ گھر سے بالکل نہ نکلتی۔ سب اس سے بہت خوش تھے سب اچھا چل رہا تھا۔

کہ ایک روز علاقے کے چوکیدار مارک کا چھوٹا بچہ غائب ہو گیا، سب نے اسے بہت تلاش کیا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا ایک کے بعد ایک بچہ غائب ہوتا چلا گیا۔ سب پریشان تھے۔ ہر طرح کی کوشش کر لی مگر سب بے سود رہا، کسی کو کان و کان خبر نہ ہو رہی تھی کہ بچے جا کہاں رہے تھے؟

علاقے کی میٹنگ میں سب شریک تھے اس میں ڈیلفن بھی موجود تھی مگر بالکل خاموش بیٹھی رہی، سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے اور وہ صرف سر ہلا رہی تھی۔ بے خبر لوگ اپنے بیچ اپنے ہی دشمن کو لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔

دراصل ڈیلفن ایک خونی عفریت تھی وہ اپنی مرضی کے بچے چنتی پھر رات میں انہیں غائب کر دیتی بچے ذبح کر کے ان کا خون پی جاتی ہڈیوں پر عمل کر کے اپنی زندگی بڑھاتی جبکہ گوشت کو سوپ میں ڈال دیتی۔ ''لوگ اپنے ہی معصوم بچوں کے گوشت سے بنا سوپ مزے سے پی رہے تھے اور انہیں خبر نہ ہو پائی۔''

کسی کو ڈیلفن پر شک نہ ہوا اس لئے اس نے اپنے گھر میں ایک یتیم لڑکے کو رکھا ہوا تھا، اس لڑکے کو ڈیلفن کی اصلیت معلوم نہ تھی وہ سارا دن اس یتیم لڑکے سے لوگوں کے لائے کپڑے دھلواتی، سارا کام کرواتی اور سب کے سامنے بھلی بنی رہتی اور کسی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیتی اور سب سمجھتے بے چاری کتنی محنت کر کے زندگی گزار رہی ہے اور ساتھ یتیم لڑکے کی پرورش بھی کر رہی ہے۔

وہ لڑکا بھی کسی سے کچھ نہ کہتا کیونکہ اسے تو سر چھپانے کا ٹھکانہ اور دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ وہ سارا دن کام کرتا اور رات کو پڑ کر سو جاتا اس کے سو جانے کے بعد رات میں ڈیلفن اپنا خونی کھیل شروع کرتی۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ اس لڑکے کی رات میں پیاس کی وجہ سے آنکھ کھل گئی، آنکھ کیا کھلی اس پر ڈیفن کی اصلیت کھل گئی لڑکے نے اپنی آنکھوں سے اس خونی عفریت کو خونی کھیل کھیلتے دیکھ لیا تھا وہ دبے قدموں وہاں سے بھاگ رہا تھا کہ اس چڑیل نے اسے دبوچ لیا، اس نے اپنے نوکیلے پنجے اس کے گلے میں پیوست کردیئے لڑکے کی نظر نیچے پڑے چھرے پر پڑی تو اس نے ہاتھ پاؤں مار کر وہ چھرا اٹھالیا اور اس چڑیل کے پنجے میں گھونپ دیا وہ چیخ کر پیچھے ہٹی تو وہ بمشکل وہاں سے بھاگ پایا۔ اس کے گلے سے خون برس رہا تھا اور اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی مگر اس نے اپنے پورے جسم کی طاقت جمع کی اور علاقے کے چرچ کے دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

چرچ سے فادر سیموئیل نکلے، انہوں نے اس لڑکے کو اٹھایا اور اندر لے گئے۔ فادر نے اس کی مرہم پٹی کروائی مگر لڑکے کی حالت نازک تھی۔ اس نے فادر سیموئیل کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ پہلے تو فادر کو یقین نہ آیا مگر لڑکے کے گلے پر نشانات دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ لڑکا ان کی کوششوں کے باوجود جانبر نہ ہوسکا۔

فادر سیموئیل نے چند بااعتماد اور سمجھ دار لوگوں کو اکیلے میں بلا کر بات کی اور پھر ان لوگوں نے ڈیفن کو واچ کرنا شروع کیا۔ جلد ہی اس کا اصلی روپ فادر اور لوگوں کے سامنے آ گیا۔ فادر سیموئیل نے انہیں بتایا کہ۔ ''اس طرح کی عفریت اور شیطانی چیزوں کی طاقت دن میں ختم ہوجاتی ہے چنانچہ لوگوں نے اسے دن میں پکڑنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ بچ نہ پائے۔'' پھر انہوں نے طے شدہ وقت کے مطابق سورج کی پہلی کرن نکلتے ہی ڈیفن کو دبوچ لیا اور اسے ایک جھاڑ سے باندھ کر زندہ جلادیا۔

پھر اس کی راکھ ایک جگہ گڑھا کھود کر اس میں ڈال دی۔ مگر انہوں نے کام ادھورا کیا تھا کیونکہ عفریت ان سے زیادہ چالاک تھی۔

جہاں مائیکل کھیل رہا تھا وہی جگہ تھی اس نے گڑھا کھودا اور اس کا خون اس پر ٹپکا، زمین نے خون جذب کرلیا اور خون راکھ تک پہنچ گیا۔ تو وہ عفریت پھر سے زندہ ہوگئی زندہ تو وہ ہوگئی مگر ابھی اس کے پاس جسم نہیں ہے وہ کسی کو بھی چن کر اس کے اندر چلی جائے گی اور یہ کام وہ ایڈ مون میں کرے گی جو کل ہے۔' تم سب کو خبردار کردو ورنہ بہت برا ہوجائے گا۔

اور سب سے اہم کام تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ۔ ''اپنے فارم ہاؤس کے تیسرے کمرے میں موجود تہہ خانے کو تلاش کرو، نیچے جانے کی جو سیڑھیاں ملیں آخری سیڑھی کے نیچے دائیں طرف کھدائی کرنا، وہاں تم کو اس چڑیل کے بال اور ایک کتاب ملے گی تم ان دونوں چیزوں کو جلادینا، اس عفریت کی جان ان بالوں اور اس پراسرار کتاب میں ہے جو اس نے دفن کرکے محفوظ کردیئے تھے جب تک ان دونوں چیزوں کو جلاؤ گی نہیں وہ عفریت ختم نہیں ہوگی!'' جیرڈ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

جے نا ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی، پھر جب جیرڈ خاموش ہوگیا تو جے نا نے اپنا سر جھٹکا اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے تم بھوت پریت اور چڑیل سے بہت زیادہ متاثر ہو، اس لئے وہ تمہارے دماغ پر سوار ہوگئی ہیں۔ میری بات مانو اس وہم سے باہر آ جاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے میں اب جا رہی ہوں۔'' جے نا کھڑی ہوگئی۔

''جے نا سنو! بے وقوف مت بنو، میری بات مانو ورنہ بعد میں تم لوگ بہت پچھتاؤ گے۔''

جیرڈ نے اس کے سامنے آ کر کہا۔ مگر جے نا نے اس کی بات ان سنی کردی اور بائے بائے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

ریڈ مون شروع ہوگیا تھا پھر اندھیرا ہونے لگا تو فارم ہاؤس کی لائٹس آن ہوگئیں سارہ نے جیب سے سگریٹ نکالی پھر جھولے میں بیٹھ کر اسے سلگائی اور سگریٹ پیتے ہوئے جھولا جھولنے لگی اچانک اس کے سینے سے کوئی چیز زور سے ٹکرائی، اتنی زور سے کہ وہ جھولے سے اچھل کر پیچھے جا پڑی۔ سارہ کو اپنے جسم میں آگ دوڑتی محسوس ہونے لگی اس نے اپنے بال دونوں ہاتھوں سے کھینچے اور پھر ایک دم نارمل ہوگئی مگر وہ

سر جھکائے خاموشی سے اٹھی اور لنگڑا کر چلتی ہوئی اندر جانے لگی۔

☆......☆......☆

ڈیوڈ نے ڈنر تیار کرکے گھڑی دیکھی، آٹھ بج رہے تھے ایڈگر فیملی نے لوسی اور روجر کی فیملی کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا تاکہ لوسی کا دل کچھ بہل جائے ڈیوڈ نے ہدایت کے مطابق آٹھ بجے کھانا ٹیبل پر لگادیا اور ڈرائنگ روم میں جاکر ایک طرف باادب سے کھڑا ہوگیا جہاں سب باتیں کررہے تھے پھر جب وہ سب خاموش ہوگئے تو وہ بولا۔ ''مسٹر ایڈگر!، ڈنر از ریڈی۔'' اس کے کہنے پر مچل ایڈگر سب کو لے کر ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے۔

سارہ لنگڑا کر چل رہی تھی سب کے پوچھنے پر وہ بس دو لفظ بولی۔ ''چوٹ لگ گئی ہے۔''

سب اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور کھانا شروع کرنے سے پہلے دعائیہ کلمات پڑھنے لگے سب کی آنکھیں بند تھیں۔

کہ اچانک سب کو غراہٹ کی آواز آئی تو سب نے آنکھیں کھول دیں۔ غراہٹ سارہ کے منہ سے نکل رہی تھی جو ایک ہاتھ سے روسٹڈ چکن وحشیوں کی طرح چبا رہی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں بوٹیاں بھری ہوئی تھیں۔

''سارہ بی ہیو یور سیلف!'' روجر نے غصے سے کہا۔

مگر سارہ رکنے کے بجائے تیزی سے گوشت منہ میں ٹھونستی رہی اس کی باچھوں سے رال بھی بہہ رہی تھی۔

''اٹس او کے! مسٹر روجر پلیز اسٹارٹ دی ڈنر۔'' مچل ایڈگر نے کہا اور سب نے ڈنر شروع کردیا۔

مگر سارہ نے اس پر بس نہیں کیا اس نے مچل ایڈگر کی پلیٹ میں رکھا ہوا اسٹیک جھپٹ کر اٹھایا اور دانتوں سے نوچنے لگی۔ اس کے والدین شرمندگی سے زمین میں گڑے جارہے تھے انہوں نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور سارہ کو زبردستی لے کر اپنے فارم ہاؤس چلے گئے۔

ڈیوڈ نے اپنا ڈنر ختم کیا اور برتن دھونے شروع کردیئے ابھی اس نے دو، تین پلیٹس ہی دھوئیں تھیں کہ چھناکے سے کچن کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا ڈیوڈ کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر گر گئی۔ اس کی نگاہ نیچے پڑی وہاں ایک پتھر پڑا ہوا تھا ڈیوڈ نے چونک کر دیکھا پھر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا مگر وہاں کوئی نہ تھا اس نے گری ہوئی پلیٹ اٹھائی اور اسے دھونے لگا۔ ایک دم اسے اپنی کنپٹی پر گرم انگارہ دہکتا محسوس ہوا اس کا سر جھنجھنا گیا اس نے اپنی کنپٹی پر ہاتھ رکھا تو اسے درد کے ساتھ چپچپاہٹ محسوس ہوئی اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا تو اس پر خون لگا ہوا تھا وہ پلٹا تو یکدم کسی نے اس کے گلے پر وار کیا اور اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکلنے لگی اور وہ نیچے گر پڑا۔

سارہ لنگڑاتی ہوئی آگے بڑھی پھر وہ اکڑوں نیچے بیٹھ گئی اور ڈیوڈ کے گلے پر منہ رکھ کر بے تابی سے خون چوسنے لگی۔

ڈیوڈ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا وہ ہلکے ہلکے جھٹکے لے رہا تھا سارہ نے منہ اٹھایا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اس بوڑھے خون میں وہ مزہ کہاں؟ جو نومولود کے تازہ خون میں تھا، خیر مجھے تو طاقت حاصل کرنی ہے گزارے کے لئے یہی سہی۔'' اور پھر دوبارہ گلے پر ہونٹ پیوست کردیئے۔

ڈیوڈ کی لاش بالکل سفید ہوگئی تھی سارہ نے اس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا تھا پھر وہ لنگڑاتی ہوئی کھڑکی تک آئی اور کھڑکی سے کود کر باہر نکل گئی۔

پولیس آئی اور ڈیوڈ کی لاش کے آس پاس سے ثبوت اکٹھے کرنے لگی پولیس کو ایڈگر فیملی نے کال کیا تھا پہلے بھی پولیس مائیکل کی موت کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی اب ایک اور موت، اب کی بار لاش کی حالت دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کسی جنگلی جانور کی کارستانی ہے یا پھر کسی سفاک قاتل کا کارنامہ، وہ دونوں پہلوؤں سے تفتیش کررہے تھے۔

مگر جے نا تو الگ ہی سوچ رہی تھی۔ ''کیا جیرڈ کی باتیں سچ تھیں؟'' پھر کافی سوچنے کے بعد اس نے اپنے مام ڈیڈ کو یہ بات بتانے کا فیصلہ کیا جب پولیس اپنا کام کرکے چلی گئی تو جے نا نے اپنے مام، ڈیڈ کے سامنے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سارا معاملہ کھول کر رکھ دیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے پھر اسکی مام بولیں۔ ”جے نا اپنی فکشن، ہارر اور ایڈونچر کی بکس سے باہر نکلو۔“

”جے نا! بیٹا یہ بہت حساس معاملہ ہے، اس طرح کا مذاق کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں ہے۔“ مچل ایڈگر نے سنجیدگی سے کہا۔

”مام، ڈیڈ ذرا سوچیں کہ اگر یہ مذاق ہے بھی تو تہہ خانے کی سیڑھیوں کے نیچے دیکھ لینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے ناں؟ جے نا نے کہا تو وہ دونوں خاموش ہوگئے۔“

”اوکے!“ مچل ایڈگر نے کہا تو وہ تینوں اٹھ کر تیسرے کمرے میں جانے لگے جس میں تہہ خانہ تھا مگر وہ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹھک کر رک گئے۔ وہاں ان سے پہلے سارہ موجود تھی اس کا تو انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے!“ وہ دھاڑی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے سارہ؟“ جے نا کی مام بولیں۔

”کہاں ہیں تمہارے والدین؟ میں ان سے بات کرتا ہوں۔“ مچل ایڈگر بولا۔

”روجر، مارگریٹ اور لوسی تینوں کو میں نے مائیکل کے پاس بھیج دیا، اب تم تینوں کی باری ہے ہاہاہا!“ سارہ نے مکروہ انداز سے قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔

سارہ کی بات نے ان تینوں کو سن کر دیا۔ سارہ ایک پیر سے لنگڑاتی ہوئی آگے بڑھی۔

”مام، ڈیڈ بھاگیں!“ جے نا ایک دم چیخی تو مسٹر اور مسز ایڈگر بھاگے، جے نا نے سارہ کو زور سے دھکا دے کر باہر سے کمرے کی کنڈی لگا دی۔ ”مام یہ دروازہ زیادہ دیر بند نہیں رہ پائے گا ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا ہوگا!“ جے نا نے کہا۔

”ہمیں اس معاملے میں فادر سیموئیل سے مدد لینا پڑے گی۔“ مچل ایڈگر نے کہا تو وہ دونوں گردن ہلانے لگیں۔

سارہ کمرے کے دروازے کو جھنجھوڑ رہی تھی مگر وہ تینوں فوراً وہاں سے نکلے اور علاقے کے چرچ میں گئے وہاں جا کر ان لوگوں نے فادر کو ساری بات بتائی ان کی بات سن کر فادر کچھ سوچنے لگے پھر رک کر بولے۔ ”تقریباً سو سال پہلے ان کے دادا فادر نے ہی اس چڑیل کو جلایا تھا مگر انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی کتاب اور بالوں کا ذکر نہیں کیا۔“

جے نا سوچنے لگی پھر اس نے جیرڈ کے کہے ہوئے الفاظ فادر سیموئیل کے سامنے دہرا دیئے۔ ”اگر ایسا کچھ ہے تو ہمیں ضرور اس کو ختم کرنا ہوگا اور ساتھ ہی اس بچی کو بھی بچانا ہوگا، جس پر اس عفریت نے قبضہ کیا ہوا ہے۔“ فادر کی بات سن کر وہ لوگ گردن ہلانے لگے۔

☆.....☆.....☆

فادر نے دروازہ کھولا تو وہاں سامنے کوئی نہ تھا۔

فادر نے جیسے ہی اندر قدم رکھا تو چھت میں چھپکلی کی طرح چپکی سارہ دھپ کر کے ان کے سامنے زمین پر کود کر اکڑوں بیٹھ گئی اس کے ہاتھ کے نیچے زمین پر کھے ہوئے تھے وہ اس طرح اچکی کہ چھلانگ لگا کر فادر کو دبوچ لے مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتی، فادر نے اس پر ”ہولی واٹر“ چھڑکا تو وہ چیخیں مارتی پیچھے ہٹ گئی جہاں جہاں سارہ کے جسم پر پانی گرا، وہاں سے اس کی کھال سے دھواں اٹھنے لگا وہ جل گئی تھی۔

اسی کیفیت کے دوران ہینا اور مچل نے فادر کے بتائے ہوئے پلان کے مطابق سارہ کو زنجیروں میں جکڑ لیا اور تالا ڈال کر اس میں کراس پھنسا دیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس بھی پہنچ گئی وہ فادر کی ریکویسٹ پر آئی تھی فادر کا کہنا تھا کہ ”تمام عمل پولیس کی نگرانی میں ہونا زیادہ بہتر ہے۔“

سارہ کے منہ سے غراہٹ جاری تھی اور وہ اذیت ناک انداز سے اپنے آپ کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی پھر پولیس کی نگرانی میں تہہ خانے کی سیڑھیوں کے نیچے کھدائی شروع کی گئی کھدائی گہری ہوتی گئی ابھی

کھدائی جاری تھی ایک دم کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی چھن کی آواز کے ساتھ چنگاری بھی نکلی۔ سب نے کدال روک کر مٹی ہٹانی شروع کر دی پھر انہیں لوہے کی کوئی چیز نظر آئی۔ جب پوری مٹی ہٹا کر اسے نکالا گیا تو ایک ”لوہے کا بکس“ نکلا۔

فادر نے اس پر پڑے تالے کو ہولی واٹر چھڑکنے کے بعد توڑ دیا۔ بکس کا ڈھکنا کھولا تو انتہائی غلیظ بدبو نے فادر اور تمام لوگوں کا استقبال کیا سب نے بے اختیار اپنی ناکوں کو بند کر لیا۔ بکس میں بے شمار ہڈیاں، ناخن اور کھوپڑیاں پڑی تھیں جن پر کوئی بدبودار کھال نما چیز پڑی ہوئی تھی فادر نے اسے بڑی مشکل سے ہٹایا تو اس کے نیچے ایک سیاہ چمڑے کی کتاب نظر آئی، جس پر شیطانی اشکال بنی ہوئی تھیں اس کے برابر میں ایک جھلی میں کچھ لپٹا ہوا رکھا تھا فادر نے اس کا کونا پکڑ کر اسے کھولا وہ بال تھے۔ فادر نے اس پورے بکس کو نکلوا لیا اور باہر آ گئے۔

بکس کو دیکھ کر سارہ نے چیخنا شروع کر دیا وہ زور زور سے جھٹکے لینے لگی اور منہ سے گالیوں کا طوفان برپا کر رہی تھی فادر نے بکس پر صلیب لگائی اس پر پیٹرول ڈالا اور آگ لگا دی۔ بکس میں آگ کیا لگی سارہ نے سر پٹخنا شروع کر دیا پھر اس کے جسم سے جلتا ہوا ایک ہیولہ نکلا اور چنگاریاں بن کر ہوا میں بکھر گیا فضا میں ہزاروں چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جو کان پھاڑ دینے والی تھیں پھر آہستہ آہستہ وہ آوازیں بین کرنے کے انداز میں تبدیل ہو کر معدوم ہوتی چلی گئیں۔

جے نا، ہینا اور مچل ایڈگر فادر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ فادر بولے۔ ”سو سال بعد تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے جس عفریت کو میرے دادا نے ختم کیا تھا، آج سو سال بعد دوبارہ اس کا خاتمہ انہی کے خون نے کیا ہے۔ پھر فادر اٹھے اور ایک البم لے آئے جوان کے دادا کی تھی اس میں اس عفریت کو ختم کرنے کے مناظر بھی تھے۔ البم میں ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی جے نا چونک گئی اس کے چونکنے پر فادر نے بتایا کہ ”یہ تصویر ایک یتیم خانے کی ہے اور یہ سب بچے یتیم تھے۔“ فادر کو ان بچوں سے بہت محبت تھی۔

جے نا نے آگے نیچے بیٹھے ہوئے بچوں میں سے ایک پر انگلی رکھی اور سوالیہ نظروں سے فادر کی طرف دیکھا۔ ”مائی چائلڈ! یہی تو ہے وہ بچہ جس نے سب کو اس چڑیل کی حقیقت سے آگاہ کر کے، آنے والی نسل کو بچا لیا مگر خود جانبر نہ ہو سکا۔“ فادر بولے۔

”جیرڈ فرگوسن۔“ رائٹ جے نا نے نام بتا کر تصدیق چاہی۔

”آف کورس مائی چائلڈ! جیرڈ فرگوسن ہی تھا اس کا نام۔“ فادر نے تصدیق کی۔

”مگر تم اسے کیسے جانتی ہو؟“

جے نا بولی۔ ”جیرڈ ہی تو مجھے ملا تھا اور اس نے تمام حالات سے مجھے آگاہ کیا تھا۔“ اس کی بات پر سب خاموش ہوگئے۔

سارا سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا ایڈگر فیملی نے فادر سے آخری ملاقات کی اور جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ ”کم آن جے نا، لیٹس گو!“ ہینا نے اسے آواز لگائی تو جے نا فارم ہاؤس پر نظر ڈالتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی، ٹوبی اس کی گود میں ہی تھا، گاڑی آہستہ سے آگے بڑھنا شروع ہوئی تو ایک دم جے نا کو دور جیرڈ کھڑا نظر آیا وہ مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ ہلا رہا تھا، جے نا نے بھی اسے ہاتھ ہلایا پھر جیرڈ ایک دم غائب ہوگیا۔

اچانک جے نا بولی۔ ”مام کیوں نہ ہم سارہ کو اپنی فیملی کا حصہ بنا لیں؟ جے نا نے سیٹ پر سوئی ہوئی سارہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو اپنے مام، ڈیڈ، لوسی آنٹی اور مائیکل کو کھو چکی تھی۔

”کیوں نہیں بیٹا! اگر سارہ ہماری فیملی کا حصہ بنے گی تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔“ ہینا ایڈگر نے کہا تو جے نا نے مسکرا کر سوئی ہوئی سارہ کو دیکھا اور خود بھی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

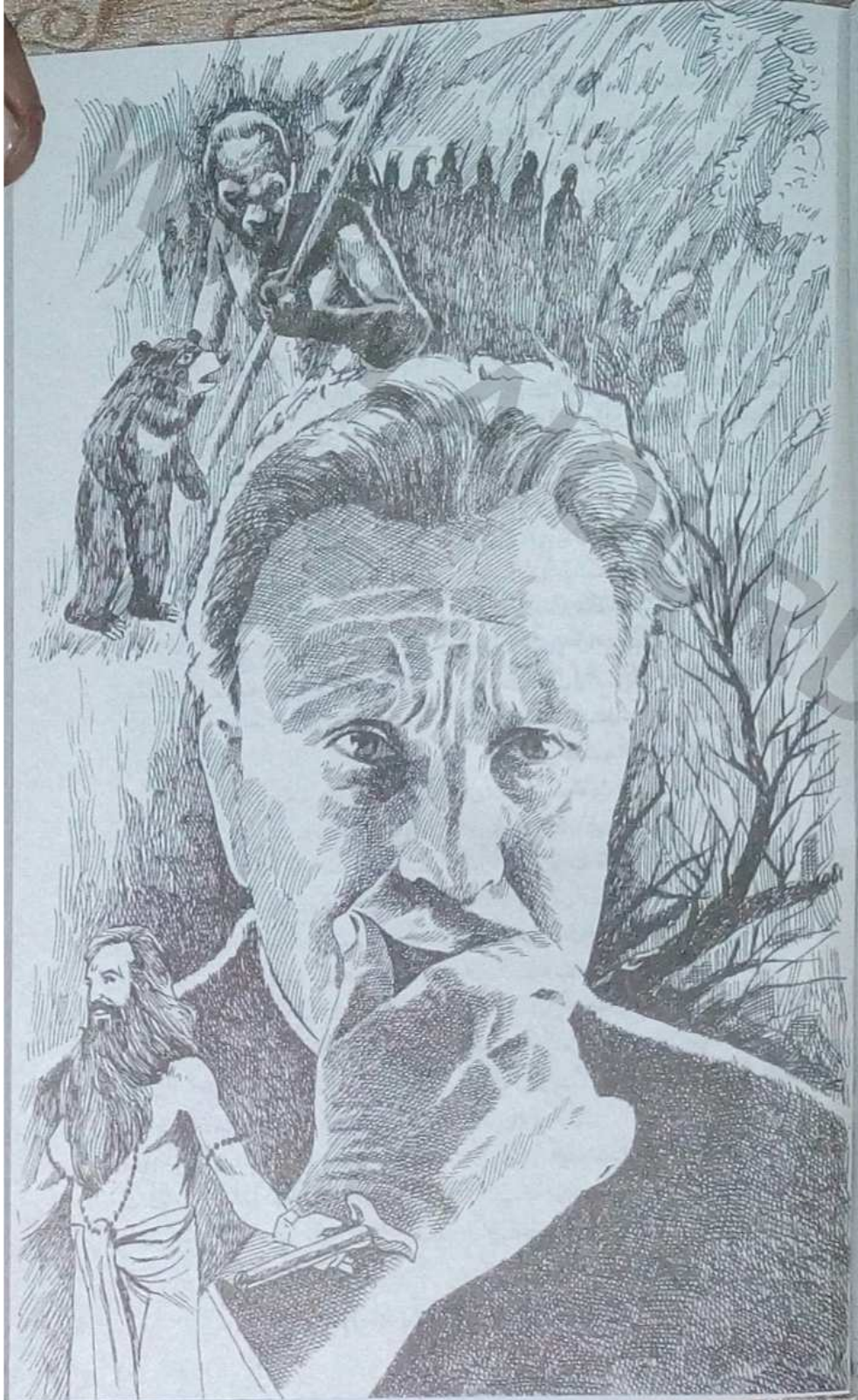

خونی مقابلہ

ضرغام محمود۔ کراچی

اندھیرے کمرے میں اچانک تیز روشنی پھیل گئی اور سامنے کا منظر دیکھ کر نوجوان کی گھگھی بندھ گئی، کیونکہ پتھر کے مجسمے کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں اور پاس کھڑے مجسمے حرکت کرنے لگے تھے پھر.....

دل و دماغ کو لرزا دینے والا عجیب اور انوکھا واقعہ جو کہ پڑھنے والوں کو سہما کر رکھ دے گا

افریقہ دنیا کا تاریک ترین خطہ کہلاتا ہے، تاریک ان معنوں میں نہیں کہ وہاں کے لوگوں کا رنگ کالا ہے بلکہ یہ دنیا کا وہ خطہ ہے جہاں نئی تہذیب کی روشنی سب سے آخر میں پہنچی۔ آج بھی افریقہ کے گھنے جنگلات میں ایسے قبائل پائے جاتے ہیں جہاں تہذیب اپنے ابتدائی مراحل میں ہے وہاں لوگ آج بھی درخت کے پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے اپنی ستر پوشی کرتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ تیسری عالمی جنگ جو کہ ایٹمی جنگ ہوگی اس عالمی جنگ میں تقریباً انسانی آبادی ختم ہو جائے گی اور انسانی آبادی دوبارہ افریقہ کے جنگلات سے جنم لے گی کیونکہ افریقہ کے جنگلات میں کچھ قبائل ایسے آباد ہیں جن کی تہذیب یافتہ انسانوں کے متعلق معلوم نہیں، لہٰذا تیسری عالمی جنگ میں وہی قبائل بچ جائیں گے اور دنیا کے جد امجد کہلائیں گے۔

میری یہ کہانی بھی افریقہ کے قبائل ہی کی ہے مگر افریقہ کے یہ قبائل جنگلی یا وحشی نہیں ہیں نئی تہذیب کی کرنیں ان تک پہنچ چکی ہیں اور وہ اپنے پیشروؤں کی طرح انسانوں کے لئے خطرناک نہیں ہے مگر ان کی جبلی فطرت انہیں مجبور کرتی رہتی ہے لہٰذا اپنی فطرت کی تسکین کے لئے افریقہ کے یہ قبائل ہر سال ایک میلے کا بندوبست کرتے ہیں جہاں مختلف کھیل کود ہوتے ہیں۔ جن میں تمام قبائل کے جوان مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سالانہ میلے کے آخری روز تلوار بازی کا عظیم الشان مقابلہ ہوتا ہے اور تمام قبائل کے جوان چاہتے ہیں کہ وہ یہ مقابلہ جیت جائیں کیونکہ اس مقابلے کو جیتنے والا افریقہ کا بہادر ترین آدمی سمجھا جاتا ہے پچھلے چار سالوں سے یہ مقابلہ لوگوس قبیلے کے سردار رابیل کا بھتیجا ابنائیکے جیت رہا ہے بلکہ پچھلے دو سال سے تو کوئی جوان ابنائیکے کے مقابلے پر ہی نہیں اترا کیونکہ جو بھی جوان ابنائیکے کے مقابل تلوار بازی کے مقابلے میں آیا ابنائیکے کی تلوار نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس جوان کی گردن اس کے دھڑ سے الگ کردی۔ اور اس جوان کے خون سے زمین سرخ ہوگئی اور اس جوان کا بے دھڑ لاشہ میدان پر پڑا اپنی بے بسی کی داستان سنا رہا ہوتا لہٰذا کوئی جوان جرأت ہی نہیں کرتا کہ ابنائیکے کے مقابل تلوار بازی کرے۔ ابنائیکے تلوار بازی کے فن میں یکتا تھا تلوار بازی کے فن میں اس کا کوئی مقابل نہ تھا اور اس چیز نے ابنائیکے کو غرور میں مبتلا کردیا تھا۔

اس سال بھی سالانہ میلے کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں بچے بوڑھے جوان مرد اور عورتیں سب میلے کی

تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق میلے کی تیاریاں کررہا تھا پہلوان ورزش کررہے تھے اور اپنے داؤ پیچ آزمانے کے لئے بے چین تھے ہر کھلاڑی اپنے کھیل میں مہارت پیدا کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ ابنائیکے بھی روز صبح اٹھ کر ورزش کرنے کے بعد تلوار بازی میں مشغول ہوجاتا اور دوپہر تک تلوار بازی کی مشق کرتا۔

آج بھی وہ صبح سے تلوار بازی کی مشق کررہا تھا جب سردار رابنل کے نوکر نے اسے آکر بتایا کہ سردار رابنل اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابنائیکے نے یہ سن کر تلوار بازی کی مشق روک دی اور کپڑے تبدیل کرکے نوکر کے ساتھ سردار رابنل سے ملنے ان کے بڑے سے گھر پہنچ گیا۔

سردار رابنل اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے کہ اسی وقت ایک نوکر نے آکر ادب سے انہیں سلام کیا اور کہا۔ ”سردار۔۔ ابنائیکے آگئے ہیں“

”بھیجو اسے۔۔“ سردار رابنل نوکر کی بات سن کر بولے تو نوکر کمرے سے باہر چلا گیا تھوڑی دیر میں ابنائیکے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے نہایت ادب سے سردار رابنل کو سلام کیا۔

ابنائیکے کے کمرے میں آنے کے بعد سردار رابنل نے اپنے نوکروں کو کمرے سے باہر جانے کا کہا اور سارے نوکر سردار رابنل کو سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے اب کمرے میں سردار رابنل اور ابنائیکے باقی رہ گئے تھے۔ جب سب نوکر کمرے سے نکل گئے تو سردار رابنل ابنائیکے کے قریب آئے اور ابنائیکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”ابنائیکے۔۔۔ ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ اب ہم محسوس کررہے ہیں کہ ہم بوڑھے ہوچکے ہیں نہ جانے کب ہمارا وقت پورا ہوجائے اور موت ہمیں دوسری دنیا میں لے جائے۔۔“ سردار رابنل سانس لینے کے لئے تھوڑا سا رکے تو ابنائیکے فوراً بول اٹھا۔

”آپ پر دیوتاؤں کا کرم ہے سردار۔۔۔ آپ ابھی مزید سو سال جئیں گے۔۔۔“

”ہم اپنی جسمانی حالت کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتے۔۔۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بہت جلد تمہاری شادی اپنی اکلوتی بیٹی ششمایا سے کردیں۔“ سردار رابنل اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔ ششمایا سے شادی کا سن کر ابنائیکے کا رواں رواں خوشی سے ناچ اٹھا۔ ششمایا قبیلے کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی اور سردار رابنل کی اکلوتی بیٹی تھی۔

”ابنائیکے۔ اب ہم محسوس کررہے ہیں کہ ہمارے کاندھے سرداری کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہیں۔ سرداری کا بوجھ تم جیسے بہادر جوان لوگوں کا کام ہے لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم ہمیشہ کی طرح اس سال بھی سالانہ میلے میں تلوار بازی کے مقابلے میں اول آئے تو ہم تمہیں لاگوس قبیلے کی سرداری سونپ دیں گے۔۔“

”میں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کرونگا۔۔“ ابنائیکے نے ادب سے جواب دیا۔

”ہمیں پوری امید ہے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی تمہاری تلوار بجلی کی طرح چمک کر مقابل کی گردن اس کے دھڑ سے الگ کردے گی۔“ سردار رابنل نے کہا۔

”شکریہ سردار۔۔۔ کون ہے افریقہ کے ان قبائل میں جو ابنائیکے کے مقابلے پر آنے کی جرأت کرے میں اس سال بھی پچھلے سالوں کی طرح بلا مقابلہ جیت جاؤنگا اور اگر کسی نے میرے مقابلے پر آنے کی حماقت کی تو اس کا خون میدان میں گرے گا اور اس کی گردن اس کے دھڑ سے الگ پڑی ہوئی ہوگی۔۔“ ابنائیکے نے غرور سے سر اونچا کرتے ہوئے سردار رابنل کو جواب دیا۔

”ہمیں تم سے یہی امید ہے ابنائیکے۔۔۔ تم ایک بہادر اور زیرک نوجوان ہو۔۔۔“ سردار رابنل نے ابنائیکے کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو ابنائیکے کی تنی ہوئی گردن مزید اکڑ گئی۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ اور مقابلے کی تیاری کرو۔۔۔“ سردار رابنل نے کہا تو ابنائیکے سردار کو سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”کیا ہوا سردار نے کیوں بلایا تھا۔۔“ ابنائیکے سردار رابنل سے بات کرکے باہر نکلا تو سردار کے گھر کے باہر کھڑے اس کے دوستوں نے اس سے پوچھا

”سردار نے وہی بات کی جس کا ہمیں یقین تھا۔۔“ ابنائیکے نے گول مول جواب دیا۔

”کیا مطلب۔۔“

”مطلب۔۔۔ سردار نے لاگوس کا آئندہ سردار ہمیں نامزد کرنے کی بات کی ہے۔۔“ ابنائیکے نے اپنی مسرت چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”یعنی سردار رابنل نے تمہیں سردار بنانے کی بات کی۔۔“ ابنائیکے کے دوستوں نے اس سے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔۔“

یہ سن کر ابنائیکے کے دوستوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

”سردار ابنائیکے۔۔“ ایک دوست نے نعرہ لگایا۔

”زندہ باد۔۔“ تمام دوستوں نے مل کر زور سے کہا اور سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

”لیکن دوستو۔۔۔ سردار رابنل نے ایک شرط بھی رکھی ہے۔۔“ تھوڑی دیر بعد ابنائیکے بولا۔

”کیسی شرط؟“

”سردار رابنل نے کہا ہے کہ اگر میں اس سال بھی سالانہ میلے میں تلوار بازی کے مقابلے میں اول آیا تو سردار مجھے جانشین مقرر کریں گے“ ابنائیکے بولا۔

”اس سال بھی تلوار بازی کے مقابلے میں تم ہی اول آؤ گے۔۔۔ بھلا کون ہے جو تلوار بازی کے مقابلے میں تمہارے سامنے آئے۔“ ابنائیکے کا ایک دوست بولا۔

”جس کو اپنی جان عزیز نہ ہوگی وہی تمہارے مقابلے پر آنے کی حماقت کرے گا۔۔“ ابنائیکے کا ایک اور دوست بولا۔

”تم فکر نہ کرو ابنائیکے۔۔۔ اس مرتبہ بھی جیت تمہاری ہی ہوگی۔۔“

تمام دوست ابنائیکے کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

”یاروں مجھے زیادہ فکر نہیں ہے۔۔۔ میں تو اس جوان کا سوچتا ہوں جو میرے مقابل تلوار بازی کے مقابلے میں آئے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھوئے گا۔“ ابنائیکے نے گردن اکڑا کر کہا۔

”پورے افریقہ میں ابنائیکے سے اچھا تلوار باز کوئی نہیں ہے۔۔“ ابنائیکے کے سب دوستوں نے مل کر کہا اور ابنائیکے کو کندھوں پر اٹھا کر سردار ابنائیکے کے نعرے لگاتے ہوئے وہاں سے چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

سالانہ میلہ شروع ہوا تو تمام قبائل کے لوگوں میں جوش بھر گیا ہر شخص میلے میں ہونے والے کھیلوں میں حصہ لینا چاہتا تھا اور جو افراد کھیلوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے وہ اپنے اپنے قبائل کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی بھرپور تالیوں سے کررہے تھے، جس قبیلے کا جوان جیت جاتا سارا قبیلہ اس جوان کو کندھوں پر اٹھا لیتا اور اس جوان کی مدح سرائی میں مصروف ہوجاتا، غرض افریقہ کے تمام قبائل اس میلے میں ہونے والے کھیلوں کے لئے پرجوش تھے اور اپنی مہینوں کی تیاریوں کا پھل پارہے تھے۔

بالآخر سالانہ میلے کا آخری دن آگیا اس دن میلے میں آنے والے تمام لوگوں کا جوش و جذبہ قابل دید تھا، ہر شخص پرجوش تھا کیونکہ لاگوس قبیلے کے سردار رابنل نے اعلان کیا تھا کہ اگر اس سال بھی ان کا بھتیجا ابنائیکے تلوار بازی کے مقابلے میں اول آیا تو وہ لاگوس قبیلے کی سرداری کا تاج ابنائیکے کے سر پر رکھ دیں گے، لاگوس قبیلے کے تمام لوگ ابنائیکے کی قسمت پر رشک کررہے تھے۔

سالانہ میلے کے آخری دن کا آغاز انتہائی شاندار طریقے سے ہوا پہلے قدیم افریقن رقص پیش کیا گیا سینکڑوں مرد اور خواتین نے انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ قدیم افریقن رقص پیش کیا۔ رقص کے بعد چھوٹے چھوٹے تلوار بازی کے مقابلے ہوئے ان مقابلوں کے بعد ابنائیکے انتہائی خوشی سے تلوار لہراتا ہوا میدان میں داخل ہوا اس کے ساتھ دو نوکر بھی تھے، میدان میں پہنچ کر ابنائیکے نے اپنی قیمتی پوشاک اتاری اور نوکروں کے

WWW.URDUBOOKS.NET

حوالے کی جسے نوکروں نے نہایت احتیاط کے ساتھ تہہ کر کے ایک طشتری میں رکھا، پوشاک اتار کر ابنائیکے نے اپنے مسلز تمام حاضرین کو دیکھائے اس کے انداز میں غرور اور تکبر نمایاں تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ حاضرین کو انسان ہی نہیں سمجھ رہا ہو پھر اس نے اپنی تلوار لہرائی اور میدان کے وسط میں آیا اور تلوار بازی کے پینترے دکھانے لگا، تلوار بازی کے مختلف پینترے دکھانے کے بعد ابنائیکے نے پرغرور انداز میں مجمع کی جانب دیکھا اور انتہائی مغروریت سے بولنے لگا۔

"ہے کوئی شیر جوان جو ابنائیکے کی تلوار کی تیزی آزمائے۔۔ہے کوئی جو ابنائیکے کے مقابلے میں اترنے کی جرأت کرے۔"

ابنائیکے کی للکار سن کر کوئی بھی میدان میں نہیں اترا تو ابنائیکے نے انتہائی غرور کے ساتھ گردن اکڑا کر کہا۔

"ارے کیا افریقہ کے تمام مردوں نے چوڑیاں پہن لی ہیں یا افریقہ کی ماؤں نے مرد پیدا کرنے بند کر دیے ہیں۔۔۔کیا اتنے سارے قبائل مل کر ایک جوان تیار نہیں کر سکے جو ابنائیکے کے مقابلے میں میدان میں اتر سکے۔" ابنائیکے غرور سے بھرے جملے بولتا رہا، سارے مجمع پر سکوت طاری تھا ابنائیکے کچھ دیر تلوار ہاتھ میں لئے کھڑا رہا پھر اس نے اپنی تلوار زمین میں گاڑ دی اور حجز کی جانب منہ کر کے کہا۔

"سردار۔۔۔ ابنائیکے کی جیت کا اعلان کیا جائے۔"

اس سے پہلے کے سردار رابیل جو اس مقابلے کے جج تھے ابنائیکے کی جیت کا اعلان کرتے مجمع میں ایک شور اٹھا، چار نقاب پوش جو گھوڑوں پر سوار تھے اور میدان کے کنارے پر کھڑے ابنائیکے کی غرور بھری بکواس سن رہے تھے ان نقاب پوشوں میں سے ایک نقاب پوش اپنے گھوڑے سے اترا اور میدان کے وسط میں آیا اور اس نے ابنائیکے کی تلوار جو زمین میں گڑی ہوئی تھی اسے زمین سے نکال کر ابنائیکے کی جانب پھینک دیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ وہ نقاب پوش ابنائیکے سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

"تو کون ہے جس نے ابنائیکے کی تلوار اٹھانے کی جرأت کی۔۔" ابنائیکے نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں تم سے مقابلہ کرنے آیا ہوا ابنائیکے۔۔۔ میں نے تمہاری بہت شہرت سنی ہے۔۔" نقاب پوش کی آواز گرجدار تھی۔

"تم ہو کون اپنا نام پتہ بتاؤ تاکہ لوگ تمہاری لاش تمہارے گھر تک پہنچا سکیں۔" ابنائیکے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کس کی لاش اس میدان میں گرے گی اس کا فیصلہ یہ تلوار کرے گی۔۔" نقاب پوش نے اپنی تلوار میان سے نکالتے ہوئے کہا۔

ابنائیکے نے بھی آگے بڑھ کر زمین پر پڑی اپنی تلوار اٹھائی اور نقاب پوش کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔

سردار رابیل کے اشارے پر ایک شخص نے ناقوس بجایا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب مقابلہ شروع کیا جائے ابنائیکے اپنی تلوار لہراتا ہوا نقاب پوش کے مقابل کھڑا تھا، نقاب پوش کے ہاتھ میں بھی تلوار تھی جسے وہ ہوا میں لہرا رہا تھا ابنائیکے اور نقاب پوش میدان کے وسط میں کھڑے پینترے بدل رہے تھے، حملہ کرنے میں پہل ابنائیکے نے کی اس کی تلوار بجلی کی طرح تڑپ کر نقاب پوش کے سر کی جانب بڑھی۔

مقابلہ دیکھنے والوں کی سانسیں رک گئیں کیونکہ ابنائیکے کا وار اتنا اچانک اور خطرناک تھا کہ لوگوں کو لگا نقاب پوش کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا بہت سے کمزور دل افراد نے خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر جب انہوں نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئے ابنائیکے کا وار نقاب پوش نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی تلوار پر روکا اور پھر ایک زور کا جھٹکا دیا اس جھٹکے کے اثر سے ابنائیکے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا، پیچھے ہٹتے ہی ابنائیکے نے پینترا بدلا اور تلوار کا بھرپور وار نقاب پوش کے داہنے جانب کیا مگر نقاب پوش ہوشیار تھا وہ بائیں جانب ہٹ گیا اور ابنائیکے اپنی جھونک میں آگے کی جانب بڑھ گیا، اگر نقاب پوش چاہتا تو خود وار کر کے ابنائیکے کو نقصان پہنچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اپنی جگہ

پرسکون کھڑا رہا۔

ابنائیکے نے آگے جاتے جاتے اچانک پلٹ کر نقاب پوش کے پیروں پر وار کیا مگر نقاب پوش نے بجلی کی تیزی سے اپنی تلوار نیچے کی اور ابنائیکے کی تلوار پوری قوت سے نقاب پوش کی تلوار سے ٹکرائی، دونوں تلواریں ٹکرانے سے چنگاریاں سی نکلیں اور تلواروں کے ٹکرانے کی جھنکار فضا میں پھیل گئی، ابنائیکے تھوڑا سا پیچھے ہٹا پھر وہ نقاب پوش کے مقابل آ کھڑا، ہوا نقاب سے جھانکتی نقاب پوش کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی یہ دیکھ کر ابنائیکے کو غصہ آ گیا اور اس نے نقاب پوش پر حملہ کر دیا مگر نقاب پوش ابنائیکے کے ہر حملے کو نہایت اطمینان اور سکون سے روک رہا تھا نقاب پوش نے اب تک ابنائیکے پر خود کوئی وار نہیں کیا تھا وہ بس اپنا دفاع کر رہا تھا سارا مجمع سانسیں روکے یہ خونی مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ تمام لوگ پلکیں تک جھپکنا بھول گئے تھے اکثر لوگوں نے اپنے دانتوں میں انگلیاں دبالی تھیں۔

ادھر میدان میں ابنائیکے کو بھی دانتوں پسینہ آ گیا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا مقابل نقاب پوش بھی تلوار کا دھنی ہے ابنائیکے نقاب پوش پر تلوار کے وار پر وار کر رہا تھا مگر نقاب پوش اس کے ہر وار کو نہایت اطمینان سے ناکام بنا رہا تھا۔

اچانک وار کرتے کرتے ابنائیکے نے ایک خطرناک حرکت کی وہ نقاب پوش پر وار کرنے کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی تلوار کا بھرپور وار نقاب پوش کی ٹانگوں پر کیا، مجمع میں موجود ہر شخص کو یقین تھا کہ ابنائیکے کے اس وار سے نقاب پوش کی دونوں نہیں تو ایک ٹانگ ضرور کٹ کر اس کے دھڑ سے الگ ہو جائے گی مگر نقاب پوش تمام لوگوں کی توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا، جیسے ہی ابنائیکے نے نیچے بیٹھ کر نقاب پوش کی ٹانگوں پر وار کیا نقاب پوش فضا میں اچھلا اور اس نے اپنی بائیں ٹانگ ابنائیکے کے منہ پر دے ماری، ابنائیکے پیٹھ کے بل میدان میں گر گیا اس کے منہ اور ناک سے خون نکلنے لگا، ابنائیکے پھرتی سے اٹھا اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے منہ سے نکلتے ہوئے لہو کو صاف کیا ابنائیکے کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور وہاں سے خون رس رہا تھا ابنائیکے نے اپنا جائزہ لیا زخم زیادہ گہرا نہ تھا ابنائیکے نے خون صاف کر کے نقاب پوش پر پھر حملے شروع کر دیئے نقاب پوش ابنائیکے کے ہر حملے کو ناکام بنا رہا تھا ابنائیکے کے حملوں کو ناکام بناتے بناتے اچانک نقاب پوش نے ایک بھرپور وار ابنائیکے پر کیا تو ابنائیکے نے اپنی تلوار سے نقاب پوش کا وار روکنا چاہا مگر نقاب پوش کا وار اتنا تیز اور طاقتور تھا کہ ابنائیکے کی تلوار اس وار کو روکتے ہوئے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ نقاب پوش چاہتا تو اس موقع کا فائدہ اٹھا سکتا تھا اور ابنائیکے کو نقصان پہنچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور میدان میں ایک جانب کھڑا ہو گیا، ابنائیکے کے دوستوں نے فوراً ابنائیکے کی جانب دوسری تلوار اچھالی ابنائیکے نے تلوار کو فضا ہی میں پکڑ لیا اور نقاب پوش پر حملہ کر دیا مگر اب ابنائیکے کے حملوں میں پہلے جیسی شدت اور تیزی نہیں تھی ابنائیکے کے انداز میں واضح گھبراہٹ اور پریشانی محسوس کی جا سکتی تھی۔

یہ بات ابنائیکے کے دوستوں نے بھی محسوس کر لی اور ابنائیکے کا ایک جگری دوست چپ چاپ مجمع سے نکل کر ایک اونچے ٹیلے پر اگی گھنی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا تیر کمان پر چڑھا لیا اور مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر میدان میں ابنائیکے مسلسل نقاب پوش پر وار پر وار کر رہا تھا جسے نقاب پوش آرام سے ناکام بنا رہا تھا، اچانک ابنائیکے نے اچھل کر نقاب پوش کے بائیں جانب ایک خطرناک وار کیا اس سے پہلے کے نقاب پوش ابنائیکے کا وار ناکام بناتا ایک تیر سنسناتا ہوا میدان میں آیا اور نقاب پوش کی کمر میں گھس گیا، تیر لگنے کی وجہ سے نقاب پوش کا دھیان بھٹک گیا اور وہ ابنائیکے کا وار نہ روک سکا اور ابنائیکے کی تلوار نقاب پوش کے بائیں کندھے میں گھستی چلی گئی، نقاب پوش کے کندھے سے خون کا فوارا بلند ہو گیا۔

"بے ایمانی ہے۔۔یہ بے ایمانی ہے۔۔" مجمع

میں شور اٹھا۔

نقاب پوش کے تینوں ساتھی جو خود بھی نقاب پہنے ہوئے تھے تلوار سونت کر میدان میں آگئے اور زخمی نقاب پوش کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوگئے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر نقاب پوش کی کمر سے تیر نکالا اور زخم پر رومال باندھ دیا، نقاب پوش کے دوسرے ساتھی نے نقاب پوش کے بازو کو جو ابنائیکے کی تلوار کے وار کی وجہ سے کٹ کر لٹک گیا تھا اس بازو کو نقاب پوش کے ساتھی نے نقاب پوش کے کندھے سے لگایا اور اپنے دامن کو پھاڑ کر ایک بڑی سی رسی کی طرح بٹ کر نقاب پوش کے زخمی بازو کو اس کے جسم کے ساتھ باندھ دیا پھر نقاب پوش کے تینوں ساتھی نقاب پوش کے گرد گھیرا باندھ کر کھڑے ہوگئے اور پھر ان میں سے ایک نے للکار کر کہا۔

''خبردار کوئی ہمارے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرے۔''

مجمع پر سکوت طاری تھا کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ میدان میں جائے۔ پھر نقاب پوش کے ساتھیوں نے نقاب پوش کو سہارا دے کر اٹھایا، نقاب پوش سخت زخمی ہونے کے باوجود پورے ہوش و حواس میں تھا وہ خود اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا پھر زخمی نقاب پوش نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سیٹی کی آواز نکالی، نقاب پوش کی آواز کے ساتھ ہی چار سفید گھوڑے دوڑتے ہوئے میدان میں داخل ہوگئے اور ان چاروں کے قریب آکر رک گئے نقاب پوش زخمی ہونے کے باوجود مردوں کی طرح اچھل کر گھوڑے پر بیٹھا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔

''ابنائیکے ۔۔۔ آج تو نے جس طرح دھوکے سے وار کیا ہے وہ میں ساری زندگی یاد رکھونگا۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر تو بھی یاد رکھنا میں زندہ ہوں اور اگر آئندہ برس تک زندہ رہا تو اس میدان میں ضرور آؤنگا۔۔ یاد رکھنا ابنائیکے ۔۔۔ میں تیرا دھوکا کبھی نہیں بھولونگا۔۔۔ میں آئندہ برس اس میدان میں پھر آؤنگا۔۔۔ ضرور آؤنگا۔''

اتنا کہہ کر نقاب پوش نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے میدان سے چلا گیا اس کے پیچھے اس کے ساتھی بھی چلے گئے سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا مجمع پر مکمل سکوت طاری تھا مجمع میں موجود ہر شخص نقاب پوش کی بہادری اور جی داری کا قائل ہوگیا تھا باوجود سخت زخمی ہونے کے نقاب پوش بہادروں کی طرح گھوڑا دوڑاتا ہوا گیا تھا۔

نقاب پوش تو میدان سے چلا گیا مگر سردار رائیل کے ساتھ بیٹے ڈونگا قبیلے کے سردار، سردار رانگا کا دل دہل کر رہ گیا۔

''یہ آواز ۔۔۔۔ یہ آواز تو میرے بیٹے سانگا کی ہے۔۔ مگر سانگا یہاں کہاں سے آگیا، میں نے تو اسے منع کیا تھا کہ میلے کا رخ نہ کرے، ابھی اس کی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے۔۔'' سردار رانگا نے سوچا۔

''کیا بات ہے سردار رانگا۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟'' سردار رائیل نے سردار رانگا کو مخاطب کیا تو سردار رانگا چونک پڑا مگر اس نے فوراً خود پر قابو پایا اور پروقار انداز میں بولا۔۔ ''کچھ نہیں ۔۔۔ میں دراصل تمہارے بہادر بھتیجے کے بارے میں سوچ رہا تھا ۔۔ واہ کیا بہادر ہے ایک شخص کو پیچھے سے وار کر کے دھوکے سے مارا۔۔'' سردار رانگا کے لہجے میں طنز تھا۔

''طنز کر رہے ہو۔۔ سردار۔۔'' سردار رائیل نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

''طنز نہیں کر رہا ہوں جو حقیقت ہے وہ بتا رہا ہوں۔۔'' سردار رانگا نے جواب دیا اور پھر بلند آواز میں مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چونکہ اس مقابلے میں دھوکا ہوا ہے لہٰذا اس مقابلے کا فاتح کوئی نہیں ہے۔۔ اس سال افریقہ کے سب سے بہادر آدمی کا خطاب کسی کو نہیں دیا جائے گا۔۔''

سردار رانگا یہ اعلان کر کے اسٹیج سے اتر گیا اور اپنے گھوڑے کی جانب بڑھا، وہ جلد از جلد اپنے قبیلے میں پہنچنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

ابنائیکے تمہیں بتانا پڑے گا کہ تیر کس نے چلایا

تھا؟'' اگلے دن سردار رائیل نے ابنائیکے کو اپنے گھر بلایا اور اس سے دریافت کیا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔۔ لیکن اگر وہ شخص تیر نہ بھی چلاتا تو میں نقاب پوش کو زیر کر لیتا۔۔'' ابنائیکے نے جھوٹ کا سہارا لیا حالانکہ جس دوست نے تیر چلایا تھا ابنائیکے نے اسے بہت سا انعام دیا تھا تاکہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔

''میدان میں تمہاری ٹوٹی ہوئی تلوار تو دوسری ہی داستان سنا رہی ہے۔۔'' سردار رائیل نے جواباً کہا تو ابنائیکے خاموش ہوگیا۔

''ٹھیک ہے ابنائیکے ۔۔ تم کوشش کرو کہ وہ شخص مل جائے تاکہ ہم اس کو سزا دے سکیں تاکہ ہمارے قبیلے پر لگا بدنامی کا داغ مٹ سکے۔۔'' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد سردار رائیل نے ابنائیکے سے کہا۔

''ٹھیک ہے سردار میں پوری کوشش کرونگا کہ وہ شخص مل جائے'' ابنائیکے نے کہا اور سردار رائیل کو سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

سالانہ میلے کو گزرے چار ماہ ہوگئے تھے لوگ نقاب پوش اور اس واقعہ کو بھول چکے تھے ابنائیکے کے ذہن سے بھی وہ مقابلہ محو ہو چکا تھا وہ اپنے مشاغل میں مصروف تھا سردار رائیل نے بھی دوبارہ اس مقابلے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی لہٰذا ابنائیکے نے بھی اس مقابلے کو بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دیا تھا۔

☆......☆......☆

''کیوں نہ آج شکار کھیلنے چلا جائے۔۔'' ایک دن جب ابنائیکے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا تو اس کا ایک دوست بول اٹھا۔

''واقعی بہت دن ہوگئے شکار کھیلے ہوئے۔۔'' ابنائیکے نے بھی اپنے دوست کی تائید کی۔

''ہاں۔۔۔ بہت دن ہوگئے۔۔ یاد ہے پچھلی بار ہم لوگ ایک نیل گائے مار کر لائے تھے۔۔ کتنا مزا آیا تھا۔۔'' ابنائیکے کا ایک اور دوست بول اٹھا۔

''چلو۔۔۔ پھر سب اپنے تیر کمان سنبھال لو۔۔ اور نکلو شکار کے لئے۔۔'' ابنائیکے بولا تو اس کے دوستوں نے اپنے اپنے تیر کمان سنبھالے اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر جنگل کی جانب چل دیئے۔

کافی دیر تک ابنائیکے اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا مگر کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔

''آخر یہ سارے جانور کہاں بھاگ گئے، ایک بھی نظر نہیں آرہا۔۔'' جب کافی دیر تک کوئی شکار نہ ملا تو ابنائیکے بڑبڑایا۔

''شاید جنگل کے جانوروں کو پتا چل گیا کہ آج سردار ابنائیکے شکار کے لئے آرہے ہیں اس لئے تمام جانور جان بچا کر بھاگ گئے۔۔'' ابنائیکے کے ایک دوست نے خوشامدانہ انداز میں کہا تو تمام دوستوں نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا تو ابنائیکے کے ہونٹوں پر بھی یہ سن کر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''وہ دیکھو ہرن۔۔'' ابنائیکے کا ایک دوست بولا۔

''کدھر؟''

''وہ جھاڑیوں کے پیچھے۔۔'' اس دوست نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ابنائیکے سمیت سب نے ادھر دیکھا وہاں جھاڑیوں کے پیچھے ایک ہرن ہری ہری گھاس چر رہا تھا۔ ابنائیکے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اپنے دوستوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی کمان کندھے سے اتار کر اس پر تیر چڑھایا اور اپنی ایک آنکھ بند کر کے ہرن کا نشانہ لیا اور تیر چھوڑ دیا، تیر تیز رفتاری کے ساتھ ہرن تک پہنچا ادھر ہرن کی چھٹی حس نے بھی اسے خطرے کا احساس دلا دیا لہٰذا ہرن نے فوراً اپنا رخ بدلا، ہرن کے رخ بدلنے کی وجہ سے تیر ہرن کی گردن میں لگنے کے بجائے اس کی کمر میں گھس گیا، تیر لگتے ہی ہرن نے ایک زقند بھری اور جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بھاگا ہرن کو بھاگتا دیکھ کر ابنائیکے چیخا۔

''ہرن زخمی ہوگیا ہے۔۔۔ وہ زیادہ دور تک نہیں بھاگ سکتا۔۔ اسے گھیر لو۔۔''

اتنا کہہ کر ابنائیکے نے اپنا گھوڑا ہرن کے پیچھے ڈال دیا ابنائیکے کے ساتھ اس کا ایک دوست خوفو نے بھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اپنا گھوڑا ابنائیکے کے گھوڑے کے پیچھے دوڑا دیا ابنائیکے کے باقی دوستوں نے اپنے گھوڑے دوسرے راستے پر ڈال دیئے تاکہ ہرن کو گھیر کر پکڑ سکے۔ ہرن تیر لگنے کے باوجود تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا ابنائیکے مسلسل ہرن کا پیچھا کر رہا تھا اور ابنائیکے کے پیچھے ابنائیکے کا دوست خوفو اپنا گھوڑا دوڑا رہا تھا کافی دور بھاگنے کے بعد ہرن ایک جگہ اگی گھنی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ ابنائیکے اور خوفو جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑوں سے نیچے اترے۔

"ہرن ان جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہوگا۔۔" ابنائیکے نے خوفو سے کہا تو خوفو نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"ہمیں جلدی سے ہرن کو ڈھونڈ لینا چاہئے۔۔ سورج غروب ہو چکا ہے کسی بھی وقت اندھیرا پھیل سکتا ہے۔۔" خوفو نے خدشے کا اظہار کیا تو ابنائیکے نے آسمان کی جانب گردن اٹھا کر دیکھا سورج مغرب کی جانب ڈوب چکا تھا آسمان پر شفق چھائی ہوئی تھی اندھیرا کسی بھی وقت اپنے پر پھیلا سکتا تھا۔

ابنائیکے اور خوفو جھاڑیوں میں ہرن کو ڈھونڈ رہے تھے مگر نہ جانے ہرن کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا کافی کوششوں کے باوجود دونوں کو ہرن نہ ملا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا چاند نکل آیا تھا چاند کی مدھم روشنی میں جنگل کافی پراسرار اور بھیانک لگ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ہرن کو بھول کر واپس چلنا چاہیے۔۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔۔۔" خوفو نے ابنائیکے سے کہا۔

"بس تھوڑی دیر اور۔۔ ہرن زخمی ہے وہ ان ہی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہے۔۔۔" ابنائیکے نے جھاڑیوں میں ہرن کو ڈھونڈتے ہوئے جواب دیا۔

اسی وقت جنگل میں ایک گرجدار آواز گونجی آواز نہایت خوفناک اور گرجدار تھی ابنائیکے اور خوفو اس آواز کو سن کر کانپ کر رہ گئے انہوں نے اس سے پہلے کبھی ایسی آواز نہیں سنی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسی آواز ہے؟" خوفو خوف سے لرزتے ہوئے بولا۔

"پ۔۔ پتا نہیں۔۔" ابنائیکے کے ماتھے پر بھی پسینہ چمک رہا تھا خوف کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا اندھیرا چاروں جانب پھیل چکا تھا چاند نے اپنی مدھم روشنی سے زمین کو منور کیا ہوا تھا چاند کی ملگجی روشنی میں ابنائیکے نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر چاروں اطراف لمبے لمبے درخت اور خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں کہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک گرجدار آواز پھر سنائی دی اور ساتھ ہی ایسا لگا جیسے کوئی اپنے سینے پر زور زور سے ہاتھ مار رہا ہو جس کی وجہ سے ڈھول بجنے جیسی آواز پیدا ہو رہی تھی مہیب سناٹے میں اور چاند کی مدھم روشنی میں یہ آواز جنگل کی ہیبت ناکی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اسی وقت چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا چاروں طرف اندھیرا چھا گیا سینہ پیٹنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی اچانک سینہ پیٹنے کی آواز آنا بند ہوگئی اور جھاڑیاں ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں چاند مکمل طور پر بادلوں سے ڈھک گیا تھا تاریکی مزید گہری ہوگئی تھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا چاروں اطراف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا جنگل میں دہشتناک سناٹا چھایا ہوا تھا یا جنگروں کے ٹرانے کی آواز سناٹے کو چیرتی محسوس ہو رہی تھی خوف سے ابنائیکے کا برا حال تھا اسی وقت ابنائیکے کو اپنے پیچھے ہل چل محسوس ہوئی پھر اسے خوفو کی دہشتناک چیخ سنائی دی۔

"کیا ہوا۔۔ کیا ہوا خوفو۔۔" ابنائیکے چیخا اور ساتھ ہی آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا مگر اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ابنائیکے کو کچھ بھی نظر نہیں آیا اسی وقت چاند نے بادلوں سے اپنا منہ نکالا اور اپنی روشنی جنگل میں بکھیری، چاند کی مدھم روشنی میں جو منظر ابنائیکے کو نظر آیا اسے دیکھ کر ابنائیکے کے ہوش اڑ گئے اس کے جسم کا سارا لہو خشک ہوگیا سامنے کا منظر دیکھ کر ابنائیکے خوف سے کانپ اٹھا۔

ابنائیکے نے دیکھا کہ اس سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر ایک سیاہی مائل دیو قامت بن مانس کھڑا تھا اس بن مانس کا قد کم از کم پندرہ فٹ سے زیادہ ہوگا اس

کے بازو اس کے قد کے حساب سے بہت لمبے چوڑے تھے اور سب سے بھیانک منظر یہ تھا کہ خوفو بن مانس کے مضبوط بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور خوفو کا سر بن مانس کے بڑے سے منہ کے اندر تھا بن مانس کے بڑے بڑے ہاتھ خوفو کے ٹکڑے کر رہے تھے صاف لگ رہا تھا کہ خوفو مر چکا ہے مگر خوفو کے پیر جو زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے ابھی تک ہوا میں ہل رہے تھے اتنے بڑے بن مانس کو دیکھ کر ابنائیکے خوف سے لرز اٹھا ابنائیکے کا رنگ بن مانس کو دیکھ کر خشک ہوگیا ابنائیکے کی آنکھوں میں موت کا خوف صاف نظر آ رہا تھا ابنائیکے کا بدن خوف کے مارے آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ بن مانس نے بھی ابنائیکے کو دیکھ لیا تھا ابنائیکے کو دیکھتے ہی بن مانس نے مردہ خوفو کو اپنے منہ سے نکالا اور ایک جانب پھینک دیا اور خوف سے لرزتے ابنائیکے کی جانب بڑھا ابنائیکے کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر خوف سے اس کے پیر زمین میں گڑ گئے تھے اس کے قدموں نے آگے بڑھنے نے انکار کر دیا ابنائیکے اپنی جگہ کھڑا بن مانس کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا ابنائیکے کی موت بن مانس کی صورت میں ابنائیکے کے قریب آتی جا رہی تھی بن مانس نے ابنائیکے کے پاس آ کر اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر دبانے لگا ابنائیکے کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی ساری پسلیاں اس کے دل میں گھستی جا رہی ہیں ابنائیکے کا سانس رکنے لگا اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور اس کا دم لبوں پر آ گیا۔

مگر اس سے پہلے کہ بن مانس ابنائیکے کو موت کے گھاٹ اتارتا ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور بن مانس کی گردن میں گھس گیا، تیر لگتے ہی بن مانس کی گردن سے خون کا فوارا بہہ نکلا، تیر لگنے کی تکلیف کی وجہ سے بن مانس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ابنائیکے بن مانس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔

زمین پر گرتے ہی ابنائیکے نے اپنی پوری قوت جمع کی اور رینگتا ہوا بن مانس سے دور چلا گیا اور ایک قد آور درخت کے پیچھے چھپ گیا اور وہاں سے بن مانس کو دیکھنے لگا بن مانس نے اپنی گردن میں پیوست تیر نکالا اور دور پھینک دیا اور ایک زوردار چنگھاڑ ماری، بن مانس کی چنگھاڑ سے جنگل گونج اٹھا۔

اسی وقت ابنائیکے نے دیکھا کہ ایک سیاہ پوش نوجوان گھوڑے پر بیٹھا بن مانس کے مقابل آ کھڑا ہوا اس سیاہ پوش کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اس نے اپنی تلوار سے بن مانس پر وار کیا پھر بن مانس اور سیاہ پوش کے درمیان خون ریز جنگ شروع ہوگئی۔

ابنائیکے کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں مگر وہ ہمت کر کے سیاہ پوش اور بن مانس کے درمیان ہونے والی جنگ دیکھ رہا تھا۔

اچانک سیاہ پوش نے اپنے گھوڑے سے اچھل کر ایک لمبی چھلانگ ماری اور ساتھ ہی اس کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اور بن مانس کا سر اس کے دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا، بن مانس کی کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارا بلند ہوا بن مانس کا جسم بغیر گردن کے چند قدم آگے بڑھا اور دھڑام سے زمین بوس ہوگیا ابنائیکے کو یہی آخری منظر یاد رہ گیا پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔

جب ابنائیکے کو ہوش آیا تو وہ جنگل سے باہر ایک آرام دہ جگہ پر لیٹا ہوا تھا اس کے پاس پانی کی چھاگل رکھی ہوئی تھی۔ ابنائیکے نے جلدی سے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا ابنائیکے کے سر میں درد کے دھماکے ہو رہے تھے ابنائیکے نے اپنے پاس رکھی چھاگل سے پانی پیا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے قبیلے کی جانب چل دیا اس کا ذہن مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ آخر اس کی جان کس نے بچائی، کون تھا اس کا محسن جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی اور پھر وہ محسن سامنے بھی نہیں آیا ابنائیکے یہی سب سوچتا ہوا اپنے قبیلے میں پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر اس نے اپنے سارے دوستوں کو جنگل کا واقعہ بتایا اور اپنے محسن کے متعلق پوچھا مگر اس کے سوال کا کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔

ابنائیکے شائد اس واقعہ کو بھول جاتا مگر چند ماہ بعد ایک نئے واقعے نے اس واقعے کی یاد تازہ کر دی۔

www.paksociety.com

اس دن ابنائیکے اپنے دوستوں شیاما اور لامبا کے ساتھ مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا ان کی کشتی مچھلیوں سے بھر گئی تھی آج دریا ابنائیکے پر بہت مہربان تھا جب بھی ابنائیکے جال دریا میں ڈالتا جال مچھلیوں سے بھر جاتا۔

"آج تو دریا ہم پر زیادہ ہی مہربان ہے ۔۔۔اتنی ساری مچھلیاں ہم لوگوں نے کبھی شکار نہیں کیں۔" ابنائیکے کا دوست شیاما بولا۔

"واقعی ۔۔۔آج تو ہم لوگوں نے اتنی مچھلیاں پکڑ لی ہیں کہ سارے قبیلے کی دعوت کر سکتے ہیں۔۔۔" ابنائیکے کا دوسرا دوست لامبا بھی بول اٹھا۔

اسی وقت دریا میں غیر معمولی ہل چل محسوس ہوئی۔

"یہ دریا میں اچھال کیسا ہے؟" ابنائیکے بولا اور غور سے دریا کے پانی میں دیکھنے لگا، اسی وقت دریا میں سے ایک بہت بڑے اژدھے نے اپنا منہ باہر نکالا اور ایک زور کی پھنکار ماری اژدھے کو دیکھ کر ابنائیکے اور اس کے دوستوں کی روح فنا ہوگئی ان تینوں کے چہرے سفید پڑ گئے اژدھے نے ان تینوں کی جانب دیکھ کر پھر ایک پھنکار ماری اور کشتی کی جانب بڑھنے لگا۔

"کشتی کو فوراً کنارے کی جانب لیکر چلو۔۔۔" ابنائیکے چیخا تو اس کے دوستوں نے جال دریا میں پھینک دیا اور چپو سنبھال کر کشتی کو کنارے کی جانب دھکیلنے لگے، اژدھے نے بھی کشتی کو دور جاتے دیکھا تو تیزی کی ساتھ کشتی کی جانب بڑھا اور کشتی کے قریب آتے ہی ایک زوردار پھنکار مارتے ہوئے کشتی پر حملہ کر دیا مگر کشتی میں موجود ابنائیکے ہاتھ میں تلوار لئے تیار کھڑا تھا اژدھے کے حملہ کرتے ہی ابنائیکے نے بھی اپنی تلوار سے اژدھے پر حملہ کر دیا ابنائیکے کی تلوار نے اژدھے کو گہرا زخم پہنچایا زخمی ہونے کے بعد اژدھے کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ غصے کے مارے دریا میں بل کھانے لگا اژدھے کے اس طرح دریا میں بل کھانے سے پانی میں مدوجزر پیدا ہو گیا اور اس مدوجزر میں کشتی معمولی تنکے کی طرح ڈولنے لگی ابنائیکے اور اس کے دوست کشتی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کشتی ایک معمولی تنکے کی طرح پانی میں ڈول رہی تھی۔

"کشتی میں رکھی مچھلیاں دریا میں پھینک دو تاکہ کشتی ہلکی ہو کر تیز چل سکے۔۔۔" ابنائیکے نے چیخ کر اپنے دوستوں کو کہا تو اس کا ایک دوست شیاما پتوار چھوڑ کر جلدی جلدی مچھلیاں دریا میں پھینکنے لگا، اژدھے نے کشتی کو کنارے جاتے دیکھ کر دریا میں ایک ڈوبکی لگائی اور جب اژدھا دریا کے پانی میں اوپر آیا تو وہ کشتی کے انتہائی قریب تھا کشتی کے قریب آتے ہی اژدھے نے اپنی دم کشتی کے پیندے میں ماری، اژدھے کے دم کی ضرب سے کشتی پانی کے اوپر زور سے اچھلی اور الٹ گئی کشتی الٹنے سے ابنائیکے اور اس کے دونوں دوست شیاما اور لامبا پانی میں گر پڑے، ابنائیکے کے ہاتھ سے تلوار بھی چھوٹ گئی پانی میں گرتے ہی ابنائیکے نے ایک ڈوبکی لگائی اور کنارے کی جانب تیرنے لگا، اچانک ابنائیکے کو اپنے پیچھے اپنے دوست شیاما کی چیخ سنائی دی، ابنائیکے نے تیرتے تیرتے مڑ کر دیکھا تو باوجود پانی میں ہونے کے ابنائیکے کے مساموں سے خوف کے مارے پسینہ بہہ نکلا اس کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اژدھے نے اپنائیکے کے دوست شیاما کو اپنے بڑے سے منہ میں دبوچ رکھا تھا شیاما کا سر سینے تک اژدھے کے منہ کے اندر تھا جبکہ اژدھے کے منہ سے باہر نکلی اس کی ٹانگیں مسلسل حرکت کر رہی تھیں، اژدھے نے ابنائیکے کے دوست شیاما کو سالم ہی نگل لیا۔ شیاما کو نگلنے کے بعد اژدھے نے ابنائیکے اور لامبا کی جانب بڑھنا شروع کیا، اژدھے کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ابنائیکے اور لامبا بھی تیزی کے ساتھ کنارے کی جانب تیرنے لگے ابنائیکے کافی تیزی کے ساتھ تیر رہا تھا اس کی کوشش تھی کہ اژدھے کے قریب آنے سے پہلے پہلے کنارے پر پہنچ جایا جائے، ابنائیکے اور لامبا تیزی سے تیرتے ہوئے کنارے پر پہنچنا ہی چاہتے تھے کہ اژدھے نے بھی شائد یہ بات محسوس کر لی تھی لہذا وہ بھی نہایت تیزی کے ساتھ ان دونوں کی جانب بڑھ رہا تھا ایک آدمی کو کھانے سے اژدھے کا پیٹ

نہیں بھرا تھا اس لئے وہ بار بار پھنکار کو دونوں کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ ابنائیکے اور لامبا کنارے پر پہنچتے ہی جنگل کی جانب بھاگے مگر اسی وقت اژدھا لامبا کے قریب پہنچ گیا اور اس نے تیزی کے ساتھ رینگتے ہوئے اپنا بڑا سا منہ کھولا اور لامبا کو اپنے منہ میں پکڑ کو زور کا جھٹکا دیا، اژدھے کا جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ لامبا کا جسم دو ٹکڑے میں تقسیم ہو گیا۔

لامبا کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی لامبا کے خون کے چھینٹے ابنائیکے کے چہرے پر پڑے تو ابنائیکے خوف سے لرز اٹھا اپنے دوست لامبا کی ایسی بھیانک موت دیکھ کر ابنائیکے پر سکتہ طاری ہو گیا، اژدھے نے لامبا کی لاش کے دونوں ٹکڑے ایک ساتھ ہی نگل لئے پھر اژدھا ابنائیکے کی جانب بڑھا۔

ابنائیکے اژدھے کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ابنائیکے کے قدم زمین میں گڑ گئے ابنائیکے بھاگنا چاہتا تھا مگر ابنائیکے کے پیروں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا ابنائیکے بے بسی سے کھڑا اژدھے کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا اژدھے نے ابنائیکے کے قریب آ کر اپنی دم سے ابنائیکے کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کیا ذرا سی دیر میں اژدھے نے ابنائیکے کو اپنی دم سے جکڑ لیا ابنائیکے بے حس و حرکت کھڑا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے ابنائیکے نے اپنی موت کو تسلیم کر لیا ہو اس کی آنکھیں ایک غیر مرئی چیز پر ٹکی ہوئی تھی۔

اژدھے نے ابنائیکے کے گرد گھیرا ڈالنے کے بعد گھیرے کو کسنا شروع کیا وہ شائد ابنائیکے کو دبا کر مارنا چاہتا تھا گھیرا کسنے کے بعد اژدھے نے اپنا منہ ابنائیکے کے چہرے کے سامنے کیا اور اور ایک زور کی پھنکار ماری اژدھے کی پھنکار سن کر ابنائیکے ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا، اژدھے کی پھنکار کی وجہ سے ابنائیکے کا چہرہ اژدھے کے لعاب سے نہا گیا ابنائیکے کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا چہرہ آگ میں جھلس گیا ہو ابنائیکے کے منہ سے بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں مگر وہاں ابنائیکے کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اژدھا ابنائیکے کے گرد ڈالے بل کو مزید کسنے لگا ابنائیکے کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پسلیاں ٹوٹ کر اس کے دل میں گھسنے والی ہیں، ابنائیکے کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی اژدھے نے ایک بار پھر ابنائیکے کے چہرے کے سامنے اپنا بڑا سا منہ کھول کر ایک پھنکار ماری اور اپنی دو شاخہ زبان سے ابنائیکے کے گال کو چاٹنے لگا ابنائیکے خوف سے لرز رہا تھا پھر اژدھے نے اپنا بڑا سا منہ کھولا تاکہ ابنائیکے کو نگل سکے ابنائیکے کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی موت کا وقت آ چکا ہے اژدھا اسے سالم ہی نگل جائے گا۔

جیسے ہی اژدھے نے اپنا منہ کھولا تاکہ ابنائیکے کو کھا سکے اسی وقت ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اژدھے کی گردن میں پیوست ہو گیا تیر کی تکلیف سے گھبرا کر اژدھے نے ایک پھنکار ماری اور ابنائیکے کے گرد پڑے اپنے بل کو مزید کسنے لگا ابنائیکے کی جان لبوں پر آ گئی اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا ابنائیکے کو اپنی پسلیاں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

اسی وقت ایک اور تیر سنسناتا ہوا آیا اور اژدھے کے کھلے بڑے سے منہ کے اندر گھس گیا اور سیدھا اژدھے کے تالو میں جا لگا۔

اژدھا اس ناگہانی تکلیف سے گھبرا گیا اور ابنائیکے کے گرد پڑے بل پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی، ابنائیکے کی سانسیں بحال ہو رہی تھیں، اسی وقت ابنائیکے نے اپنی بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا ایک سیاہ پوش گھوڑے پر بیٹھا وہاں آیا اور اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اژدھے کے قریب پہنچا، اس سیاہ پوش کے ہاتھ میں تلوار تھی اس سیاہ پوش نے تلوار کے ایک ہی وار سے اژدھے کا سر اس کے دھڑ سے الگ کر دیا، اژدھے کی کٹی گردن سے خون ابل پڑا اور ابنائیکے اژدھے کے گرم گرم خون میں نہا گیا، یہ آخری منظر تھا جو ابنائیکے کو یاد رہ گیا پھر وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

جب ابنائیکے کو ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

"ہم۔۔۔میں کہاں ہوں۔۔۔" ابنائیکے نے اپنی گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سردار۔۔۔سردار۔۔ابنائیکے کو ہوش آگیا۔۔"

ایک آدمی ابنائیکے کو ہوش میں آتا دیکھ کر باہر کی جانب دوڑا۔

تھوڑی دیر میں سردار رائیل اور ابنائیکے کے قبیلے کے چند معززین کمرے میں داخل ہوئے۔

"ابنائیکے اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟۔۔" سردار رائیل نے آگے بڑھ کر ابنائیکے کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ابنائیکے سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔م۔۔مگر میں یہاں کیسے پہنچا؟۔۔" ابنائیکے نے جواب دینے کے بعد حیرانگی سے پوچھا۔

"تم ہمیں۔۔قبیلے کے باہر بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے۔۔" سردار رائیل نے ابنائیکے کے سوال کا جواب دیا پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"ابنائیکے۔۔۔تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، تمہارے دونوں دوست کہاں ہیں جن کے ساتھ تم شکار پر گئے تھے۔؟"

"شیاما اور لامبا۔۔" ابنائیکے کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والا سارا واقعہ بتایا کہ کس طرح ایک سیاہ پوش نے اس کی جان خطرناک اژدھے سے بچائی۔

"کون ہوسکتا ہے تمہارا نادیدہ محسن جس نے تمہاری جان بچائی اور پھر تمہیں قبیلے کے باہر ہی چھوڑ کر چلا گیا۔" سردار رائیل سوچتے ہوئے بڑبڑائے۔

سردار رائیل کی بات سن کر ابنائیکے بھی سوچ میں ڈوب گیا۔ "آخر وہ سیاہ پوش کون ہے؟ جس نے دو بار اس کی جان بچائی۔"

☆.....☆.....☆

ابنائیکے سنبھل سنبھل کے قدم رکھ رہا تھا راستہ بہت مشکل اور خطرناک تھا لہٰذا ابنائیکے نہایت آہستگی کے ساتھ مضبوطی سے قدم جما جما کر آگے بڑھ رہا تھا ابنائیکے کالبی دیوتا کے مندر جارہا تھا کالبی دیوتا کا مندر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر بنی ایک گپھا میں تھا، کالبی دیوتا کے گپھا میں جانے والا راستہ نہایت خطرناک اور مشکل تھا، کالبی دیوتا کے گپھا تک جانے اور وہاں منت مانگنے کا مشورہ ابنائیکے کو ششمایا نے دیا تھا کیونکہ افریقہ بھر میں یہ بات مشہور تھی کہ جو شخص کالبی دیوتا کے گپھا تک جا کر کالبی دیوتا سے جو مانگتا ہے اسے وہ مل جاتا ہے لہٰذا ششمایا کے مشورے پر ابنائیکے کالبی دیوتا کے مندر جارہا تھا تاکہ کالبی دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیک کر مدد مانگ سکے۔

کیونکہ چند دن بعد سالانہ میلہ شروع ہونے والا تھا، سالانہ میلے کے ساتھ ہی لوگوں کو پچھلے سال ہونے والا خونی مقابلہ بھی یاد آگیا تھا اور ہر جانب نقاب پوش کے تذکرے ہونے لگے تھے، ابنائیکے کو خطرہ تھا کہ کہیں اس بار بھی کوئی سر پھرا اس کے مقابلے پر نہ آجائے اس لئے ابنائیکے کالبی دیوتا کی گپھا میں ماتھا ٹیکنے اور کالبی دیوتا سے مدد مانگنے جارہا تھا۔

گپھا تک جانے والا راستہ بڑا جوکھم بھرا تھا تمام راستہ نوکیلے سنگریزوں سے بھرا ہوا تھا اس لئے ابنائیکے نے اپنے پیروں میں جوان بھینسے کی کھال کے بنے جوتے پہن رکھے تھے تاکہ اس کے پیر نوکیلے سنگریزوں سے زخمی نہ ہوجائیں ابنائیکے کے قدموں تلے آکر کئی سنگریزے پہاڑ کے اوپر سے نیچے گہری کھائی میں گر رہے تھے ابنائیکے احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا اسے چلتے چلتے بہت دیر ہوچکی تھی وہ پہاڑ پر بہت اوپر آچکا تھا مگر ابھی کالبی دیوتا کا گپھا بہت دور تھا، ابنائیکے نے ایک جگہ رک کر اپنی کمر سے پانی کی چھاگل کھولی اور چھاگل میں سے دو گھونٹ پانی پیا پھر اس نے اپنے بائیں اور دائیں جانب دیکھا اس کے بائیں جانب اونچا پہاڑ تھا جبکہ اس کے دائیں جانب گہری کھائی تھی، کھائی میں دیکھنے سے ابنائیکے کو جھرجھری آگئی اگر وہ اس کھائی میں گر گیا تو ۔۔۔یہ سوچ کر ابنائیکے نے ایک جھرجھری بھری اور منفی خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا پھر ابنائیکے نے چھاگل اپنی کمر سے باندھی اور پہاڑ پر اوپر کی سمت سفر شروع کیا آہستہ آہستہ ابنائیکے اپنا سفر طے کرتا جارہا آخر کار وہ کالبی دیوتا کے گپھا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

ابنائیکے نے گپھا کے سامنے پہنچ کر چند منٹ اپنی

پھولی سانسیں درست کیں اور پھر کالبی دیوتا کے گپھا میں داخل ہوگیا۔ گپھا میں ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی، ابنائیکے احتیاط سے آگے بڑھا، ابنائیکے اپنے بچپن میں ایک بار اپنے والد کے ساتھ کالبی دیوتا کے درشن کو آیا تھا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ ابنائیکے اسی یادداشت کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ گپھا میں دائیں جانب پتھروں کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو نیچے کی جانب جارہی تھیں، ابنائیکے نے آگے بڑھ کر ان سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا اور نیچے اترنے لگا۔

بوسیدہ پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیاں بہت خطرناک تھیں، ابنائیکے کے پیر بار بار سیڑھیوں سے پھسل رہے تھے لہٰذا ابنائیکے احتیاط کے ساتھ مضبوطی سے قدم جما کر سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر ابنائیکے ایک قدرے کھلی جگہ میں پہنچ گیا یہاں سے بائیں جانب کچھ اور سیڑھیاں نیچے کی جانب جارہی تھیں، لہٰذا ابنائیکے ان سیڑھیوں کی جانب چل دیا اور ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا کالبی دیوتا کے گپھا میں برسوں میں کوئی آتا تھا لہٰذا یہاں کا ماحول کافی ہیبت ناک تھا جگہ جگہ چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں بڑی بڑی مکڑیاں اپنے جال میں بیٹھی ابنائیکے کو گھور رہی تھیں۔ بیس تیس سیڑھیاں اترنے کے بعد ابنائیکے کو ایک دروازہ نظر آیا ابنائیکے اس دروازے میں داخل ہوگیا دروازے میں داخل ہوکر ابنائیکے ایک گول راہداری میں پہنچ گیا راہداری کی چھت بہت نیچی تھی لہٰذا ابنائیکے کو جھک کر چلنا پڑ رہا تھا راہداری ختم ہونے پر ابنائیکے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں پہنچ گیا پہاڑ کے اتنے اندر بنے ہونے کے باوجود اس ہال نما کمرے میں کافی روشنی اور ہوا موجود تھی یہاں پہنچ کر ابنائیکے نے کمرے کا جائزہ لیا کمرے میں عجیب سی پر اسراریت چھائی ہوئی تھی کمرے کی دیواروں پر خونی تصاویر بنی ہوئی تھیں کمرے کی دیوار پر بنی ہر تصویر میں خوف کا عنصر نمایاں تھا دیوار پر بنی ایک تصویر میں جلاد ایک شخص کی گردن اڑا رہا تھا جبکہ دوسری تصویر میں سانپ ایک آدمی کو ڈس رہا تھا ایک تصویر میں ایک بادشاہ اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ دربار لگائے بیٹھا تھا بادشاہ کے اطراف اس کے درباری مؤدب انداز میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے جبکہ بادشاہ کے سامنے جلاد ایک شخص کے سر پر ہتھوڑا مارنے والا تھا۔ جلاد جس شخص کے سر پر ہتھوڑا مارنے والا تھا اس شخص کے چہرے کے تاثرات نہایت قابلِ رحم تھے اس کی آنکھوں میں موت کا خوف صاف نظر آرہا تھا۔

مصور نے اتنی عمدہ تصویر کشی کی تھی کہ لگتا تھا گویا اصل دربار میں کسی شخص کو سزا دی جارہی ہے ابنائیکے بھی مصور کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ سامنے اونچے چبوترے پر کالبی دیوتا کا مجسمہ رکھا تھا کالبی دیوتا کے ساتھ ایک حسین عورت کا قدآدم مجسمہ بھی رکھا تھا اور اس مجسمے کے اطراف میں چند اور قدآدم مجسمے رکھے تھے کالبی دیوتا کی سرخ سرخ آنکھیں ابنائیکے کو اپنے جسم میں اترتی محسوس ہورہی تھیں ابنائیکے دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔

اسی وقت ابنائیکے کو کڑچ کڑچ کی آواز آئی اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑے ابنائیکے نے بوکھلا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ خوف سے لرز اٹھا اس کے چہرے پر پڑنے والے چھینٹے پانی کے نہیں تھے بلکہ وہ چھینٹے خون کے تھے۔

ابنائیکے نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو اس کی نظر دیوار پر بنی اس تصویر پر پڑی جہاں جلاد ہتھوڑے سے ایک آدمی کا سر کچل رہا تھا اب اس تصویر میں جلاد نے اس آدمی کا سر کچل دیا تھا اور اس کے سر سے خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور وہ چھینٹے ہی ابنائیکے کے چہرے پر گرے تھے ابنائیکے گھبرا گیا۔

"یہ۔۔۔یہ کیا جادو ہے۔۔۔"

اسی وقت کمرے میں انتہائی تیز روشنی پھیل گئی روشنی اتنی تیز تھی کہ ایک لمحے کو ابنائیکے کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا چند لمحوں بعد ابنائیکے دیکھنے کے قابل ہوا تو۔۔۔تو وہ خوف سے لرز اٹھا کالبی دیوتا کے ساتھ کھڑی لڑکی اور دیگر مجسمے اس کی جانب بڑھ رہے تھے لڑکی کا چہرہ مکمل سفید تھا اس کی

آنکھوں کی پتلیاں تک سفید تھیں جبکہ اس کے ساتھ دیگر تمام مجسموں کے چہرے سیاہ تھے، وہ سارے مجسمے ابنائیکے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسی وقت لڑکی کے مجسمے سے آواز نکلی۔

"دھوکے باز۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔ یہ جھوٹا ہے اسے سزا ملنی چاہئے۔"

"دھوکے باز۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔" باقی تمام مجسمے بھی چیخنے لگے۔

"نہیں۔۔ نہیں۔۔۔ میں دھوکے باز نہیں ہوں۔۔۔" ابنائیکے چیخا اور واپسی کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔

ابنائیکے کو بھاگتا دیکھ کر لڑکی کے مجسمے نے اپنا ایک ہاتھ آگے کیا اور ابنائیکے کے سامنے کی زمین اندر کو دھنس گئی ابنائیکے دھڑام سے اس گڑھے میں گر گیا ابنائیکے اس گڑھے میں نیچے ہی نیچے گرتا جا رہا تھا اس کے منہ سے بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں ابنائیکے کی ہر چیخ کے ساتھ سارے مجسمے قہقہے لگا رہے تھے پھر سارے مجسمے اپنی پرانی جگہ پر واپس آگئے اور دوبارہ بے جان ہو کر کھڑے ہو گئے۔

ابنائیکے گڑھے میں پڑا مسلسل چیخ رہا تھا اس کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے کیا کالبی دیوتا نے اس سے انتقام لیا ہے کہ پچھلے سال اس نے دھوکے سے نقاب پوش کو ہرایا تھا، ابنائیکے کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا وہ زور زور سے چیخ رہا تھا مگر وہاں اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔

چیختے چیختے ابنائیکے تھک گیا اس نے گڑھے کا جائزہ بھی لیا مگر گڑھا اتنا گہرا تھا کہ بغیر کسی کی مدد کے گڑھے سے نکلنا ممکن نہ تھا۔

وقت گزرتا گیا ابنائیکے اپنی زندگی سے مایوس ہونے لگا اسے ایک ایک کر کے اپنے دوست احباب یاد آنے لگے اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اسی وقت اوپر سے ایک رسی نیچے ابنائیکے کی جانب آئی۔

"کون ہے۔۔ اوپر۔۔۔ میں یہاں پھنس گیا ہو۔۔" ابنائیکے زور سے چیخا مگر اوپر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

"کون ہے اوپر۔۔۔" ابنائیکے پھر چیخا۔

"اس رسی کو پکڑ کر اوپر آجاؤ۔۔" اوپر سے ایک گھٹی گھٹی آواز آئی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی آواز بدل کر بول رہا ہو۔ ابنائیکے نے جلدی سے رسی کو اپنی کمر کر گرد باندھا اور رسی کے سہارے اوپر کی جانب بڑھنے لگا۔ بڑی کوششوں کے بعد ابنائیکے اس گڑھے میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ گڑھے سے نکلنے کے بعد ابنائیکے نے دیکھا رسی کا دوسرا سرا ایک بڑے سے پتھر سے بندھا ہوا ہے اور رسی کے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ اوپر کسی کو نہ پا کر ابنائیکے حیران رہ گیا اور سوچنے لگا وہ کون شخص تھا جس نے اس کی مدد کی اور اس کی جان بچائی۔ ابنائیکے نے گھما میں سب طرف ڈھونڈا مگر اسے اپنا محسن نہ مل سکا جس نے ایک بار پھر اس کی جان بچائی تھی۔ ابنائیکے کالبی دیوتا کی گپھا سے باہر نکلا اور پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔ سارے راستے ابنائیکے اپنے نادیدہ محسن کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے اس سال تین بار اس کی جان بچائی تھیں مگر۔۔۔۔ مگر خود کبھی سامنے نہیں آیا۔

☆.....☆.....☆

ہر سال کی طرح اس سال بھی سالانہ میلے کی تیاریاں عروج پر تھیں افریقہ کے باسی نہایت جوش وخروش کے ساتھ سالانہ میلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سالانہ میلے کے دن قریب آتے جا رہے تھے سالانہ میلے کی تیاری کے ساتھ افریقہ کے ہر باسی کی زبان پر پچھلے سال ہونے والے خونی مقابلے کا تذکرہ تھا ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ "کیا وہ نقاب پوش زندہ ہے یا نہیں، اور اگر وہ زندہ ہے تو کیا اپنے وعدے کے مطابق اس سال بھی ابنائیکے کے مقابلے پر آئے گا؟"

آخر کار سالانہ میلے کا دن آپہنچا افریقہ کے باسیوں کے لئے یہ میلہ خوشی ومسرت کا موقع تھا، لہٰذا ہر شخص خوشی سے سرشار تھا، تمام قبائل کے لوگ اپنے اپنے قبیلے کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے مقابلے کی

جگہ جمع ہو رہے تھے۔ جیتنے والے خوشی کا اظہار رقص کر کے کر رہے تھے جبکہ ہارنے والے اگلے سال کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ کئی دن تک یہ میلہ جاری رہا آخر کار میلے کا آخری دن آپہنچا اس دن کا انتظار افریقہ کا ہر باسی کر رہا تھا۔ افریقہ کے سب سے بہادر آدمی کے لئے تلوار بازی کا مقابلہ شروع ہوا جاتا تھا ابنائیکے اپنی تلوار لہراتا ہوا میدان میں داخل ہوا اور تلوار بازی کے کرتب دکھانے کے بعد اپنی تلوار لہراتا ہوا بولا۔

"ہے کوئی جوان جو ابنائیکے کی تلوار کی تیزی کو روک سکے، کسی شیر جوان کا اتنا جگرا ہے جو ابنائیکے کے مقابل میں آنے کی جرأت کر سکے۔" ابنائیکے میدان میں کھڑا مجمع کو للکار رہا تھا پورے مجمع پر سکوت طاری تھا جب کوئی شخص میدان میں نہیں آیا تو ابنائیکے نے اپنی تلوار زمین میں گاڑ دی اور سردار رابیل کی جانب رخ کر کے بولا۔ "سردار۔۔ میری جیت کا اعلان کیا جائے۔"

سردار رابیل اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر سردار رابیل نے پورے مجمع پر نظر ڈالی۔۔۔ مگر اس سے پہلے کے سردار رابیل ابنائیکے کی جیت کا اعلان کرتے ایک پاندار آواز آئی۔

"ٹھہرو۔۔" اس آواز نے سب کو چونکا دیا سارا مجمع آواز کی سمت دیکھنے لگا آواز کی سمت دیکھتے ہی سارے مجمع میں شور مچ گیا ہر شخص تالیاں بجانے لگا شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی کیونکہ میدان کے وسط میں وہی نقاب پوش کھڑا تھا جس نے پچھلے سال ابنائیکے کا مقابلہ کیا تھا اس نقاب پوش نے آگے بڑھ کر ابنائیکے کی تلوار زمین سے نکالی اور ابنائیکے کی جانب اچھال دی پھر اس نقاب پوش نے میان سے اپنی تلوار نکالی اور میدان میں تلوار لہرانے لگا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ ابنائیکے کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

مجمع حیرت سے نقاب پوش کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ کیونکہ نقاب پوش کا اب صرف ایک ہاتھ تھا۔ صرف دایاں ہاتھ۔۔۔ بائیں ہاتھ کی جگہ خالی آستین لٹک رہی تھی۔

"نوجوان۔۔ تم واقعی جی دار ہو۔۔۔" ابنائیکے اپنی تلوار سنبھالتے ہوئے بولا۔ "کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔۔ اب تو تمہارا صرف ایک ہی ہاتھ باقی رہ گیا ہے۔۔ اپنے آپ پر رحم کھاؤ۔۔"

"ابنائیکے۔۔۔ زیادہ باتیں نہ بگھارو۔۔۔ جلدی سے مقابلہ شروع کرو۔۔۔ میں نے بہت انتظار کیا ہے اس دن کا۔۔۔ اور۔۔۔ آج اپنے سارے دوستوں سے کہہ دے اپنے تیر کمانوں پر چڑھا لیں۔۔ آج۔۔ تجھے میرے ہاتھوں مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" نقاب پوش کی آواز میں بجلی کی کڑک تھی۔

اسی وقت سردار رابیل نے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔۔

"آج کے مقابلے کی ساری ذمہ داری میری ہے اگر۔۔ کسی نے اس مقابلے میں دخل اندازی کی کوشش کی تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔۔"

یہ اعلان کر کے سردار رابیل نے ناقوس بجانے والے کو اشارہ کیا تو اس نے ناقوس بجا کر مقابلہ شروع کرنے کا اعلان کیا۔

ابنائیکے اور نقاب پوش تلوار سونتے میدان کے وسط میں ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑے تھے دونوں مختلف پینترے بدل رہے تھے دونوں کی نظریں ایک دوسرے کی تلواروں پر جمی ہوئی تھیں پہلا وار ابنائیکے نے کیا۔

ابنائیکے کے حملے میں وحشیانہ پن تھا جبکہ نقاب پوش نہایت پرسکون تھا ابنائیکے نے اپنی تلوار سے نقاب پوش پر بھرپور وار کیا، مگر نقاب پوش نے نہایت اطمینان کے ساتھ ابنائیکے کا وار ناکام بنایا پھر ابنائیکے نے نقاب پوش کے سر کو نشانہ بنایا اور اپنی تلوار سے نقاب پوش کے سر پر وار کیا نقاب پوش نے ابنائیکے کے اس وار کو اپنی تلوار پر روکا پھر دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکرانے لگیں دونوں پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔

پورا مجمع سانس روکے یہ خونی مقابلہ دیکھ رہا تھا لوگ پلک تک جھپکانا بھول گئے تھے پورے میدان میں

صرف تلواروں کی ٹکرانے کی جھنکار سنائی دے رہی تھی، ابنائیکے بڑھ بڑھ کر وار کر رہا تھا مگر نقاب پوش ابنائیکے کے ہر وار کو نہایت سکون کے ساتھ ناکام بنا رہا تھا اچانک ابنائیکے نے نقاب پوش کے داہنے طرف ایک بھرپور وار کیا، نقاب پوش نے ابنائیکے کا وار اپنی تلوار پر روکا، اسی وقت ابنائیکے نے بجلی کی تیزی سے اپنے بائیں ہاتھ کا مکا نقاب پوش کے سینے کے بائیں جانب دل کے مقام پر رسید کیا چونکہ نقاب پوش کا بایاں ہاتھ نہیں تھا لہذا نقاب پوش ابنائیکے کا یہ وار نہ روک سکا اور ابنائیکے کا مکا پوری قوت سے نقاب پوش کے سینے سے ٹکرایا اور نقاب پوش ابنائیکے کے مکے کی تاب نہ لاکر پیچھے کی جانب الٹ کر گر پڑا، ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے تلوار بھی چھوٹ گئی۔

ابنائیکے کے پاس یہ بہت اچھا موقع تھا لہذا اس نے آگے بڑھ کر زمین پر گرے نقاب پوش پر وار کیا، مجمع میں موجود تمام لوگوں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کرلیں ہر شخص کو یقین تھا کہ ابنائیکے کی تلوار زمین پر گرے نقاب پوش کے سینے میں اتر جائے گی۔

مگر نقاب پوش ابنائیکے اور مجمع کی توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا جیسے ہی ابنائیکے نے نقاب پوش پر وار کیا نقاب پوش نے فوراً کروٹ بدل لی ابنائیکے کی تلوار پوری قوت سے زمین سے ٹکرائی۔ کروٹ بدلتے ہی نقاب پوش نے اپنی دونوں لاتیں ابنائیکے کی کمر پر زور سے رسید کی ابنائیکے اچھل کر دور جا گرا۔

نقاب پوش کے لئے اتنی مہلت کافی تھی وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور اس نے زمین پر پڑی اپنی تلوار بھی اٹھالی، ابنائیکے بھی گرتے ہی فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں ایک بار پھر تلوار سونتے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو گئے اس بار نقاب پوش نے حملہ کرنے میں پہل کی اور پوری قوت سے ابنائیکے پر وار کیا، ابنائیکے نے پیچھے ہٹتے ہوئے نقاب پوش کا وار روکنا چاہا مگر ابنائیکے سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔

نقاب پوش کی تلوار ابنائیکے کی تلوار سے ٹکراتی ہوئی ابنائیکے کے سینے کی جانب آئی ابنائیکے پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹا مگر نقاب پوش کا وار بہت تیز تھا، نقاب پوش کی تلوار نے ابنائیکے کے سینے پر پیٹ تک ایک گہری خراش ڈال دی، خراش اتنی گہری تھی کہ وہاں سے خون ابل پڑا، ابنائیکے مزید پیچھے ہٹا اور اپنا جائزہ لینے لگا خون زیادہ نہیں بہہ رہا تھا ابنائیکے نے ہاتھ سے خون صاف کیا اور نقاب پوش پر وار کرنے لگا ابنائیکے نہایت وحشیانہ انداز میں وار کر رہا تھا۔

سارا مجمع دم سادھے مقابلہ دیکھ رہا تھا ہر شخص کی آنکھیں میدان میں گڑی ہوئی تھیں سب نہایت انہماک سے یہ خونی مقابلہ دیکھ رہے تھے۔

اچانک ابنائیکے نے اچھل کر نقاب پوش کے سر پر وار کرنا چاہا، نقاب پوش نے تلوار سر سے اوپر کر کے ابنائیکے کا وار اپنی تلوار پر روکا تو ابنائیکے نے فوراً پینترا بدلا اور نقاب پوش کی ٹانگوں پر وار کیا مگر نقاب پوش نے ابنائیکے کے اس وار کو بھی ناکام بنا دیا پھر ابنائیکے پینترے بدل بدل کر نقاب پوش پر وار پر وار کرتا جا رہا تھا مگر نقاب پوش ابنائیکے کے ہر وار کو ناکام بناتا جا رہا تھا۔

دونوں کو لڑتے لڑتے کافی دیر ہو چکی تھی ابنائیکے کے بازو آہستہ آہستہ شل ہو رہے تھے مگر نقاب پوش نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا وہ اب بھی نہایت جوش و خروش کے ساتھ ابنائیکے کا مقابلہ کر رہا تھا لڑتے لڑتے ابنائیکے کو ایک موقع ملا اس نے نقاب پوش کے بائیں جانب ایک بھرپور وار کیا نقاب پوش پھرتی کے ساتھ گھوم گیا ابنائیکے کی تلوار نے نقاب پوش کی بائیں آستین کو کاٹ ڈالا چونکہ نقاب پوش کا بایاں ہاتھ تو تھا ہی نہیں لہذا ابنائیکے کی تلوار صرف نقاب پوش کی آستین کو ہی نقصان پہنچا سکی۔

اسی وقت گھومتے ہوئے نقاب پوش نے نہایت تیزی کے ساتھ ابنائیکے پر وار کیا ابنائیکے نے نقاب پوش کا وار اپنی تلوار پر روکنا چاہا مگر افسوس ابنائیکے کو دیر ہو گئی، نقاب پوش کا وار نہایت بھرپور اور تیز تھا، نقاب پوش کی تلوار نے ابنائیکے کی دائیں ہاتھ کو کہنی کے پاس سے کاٹ کر ابنائیکے کے جسم سے الگ کر دیا۔

ابنائیکے کی بھیانک چیخ میدان میں گونجی، ابنائیکے کی چیخ اتنی بھیانک اور دردناک تھی کہ مجمع کا دل دہل گیا

ابنائیکے کا دایاں ہاتھ ابنائیکے کے جسم سے علیحدہ ہو کر زمین پر پڑا تھا۔

ابنائیکے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے کٹے ہوئے دائیں ہاتھ کو سنبھال رہا تھا، ابنائیکے کے ہاتھ سے خون کا فوارا نکل رہا تھا۔ میدان میں خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا ابنائیکے اپنے بائیں ہاتھ سے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خون ابل ابل کر زمین کو سرخ کر رہا تھا، ابنائیکے اپنے زخمی ہاتھ کو سنبھالتے ہوئے میدان میں بیٹھ گیا۔

نقاب پوش نے آگے بڑھ کر اپنے پیر کی ٹھوکر ابنائیکے کو ماری تو ابنائیکے زمین پر چت گر پڑا پھر نقاب پوش نے اپنا دایاں پیر ابنائیکے کے سینے پر رکھا اور اپنی تلوار کی نوک ابنائیکے کے نرخرے کے ساتھ لگا دی، پھر نقاب پوش نے نظر اٹھا کر مجمع کی جانب دیکھا اور ابنائیکے کے سینے پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا

''ابنائیکے آج میں تجھے اس میدان میں قتل کر کے اس دھوکے بازی اور بے ایمانی کا بدلہ لونگا جو پچھلے سال تو نے میرے ساتھ کی تھی۔

ابنائیکے تو میرا شکار تھا اس لئے میں نے تجھے بن مانس کے ہاتھوں نہ مرنے دیا۔ ابنائیکے تو میرا شکار تھا میں تیری گردن اس میدان میں اتارنا چاہتا تھا اس لئے میں نے تجھے اژدھے کا نوالہ نہیں بننے دیا، ابنائیکے میں تجھے ان سب لوگوں کے سامنے مارنا چاہتا تھا اس لئے میں نے تجھے کالبی دیوتا کے گھیا میں نہ مرنے دیا اور آج میں تجھ سے اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کا پورا بدلہ لونگا، آج میں تیرا سر تیرے دھڑ سے الگ کر دونگا، آج میرے سینے میں جلتی انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔۔۔۔۔''

نقاب پوش للکار رہا تھا اور ادھر زمین پر پڑا ابنائیکے حیران تھا جس سیاہ پوش نے تین بار اس کی جان بچائی تھی ۔۔وہ یہی نقاب پوش تھا۔

''تو وہ تم تھے دوست۔۔۔۔تم نے میری جان بچائی وہ بھی ایک بار نہیں۔۔تین بار۔۔۔میرے دوست تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو مگر میں تمہیں اپنا محسن اور دوست سمجھتا ہوں۔۔۔۔یہ جان تو تمہاری ہی بخشی ہوئی ہے۔۔چلو جلدی کرو اپنی قسم پوری کرو۔۔اپنے انتقام کی آگ کو میرے لہو سے ٹھنڈی کر لو۔۔۔'' اتنا کہہ کر ابنائیکے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ منتظر تھا کہ کب نقاب پوش کی تلوار اس کا سر اس کے دھڑ سے الگ کرتی ہے۔

ابنائیکے آنکھیں بند کئے زمین پر پڑا تھا اچانک ابنائیکے کو اپنے سینے پر سے دباؤ ہٹتا ہوا محسوس ہوا پھر نقاب پوش کی گرجدار آواز سنائی دی۔

''ابنائیکے تو نے مجھے دوست کہہ کر میرے ہاتھوں میں زنجیر ڈال دی۔۔۔میں دوستوں کو قتل نہیں کرتا اور نہ ہی دوستوں سے انتقام لیتا ہوں۔۔جا ابنائیکے میں نے تجھے معاف کیا۔۔۔'' اتنا کہہ کر نقاب پوش نے اپنی تلوار میان میں رکھ لی اور اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر سیٹی بجائی۔ نقاب پوش کی سیٹی کی آواز سن کر ایک سفید گھوڑا دوڑتا ہو میدان میں آ گیا، نقاب پوش اچھل کر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔

''ٹھہرو دوست۔۔۔'' اس سے پہلے کہ نقاب پوش گھوڑے کو دوڑاتا ہوا میدان سے چلا جاتا، ابنائیکے اس کے گھوڑے کے سامنے کھڑے ہوتے بولا۔ ''دوست اپنا تعارف نہیں کراؤ گے۔''

ابنائیکے کی بات سن کر نقاب پوش رک گیا پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنا نقاب اتار دیا اور ابنائیکے کی جانب دیکھ کر بولا '' میں ہوں ڈونگا قبیلے کا ہونے والا سردار۔۔۔سردار رانگا کا بیٹا۔۔۔سردار سانگا۔۔۔'' اتنا کہہ کر نقاب پوش نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میدان سے چلا گیا۔

''یہ تھا میرا بیٹا۔۔۔یہ تھا۔۔ڈونگا قبیلے کا ہونے والا سردار۔۔۔سردار سانگا۔۔۔'' سردار رابیل کے ساتھ بیٹھے سردار رانگا نے سردار رابیل سے کہا۔

''تمہارا بیٹا عظیم ہے، وہ افریقہ کے سب سے بہادر آدمی کے خطاب کا حقیقی حقدار ہے۔۔۔'' سردار رابیل نے عقیدت سے سردار رانگا کے ہاتھ دباتے ہوئے کہا تو سردار رانگا نے سردار رابیل کو گلے سے لگا لیا۔

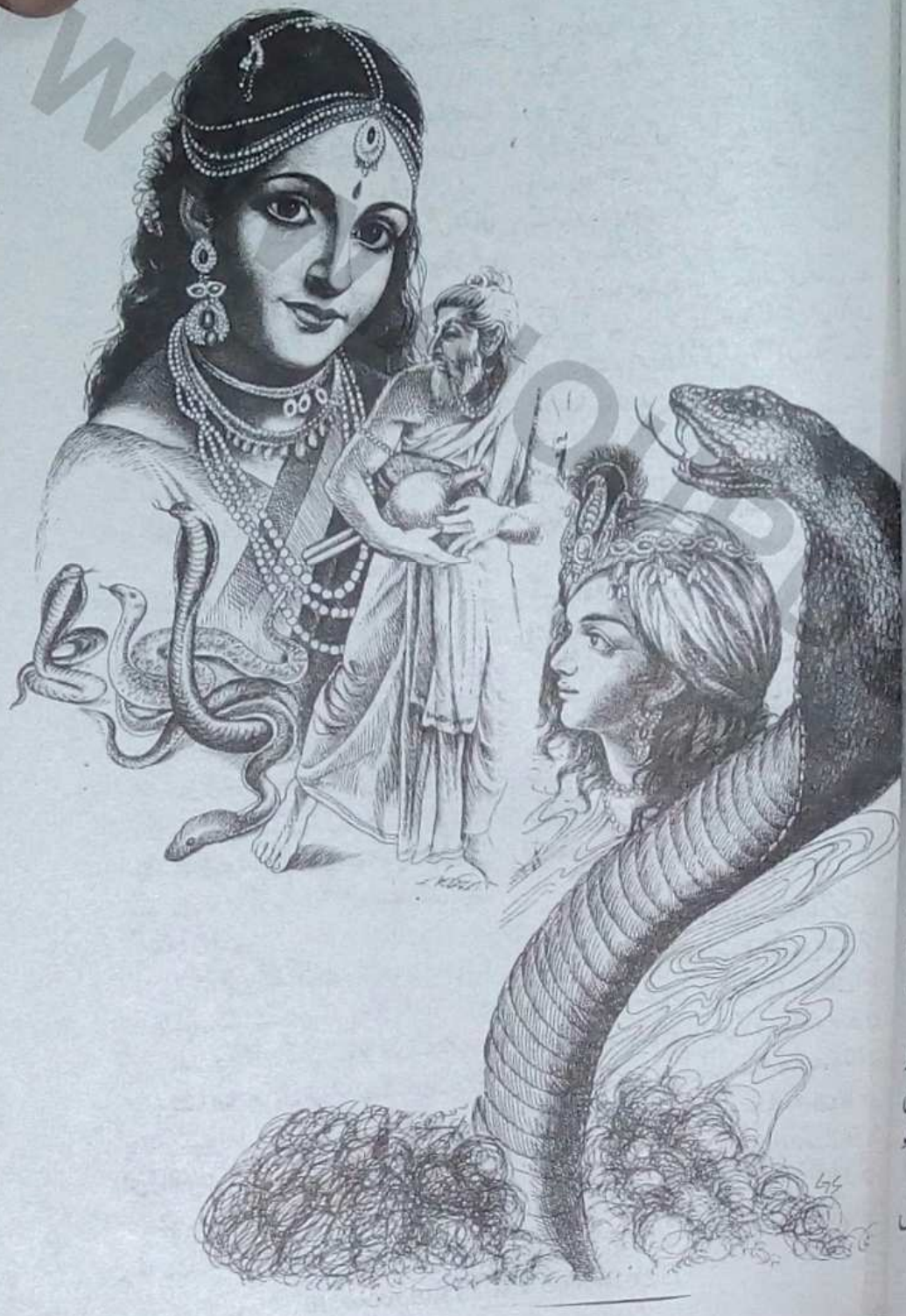

ضدی ناگن

ملک این اے کاوش۔سلانوالی سرگودھا

قسط نمبر:1

نفسانی خواہشات کی بدولت خون کی ندیاں بہتی رہیں، ہر طرف ویرانی اور اداسی کا دور دورہ تھا، انا پرستی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، دل والے دل کے ہاتھوں بے چین تھے کہ اتنے میں حقیقت کھل کر سامنے آگئی، دل گرفتہ اور دل شکستہ داستان زندگی

خودغرضی،اور مطلب پرستی کی ناقابل یقین دل ودماغ کو تھرادینے والی خونی کہانی

ان کے شریر آفتاب کی روشنی میں یوں چمک رہے تھے۔ جیسے کوئی گوہر ہائے آبدار ہو۔ وہ دونوں سرعت سے ساحل سمندر کی طرف لپک رہے تھے۔ یہ ساحل سمندر کے قریب ایک سنسنان اور پہاڑی علاقہ میں موجود تھا۔ جبکہ اس کے دوسری طرف آسمان سے باتیں کرتے انواع واقسام کے اشجار سے بھرا جنگل تھا۔

یہاں آمدورفت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اور لوگ ایسے بلند وبالا پہاڑوں کو سر کر کے اس طرف آنے کو قطعاً ترجیح نہ دیتے تھے۔

وہ دونوں ایک معمولی سانپ سے کئی گناہ بڑے اور طاقتور سانپ تھے۔ ان دونوں کی زبان بار بار منہ سے باہر نکل رہی تھی۔ پھر ساحل سمندر سے تھوڑی دور ہی دونوں نے انسانی روپ دھار لیے۔

ان میں ایک نے حسین وجمیل دوشیزہ کا روپ دھار لیا تھا۔ اور دوسرے نے نہایت ہی حسین وجمیل نوجوان کا روپ دھارا تھا۔

دونوں پر حسن ٹوٹ کر برسا تھا۔ کپڑوں سے دونوں کے شریر عاری تھے۔ اس حالت میں اگر انہیں کوئی دیکھ لیتا تو گنگ رہ جاتا۔

وہ حسینہ عام لڑکیوں سے کئی گنا زیادہ خوبصورت اور پرتاثیر شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں ان دیکھی سحر انگیزی تھی۔

یہی نہیں اس کا برہنہ وجود جنس مخالف پر قیامت برپا کر دینے کے مترادف تھا۔ خاص کر شریر کے نشیب وفراز کسی کو بھی زک میں پہنچانے کا سبب بن سکتے تھے۔

آفتاب سوا نیزے پر آگ برسا رہا تھا۔ لیکن ان دونوں کو تو جیسے کوئی چنتا ہی نہ تھی۔ دونوں کی کبھی نہ جھپکنے والی متلاشی نگاہیں دور پہاڑوں پر مرتکز تھیں۔ دونوں آتش پا کیفیت میں مبتلا پیہم پہاڑوں پر ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ دوسری طرف پیٹ میں دوڑتے چوہوں کی رفتار میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔

اچانک اس نوجوان (ناگ) کی نگاہیں ایک جگہ تھم گئیں۔ اس نے پاس کھڑے برہنہ قیامت برپا کرتی دوشیزہ (ناگن) کو ہاتھ کے اشارے سے اس طرف دیکھنے کو کہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے آناً فاناً اس طرف دوڑ لگا دی جس طرف نوجوان نے اشارہ کیا تھا۔ دونوں اتنی سرعت سے دوڑ رہے تھے کہ ان کے پیچھے گرد وغبار کے بگولے اٹھ رہے تھے۔

وہ چھلاوے کی مانند دوڑ رہے تھے۔ ابھی یہاں

اور ابھی وہاں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں پہاڑ کے قریب پہنچ گئے۔

جس اسپیڈ سے ساحل سمندر سے دوڑتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اس سے دوگنی رفتار سے انہوں نے سیدھے پہاڑ کی بلندی کی طرف چڑھنا شروع کردیا۔

ان کے چڑھنے کا یہ انداز ایسا تھا کہ عقل انسانی دنگ رہ جائے۔ وہ بلاشبہ کسی فلمی منظر کے مشابہہ تھا لیکن فلمی منظر نہیں تھا بلکہ حقیقی کردار تھا۔ ان کے پاؤں تو پہاڑ کے ساتھ یوں جم رہے تھے۔ جیسے وہ سیدھے بلندو بالا پہاڑ پر نہیں بلکہ کسی میدانی علاقے میں دوڑ لگا رہے ہیں۔

جلد ہی وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں انہیں بہت دور سے جنگلی بکرے پہاڑ کی اونچائی پر گھاس چرتے دکھائی دیے تھے۔

ایسے موٹے تازے شکار انہیں پہلی بار میسر آنے والے تھے کیونکہ اس سے قبل وہ چھوٹے موٹے شکار پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے۔ جنگلی بکرے اچانک نازل ہونے والی اس افتاد کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ یکبارگی ان دونوں کو سامنے دیکھ کر ان کے حواس باختہ ہوگئے اور سب نے ادھر ادھر دوڑ لگادی۔

ان کی تعداد کم و بیش پندرہ بیس کے درمیان ضرور ہوگی۔ ان میں سے کئی پہاڑ کی بلندی سے نیچے گرتے چلے گئے جبکہ دو بکروں کو انہوں نے جکڑ لیا اور باقی وہاں سے چمپت ہوگئے۔ اور انہوں نے انہیں چٹ کرنا شروع کردیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی دیر میں وہاں بکروں کے دو ڈھانچے پڑے تھے۔

اب ان دونوں کے چہرے پر سکون کے تاثرات عیاں تھے۔ جتنا مزہ انہیں ان بکروں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے اور ان کے گوشت سے اپنی بھوک مٹانے میں آیا تھا۔ اس سے قبل انہیں ایسی راحت اور ایسا سکون میسر نہ آیا تھا۔ دونوں نے آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کی بلندی سے نیچے کی طرف چھلانگ لگادی۔

دونوں ہوا کے دوش پر نیچے ہی نیچے گرتے چلے جارہے تھے۔ اور حیرت انگیز طور پر زمین پر پہنچ کر وہ سیدھے کھڑے ہوگئے۔ یہ بے شک ایک فلمی منظر نہ تھا لیکن عقل انسانی بھی اس کو ماننے کو تیار نہ تھی۔ ان کے پاس زیادہ شکتیاں بھی نہ تھیں لیکن جو شکتیاں تھیں ان کے بل بوتے پر وہ بہت کچھ کرسکتے تھے۔

ان کے شریر صحیح سلامت تھے۔

ذرہ برابر نقصان نہ ہوا تھا۔ حالانکہ اتنی بلندی سے نیچے گرنے کے بعد تو تکہ بوٹی ہوجائے لیکن ان دونوں کے لیے جیسے یہ بلندی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ دونوں صحیح سلامت اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔

پاس ہی انہیں بلندی سے گر کر موت سے ہمکنار ہونے والا ایک بکرا دکھائی دیا۔ جو بلندی سے گر کر نیچے پتھروں پر آن پڑا تھا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا۔ اس کی ہڈیوں کا کچومر ہوگیا تھا۔ ہر طرف خون پھیل گیا تھا۔ اور اس کے پیٹ کا سارا مو[illegible] باہر نکلا پڑا تھا۔ دونوں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور زیر لب مسکراتے ہوئے ساحل سمندر کی طرف چل پڑے۔

''اس بار ہم چاندکی شروع راتوں میں ہی ساحل پر آئیں گے۔ جانتے ہو مجھے بہت اچھا لگتا ہے تمہارے ساتھ چاند کی چاندنی میں مست ہوکر رقص کرنا۔'' دو[illegible] نے نوجوان کی طرف الفت بھری نگاہوں سے بغور دیکھ[illegible] ہوئے کہا۔

نوجوان اس کی بات سن کر مسکرادیا۔

''ناگنی تم جانتی بھی ہو کہ یہ سب کچھ اتنا ممکن نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ ہمارے ماتا پتا ناگ دیوتا کے [illegible]پ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور ناگ دیوتا کے مطابق [illegible]ن اور ناگ کے درمیان جنموں کی کدورت اور عداوت [illegible] ہوا چلی آرہی ہے۔ اور اس کدورت اور عداوت کا خا[illegible] آج تک کوئی نہیں کرسکا۔ ہم سے زیادہ انسان طا[illegible] ہے۔

ناگ دیوتا سختی سے منع کرتے ہیں کہ انسانوں [illegible] بستی کی طرف جانا یا اپنی بستی سے نکل کر انسانوں کی [illegible]

زمین پر آنا بھی گناہ گردانا جاتا ہے تم خود سوچو اگر ہم روزانہ یوں ساری ساری رات یہاں بتائیں گے۔ تو اس بات کی خبر جنگل میں آگ کے جیسے پھیل جائے گی اور پھر ناگ دیوتا کا قہر ہم پر نازل ہونے کی امید ہوسکتی ہے۔

ہم جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں سانپوں کی دنیا میں اس خاندان کو سب سے اعلیٰ گردانا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں اضافی شکتیاں ہوتی ہیں جو ایک عام سانپ میں قطعاً نہیں ہوتیں۔

ہمارے سر پر حکمرانی کا تاج ہوتا ہے۔ تاج ہمارے سر کی زینت ہوتا ہے۔ اور سانپوں کی دنیا کے ہم مہاراجہ تصور کیے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام سانپ ہمارے سامنے سربسجود ہوتے ہیں اور ہمارے ہر حکم کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہیں۔

پھر ناگ سے انسانی روپ دھارنے والی شکتی بھی ہم میں سے کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اور جن کو یہ شکتی مل جاتی ہے وہ شکتی مان تصور کیے جاتے ہیں۔

اس لیے ہمیں کوئی ایسا قدم اٹھانا ہی نہیں چاہیے جس کے عوض کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑجائے۔'' وہ نوجوان بولتا جارہا تھا جب کہ ناگنی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بس اس کی باتیں سنتی جارہی تھی۔ جب اس کی بات مکمل ہوگئی تو ناگنی بولی۔

''مجھے حیرت ہورہی ہے شنکر کہ تم ایسی بے سروپا باتیں کررہے ہو۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں نے تم سے ہی کیوں پیار کیا۔ تمہیں ڈرنا ہے تو ڈرو مجھے کسی کا کوئی ڈر نہیں ہے۔

تم بچو ناگ دیوتا کے شراپ سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میں روزانہ رات کو آؤں گی دیکھتی ہوں کہ کون روکتا ہے مجھے۔'' غم و غصے سے پیچ و تاب کھاتی ناگنی بولتی ہوئی ایک دم اس کے آگے آگے چلتی رہی۔

''یہ بات نہیں ہے ناگنی تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' شنکر نے وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن ناگنی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کردیا۔

''اب مجھے وضاحتیں مت دو۔ تم مرد باتیں تو ایسے کرتے ہو جیسے پلک جھپکنے میں پہاڑوں کو نیست و نابود کرکے رکھ دوگے۔ لیکن تمہاری حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ تم اندر سے بالکل ڈرپوک ہوتے ہو۔'' ناگنی نے ناگن کا روپ دھارتے ہوئے کہا۔

اس کی دیکھا دیکھی شنکر بھی ناگ کا روپ دھار چکا تھا۔

''بات وضاحتوں یا ڈرنے کی نہیں ہے ناگنی کچھ اصول و قواعد ہوتے ہیں۔ ان کو بھی بہر صورت ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ ہم کس طرح پس پشت سب کو جل دے سکتے ہیں۔ اگر کسی کو بھنک بھی پڑگئی تو قیامت برپا ہوجائے گی۔'' شنکر نے معنی خیز نظروں سے ناگنی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسی بھی کونسی قیامت برپا ہوجائے گی یہ بات تو تم بھی بخوبی جانتے ہو کہ ہمیں ابدی نیند تو کم از کم نہیں سلایا جائے گا۔'' ناگنی نے حقارت سے نگاہیں پھیرتے ہوئے کہا۔

''بات ابدی نیند سلانے کی نہیں ہے اگر ناگ دیوتا نے ہم سے ہماری یہ شکتی واپس لے لی تو تم کیا کروگی؟'' شنکر نے رکتے ہوئے سوالیہ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کم از کم تمہاری طرح واویلا نہیں مچاؤں گی۔'' ناگنی نے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے جواب دیا۔

یہ مسکراہٹ کیا تھی گویا ہونٹوں نے کرب میں کروٹ بدلی ہو۔

''تم نہیں سمجھ سکتی۔'' دونوں آگے ہی آگے بڑھتے جارہے تھے اور دونوں کے درمیان بحث و مباحثہ بھی متواتر جاری و ساری تھا۔

''میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔'' ناگنی نے بدستور غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

دونوں جلد ہی تھوڑی دور جاکر ایک دم غائب ہوگئے تھے۔

☆......☆......☆

غنی بھائی اور زریاب ملک نے یکے بعد دیگرے بی۔ایم۔ڈبلیو سے باہر قدم رکھے جبکہ دریام شاہ گاڑی میں ہی اسفند ملک کی کنپٹی پر پسٹل رکھے براجمان تھا۔ اسفند ملک کی حالت ''کاٹو تو بدن میں لہو نہیں'' والی ہو چلی تھی۔ غنی بھائی اور زریاب ملک کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ دوسری طرف ان کے حریف ملک سکندر نے بھی اپنی گاڑی سے باہر قدم نکالا۔

اس کی گاڑی بلٹ پروف تھی۔

دونوں حریفوں کے کارندے پلک جھپکتے میں ایک دوسرے کے مدمقابل گنیں تانے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ غنی بھائی اپنے ساتھ صرف تین مسلح افراد کی گاڑیاں لایا تھا جبکہ ملک سکندر کے ساتھ تین بکتر نما گاڑیاں، دو لینڈ کروزر، دو بلیک ہنڈا، ایک پراڈو کے علاوہ بلٹ پروف گاڑی تھی جس میں وہ خود آیا تھا۔

باقی سب گاڑیوں میں ان گنت اس کے مسلح کارندے بھرے ہوئے تھے۔ سب کارندے جدید اور آٹو میٹک اسلحے سے لیس تھے جبکہ غنی بھائی کے ساتھ زریاب ملک اور دریام شاہ کے علاوہ صرف بارہ شوٹرز تھے۔ نہایت ہی کشیدہ لمحات تھے۔

کسی بھی لمحے کسی بھی حریف کی ذرہ سی غفلت یا جلد بازی لاشوں کے انبار لگانے کا موجب بن سکتی تھی اور لاشوں کے انبار کے علاوہ خون کی ندیاں بھی رواں دواں ہو سکتی تھیں۔

ملک سکندر کی غم و غصے سے بھری آنکھیں غنی بھائی اور اس کے دائیں سمت ایستادہ زریاب ملک پر مرکوز تھیں۔ اس کے دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہ تھا کہ اگر حالات و واقعات اس کی دسترس میں ہوتے تو وہ پلک جھپکتے میں مدمقابل حریفوں کی تکہ بوٹی کر کے رکھ دیتا۔

مگر فی الحال یہ سب کچھ ناممکنات میں سے تھا۔ غنی بھائی سے زیادہ اس کی خونخوار نگاہوں کی زد میں زریاب ملک تھا۔ جس کی وجہ سے اسے بارہا کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

وہ اس کے نام سے تو آشنا تھا لیکن اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اب بھی گاڑی سے اترنے کے ساتھ ہی پاس کھڑے ایک کارندہ نے اس کے کان میں کانا پھوسی کرتے ہوئے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

اس نے غنی بھائی کے ایک خاص کارندے کو قابو میں کر لیا تھا تاکہ اس سے غنی بھائی کے بارے میں مکمل انفارمیشن حاصل کر سکے لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی کیونکہ ابھی اس کے کارندے غنی بھائی کے کارندے کو لے کر اس تک نہ پہنچے تھے کہ اسے غنی بھائی کا فون آ گیا اور پھر اس پر یہ بھید طشت از بام ہوا کہ اس کا لخت جگر غنی بھائی کے قابو میں ہے۔

اگر اس کی سلامتی چاہتا ہے تو فوراً سے بھی پیشتر اس کے کارندے کو لے کر پرانے سٹیڈیم میں آ جائے۔ اور اب دونوں حریف ایک دوسرے کے مدمقابل ایستادہ تھے۔

غنی بھائی کا اشارہ پاتے ہی دریام شاہ نے ملک سکندر کے لخت جگر کو گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اسفند ملک کے ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ٹیپ لپیٹ دی گئی تھی۔ ملک سکندر بیٹے کی کیفیت دیکھ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔

پہلے جہاں وہ اپنے دشمنوں کو ملیامیٹ کرنے کے سپنے دیکھ رہا تھا وہیں اب بیٹے کی مرغ بسمل کی سی حالت دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے حریف کو تڑپا تڑپا کر ایسی موت دے گا کہ ان کی روحیں تک کانپ اٹھیں گی۔

دوسری طرف یہاں آنے سے قبل اسفند ملک کے سینے پر زریاب ملک نے ہلاکت خیز ریموٹ بم باندھ دیا تھا۔ جس کا ریموٹ اس کی جینز کی جیب میں تھا۔ سکندر ملک کے اشارے پر غنی بھائی کے خاص آدمی کو جسے ملک سکندر نے کڈنیپ کروا لیا تھا اور جس کو بچانے کی خاطر غنی بھائی نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالا تھا۔ گاڑی سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔

اس کا چہرہ خوف سے لال پیلا ہو چکا تھا۔ وہ ترحم آمیز نگاہوں سے غنی بھائی اور زریاب ملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''سکندر تم ادھر سے میرے آدمی کو بھیجو میں ادھر سے تمہارے بیٹے کو بھیجوں گا۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر تمہاری طرف سے کسی قسم کی کوئی شرارت ہوئی تو یہاں لاشوں کے انبار لگ جائیں گے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں ان مٹھی بھر کارندوں کے ساتھ تم جیسے شاطر انسان کے روبرو کھڑا ہوں بلکہ میرے آدمی درجنوں کی تعداد میں تمہیں اور تمہارے کارندوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

ان کے پاس بھی آٹومیٹک ہتھیار ہیں۔ اگر تم تھوڑی سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو گے تو یاد رکھنا انجام بہت برا ہوگا۔ میرے کارندوں کی گنیں تم پر، تمہارے بیٹے اور تمہارے کارندوں پر تنی ہوئی ہیں۔'' غنی بھائی نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

غنی بھائی کی بات کے جواب میں اس نے صرف سر ہلایا جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ اس بات کے خلاف کوئی پیش قدمی نہیں کرے گا۔ بازو سے پکڑ کر اس نے غنی بھائی کے آدمی کو آگے کی طرف دھکیلا۔ اس کے مسلح کارندوں کی گنیں غنی بھائی اور اس کے کارندوں پر تن گئیں۔

عجیب سماں تھا، شہر خموشاں کا سا سکوت ماحول پر طاری تھا۔

اک جان لیوا خاموشی جو کسی بھی وقت موت کا بھیانک روپ دھار سکتی تھی اور سب کو نگل سکتی تھی۔

دوسری طرف زریاب ملک نے پاس سے گزرتے اسفند ملک کو مخاطب کیا:

''تم نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہے اگر تم بھاگنے یا کسی بھی قسم کی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو میں ریموٹ کا بٹن دبا دوں گا، پھر کیا ہوگا یہ تم خود ہی جانتے ہو؟ تمہارے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل کی تو یہاں سے زندہ سلامت جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔''

زریاب ملک کی بات سن کر اسفند ملک نے ترحم آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ اس سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ لیکن زریاب ملک نے بھی اسے بازو سے پکڑا اور آگے کی طرف دھکیلا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا سنبھلا ابھی وہ بہت دور تھا جب تیزی سے چلتا ہوا غنی بھائی کا آدمی اس کے پاس سے گزرا۔ ملک سکندر کا بیٹا اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ دونوں پارٹیوں کے شوٹرز اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف دوڑے۔

''جلدی آؤ'' سکندر ملک نے اسفند ملک کو گھورتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کی رفتار اور بھی سست ہو گئی جبکہ دوسری طرف غنی بھائی اور اس کے کارندے گاڑیوں میں بیٹھ کر انہیں اسٹارٹ کر چکے تھے۔ اور پھر سکندر ملک کے دیکھتے ہی دیکھتے غنی بھائی کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئیں۔

''تمہیں سمجھ نہیں آ رہی جلدی کرو اسے لے کر آؤ، اس کے بازو کھولو اور منہ سے ٹیپ بھی کھولو۔''

حکم صادر کرتا سکندر ملک خود جلدی سے اپنی بلٹ پروف گاڑی میں براجمان ہو چکا تھا۔ دوسری طرف اس کے کارندوں نے آگے بڑھ کر اسفند ملک کے ہاتھ کھولنے شروع کر دیے۔

''ایک منٹ ابھی ہمارا ایک کام تو باقی ہے۔'' دوسری طرف زریاب ملک نے اچانک زور سے کہا تو گاڑی روک دی گئی۔

سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے جیب سے ریموٹ نکالا اور پھر سب کی طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اس کا بٹن دبا دیا۔ تو ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ان کے پیچھے دھول مٹی کا طوفان دکھائی دینے لگا۔ سب نے محو حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' غنی بھائی نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

www.paksociety.com

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا آج کے بعد سکندر ملک ایسی بچکانہ حرکت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ اگر کبھی اس نے ایسی حرکت کرنا بھی چاہی تو اسے یہ دن ضرور یاد آئے گا۔" اس نے گاڑی کا شیشہ کھول کر ریموٹ باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے میں طنز اور غصہ بھرا ہوا تھا۔

"لیکن تم نے یہ سب ٹھیک نہیں کیا ہمیں ایسا دنگا فساد نہیں کرنا تھا۔ اب حالات کشیدگی اختیار کر سکتے ہیں۔" غنی بھائی کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

پھر غنی بھائی نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ادھر سکندر ملک گاڑی خود اسٹارٹ کر کے اپنے بیٹے کی طرف جانے ہی لگا تھا تاکہ جلدی سے اسے ساتھ گاڑی میں بیٹھائے اور فوراً ان کے پیچھے جا کر ان کا قلع قمع کرے۔ لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

اس نے اپنی آنکھوں سے سارا منظر دیکھا تھا۔ اس کے کارندے جیسے ہی اس کے بیٹے کے ہاتھ کھولنے لگے تھے۔

ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا۔ اس کے لخت جگر کے چیتھڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ اسے اپنی قوت بینائی پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سب کچھ حقیقت ہے۔

وہ اسٹارٹ گاڑی سے نیچے اترا اور اس جگہ آیا جہاں اس کے بیٹے کے ساتھ ساتھ اس کے کئی کارندے ابدی نیند سو چکے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس جگہ اچھا خاصا شگاف پڑ چکا تھا۔

یہی نہیں ہر طرف خون اور گوشت بکھرا پڑا تھا۔ باقی ماندہ کارندوں میں سے کئی بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔

وہ چپ سادھے متواتر اس جگہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جہاں کچھ لمحے قبل اس کے بیٹے کے ہاتھ کھولے جا رہے تھے۔

پھر اس نے اس طرف دیکھا جہاں غنی بھائی اور اس کے کارندوں کی گاڑیاں کچھ لمحے قبل کھڑی تھیں۔ اس کے دل میں نفرت کا ایک لاوا سر اٹھانے لگا۔

"میں اس دن اپنے لخت جگر کی یاد میں اشک بہاؤں گا۔ جس دن غنی تجھے اور تیرے دونوں ساتھیوں زریاب ملک، وریام شاہ کو ابدی نیند سلا دوں گا۔ اس سے قبل میں کسی طور اپنے بیٹے کی یاد میں اشک ریزی نہیں کروں گا بلکہ آج سے میرا ایک ایک پل تیرے اور تیرے ساتھیوں کی موت کا انتظار کرتے گزرے گا۔

میرا وعدہ ہے تم سے میرے بیٹے! تمہارے قاتلوں کو ابدی نیند سلائے بنا تمہاری یاد میں اشک ریزی نہیں کروں گا۔" سکندر ملک نے دھیمے لہجے میں کہا اور پھر واپس اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

زریاب ملک اور وریام شاہ بھتہ وصول کرنے کے لیے مارکیٹ میں کچھ کارندوں کے ساتھ نکل آئے۔ مارکیٹ والے انہیں دیکھتے کے ساتھ ہی منہ ہی منہ میں اول فول بکنے لگ گئے تھے۔

زریاب گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ وریام براجمان تھا۔ جبکہ ان کے ساتھ آنے والے کارندے پیچھے گنیں سنبھالے چوکس تھے۔ کاہکوں نے ادھر ادھر کھسکنا شروع کر دیا تھا۔

گاہک بھی جانتے تھے کہ اگر کوئی ان میں سے ان جلادوں کے ہتھے چڑھ گیا تو اس سے بھی بھتہ وصول کیا جائے گا۔ زریاب نے گاڑی چوک میں کھڑی کی اور خود باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیب سے ماچس کی ڈبیا نکال کر اس میں سے ایک تیلی نکالی اور دانتوں کے نیچے دبالی۔

"غنی بھائی کا غصہ عروج پر ہے۔ وہ کسی سے نہ تو کوئی بات کر رہے ہیں۔ نہ ہی کل سے انہوں نے کچھ کھایا پیا ہے۔ ہمیں غنی بھائی سے بات کرنی چاہیے۔ شاید تم نے جلد بازی کی ہے زریاب۔" وریام نے زریاب کے قریب آ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہماری بھی کیا لائف ہے یار۔ ہر طرف سے مجبور

۔ ہماری کسی بات سے ہمارے باس خوش نہیں ہے۔ خود چاہے خون کی ندیاں بہا ڈالیں۔ میں نے کون سا غنی بھائی کا کوئی اپنا مارا ہے۔ اس حرامزادے ملک سکندر کے بیٹے اسفند ملک کو ہی مارا ہے ناں۔ اور ویسے بھی ہم نے کوئی پہل نہیں کی۔ غلطی ان کی ہی ہے۔ ہم نے تو جسٹ اس کمینے انسان کو سمجھایا ہے کہ اگر دوبارہ وہ ایسی غلطی کرے گا تو اگلی بار اسے بلی کا بکرا بنا ڈالیں گے۔" زریاب نے وریام کی بات سن کر ناک بھنوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے زریاب۔ تم نے غور نہیں کیا کہ غنی بھائی اس سے قبل کبھی اتنے مضطرب نہیں ہوئے تھے۔ اسفند ملک کے واقعہ کے بعد غنی بھائی کے تیور ہی بدل گئے ہیں۔" وریام نے سگریٹ سلگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم چنتا مت کرو وریام۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے اپنی اور غنی بھائی کی بھلائی کے لیے ہی کیا ہے۔" زریاب نے بھتہ وصول کرنے والے اپنے کارندوں کی طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ زریاب یا وریام میں سے مزید کوئی گفتگو کے اس سلسلے کو مزید توسیع دیتا زریاب کی نگاہیں ایک جگہ ٹک گئیں۔

زریں اور صائمہ یونیورسٹی سے چھٹی کے بعد واپس آ رہی تھیں۔ زریاب کی نگاہیں زریں پر ٹک سی گئی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں جب وریام نے نگاہ دوڑائی تو وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"کیا بات ہے زریاب؟" وریام نے زریاب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے یہ حسن کی دیوی؟" زریاب نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال داغا۔

"پتہ نہیں بھائی۔ کہو تو پتہ لگوا لیں گے۔" وریام نے سگریٹ کا دھواں ناک سے خارج کرتے ہوئے کہا۔

زریاب نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا لیکن زیر لب مسکرا دیا۔ پاس سے گزرتے وقت زریں اور صائمہ دونوں نے ان کی طرف دیکھا تھا لیکن غصے سے پیچ و تاب کھاتی گزر گئی تھیں۔ زریاب جان گیا تھا کہ ان کے غصے کی وجہ ان کی بدمعاشی ہے۔ لیکن نجانے کیوں اسے ان لڑکیوں پر تاؤ نہیں چڑھا تھا۔

اسے سے قبل کسی میں اتنی مجال نہ ہو پائی تھی کہ کوئی اس کی طرف انگلی اٹھانے کی کوشش کر سکے۔ یہ پہلی لڑکی تھی کہ جس کا غصہ بھی اس کے دل کو بھا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

چاند کی چودھویں کو ناگوں کا جوڑا ساحل سمندر پہ آ کر محو رقص ہوتا ہے۔ اس وقت چاند جوبن پہ ہوتا ہے اور آب و تاب سے چمک رہا ہوتا ہے۔ چاند کی چودھویں کو ساری دنیا کے ناگ من مستی میں آ جاتے ہیں۔ چاند کی چودھویں رات جیسے کسی جملۂ عروسی میں براجمان حسینہ کی طرح پرتاثیر ہوتی ہے ویسے ہی خطرناک بھی ہوتی ہے۔

کیونکہ پوری دھرتی پہ ناگ گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس رات ناگ جھومتے ہیں ناچتے ہیں۔

سادھو اور سپیرے وغیرہ اسی رات چھپ چھپا کر سانپوں کو اپنا بندی بناتے ہیں۔ اسی رات ناگوں کا وہ جوڑا بھی آئے گا۔ ایسے ناگوں کو ویسے تو زمین پہ آنے کی اجازت نہیں ہوتی جن کو روپ بدلنے کی شکتی مل جاتی ہے لیکن وہ ناگوں کا جوڑا ایک ضدی جوڑا ہے۔

ان کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ چاند کی چاندنی رات میں اگر ان ناگوں کو پکڑ لیا جائے اور ان میں سے منکے نکال لیے جائیں۔ تو وارے نیارے ہو جائیں۔

وہ منکے عام نہیں ہوتے بلکہ خاص ہوتے ہیں۔ لیکن ناگوں کے اس جوڑے کو پکڑنا بھی جوئے شیر لانے کے مطابق ہے۔ شیر کے کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے موافق ہے۔ لیکن اگر ان میں سے ایک بھی ناگ بچ گیا تو وہ تہلکہ برپا کر دے گا۔ سب کچھ نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔

تھوڑی سی غلطی کا انجام برا ہو سکتا ہے۔ اس لیے

www.paksociety.com

سوچ سمجھ کے کرنا جو کچھ بھی کرنا۔"

جوگی بابا نے اپنے شاگرد شمعان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جوگی بابا ان ناگوں کو پکڑنا ایسے بھی کیا مصیبت ہے جو آپ ایسے تنبیہ کر رہے ہیں میری بین میں جادو ہے۔ اور وہ دونوں خود بخود کھنچے چلے آئیں گے دیکھ لینا آپ۔" شمعان نے فخر سے گردن کو اکڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بچے ایسی بات نہیں ہے وہ عام سانپ نہیں ہیں بلکہ مہان شکتی مان ہیں۔ ان کی شکتی منہ چڑھ کر اثر کرتی ہے۔ تھوڑی سی غلطی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔" جوگی بابا نے پرانے صندوق سے ایک چھوٹی چھوٹی مورتیوں سے پروئی مالا اس کے گلے میں پہناتے ہوئے کہا۔

"یہ مالا تمہاری رکھشا کرے گی، کسی طور بھی اسے گلے سے مت اتارنا۔ یہ مالا شکتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگر تم اپنے مقصد میں سپھل ہو جاؤ تو یاد رکھنا ان منکوں کو پہلے حاصل کرنا اس کے بعد ان ناگوں کے شریر پانی میں ابال کر کھا جانا اور وہ پانی بھی پی جانا تم سوچ نہیں سکتے کہ ایسا کرنے سے تم کتنے شکتی شالی منش بن جاؤ گے، شاید تمہاری واپسی تک میں سورگباش ہو جاؤں لیکن اگر زندہ رہا تو تمہیں گلے لگاؤں گا۔"

"کیا ایسا ممکن ہے کہ ان کے شریر کے اندر شکتیاں پنہاں ہیں؟" شمعان نے حیرت سے جوگی بابا کو تکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں بتایا تو ہے کہ وہ شکل تبدیل کرنے کی شکتی حاصل کر چکے ہیں۔ پھر خود سوچو کہ ان کے شریروں میں کیسی کیسی شکتیاں چھپی ہوں گی۔" جوگی بابا نے ایک چھوٹا سا خنجر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"اب تم پوری طرح سے تیار ہو۔ ضرورت کی ہر چیز تمہارے پاس موجود ہے۔ آج جانتے ہو ناں کہ چاند کی چودھویں کی رات ہے۔ تمہارے لیے خوش قسمتی کی بات ہے کہ تم آج رات ہی اپنے کام کو عملی جامہ پہناؤ۔ اب اپنی آنکھیں بند کر لو میں تمہیں تمہاری مطلوبہ جگہ پہ پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد اگلا کام تمہارا ہے۔

تمہیں وہاں پہنچانے کے بعد تمہارا میرا کوئی رابطہ نہیں رہے گا۔ اپنے نفع نقصان کے ذمہ دار تم خود ہی ہو گے۔ اگر کامیاب ہو گئے تو اسی منکے کے ذریعے تم خود بخود یہاں پہنچ سکتے ہو علاوہ ازیں ایک بار پھر تم خوب سوچ لو۔"

"مجھے کسی چیز کی کوئی چنتا نہیں ہے بس آپ مجھے وہاں پہنچا دیں اگلا کام میرا ہے۔" شمعان نے اپنی بین کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اپنی آنکھیں بند کر لو۔" جوگی بابا نے کہا۔

شمعان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے شمعان ہواؤں میں اڑتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

مہوش کے پاس بیک اپ کروانے کے لیے ایک نوجوان لڑکی آنے لگی تھی۔ اس کی شادی ہونے میں دو دن باقی تھے۔ وہ ایک ہفتے سے برابر اس کے پاس آ رہی تھی۔

لڑکی نے اسے اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا کہ اس کی شادی اس کے ماموں زاد کزن سے ہونے والی تھی۔ لیکن حقیقت میں وہ اسے بالکل نہ چاہتی تھی۔ بلکہ اس کے بس میں نہیں تھا کہ اسے جان سے ہی مار ڈالے۔

لڑکی کے مطابق اس کا کزن اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ لیکن وہ لڑکی اپنی کسی دوست کے بھائی سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ماں باپ اس کی شادی زبردستی اس کے ماموں زاد سے کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے ماموں زاد کو فیس ٹو فیس کہہ دیا تھا کہ اسے اس سے بے پناہ نفرت ہے۔

یہی نہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ وہ شادی سے انکار کر دے۔ لیکن لڑکا یہ سمجھتا تھا کہ شاید شادی کے بعد حالات درست ہو جائیں۔ اس کے اپنے والدین بھی یہی خیال تصور

کرتے تھے لیکن دوسری طرف لڑکی نے اور ہی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا ایک بھیانک منصوبہ بنا چکی تھی۔

اس نے مہوش کو اس بارے میں بتایا تو وہ کافی متفکر ہوئی اور اس نے اس لڑکی کو یہ قدم اٹھانے سے منع کیا۔ لیکن مجال ہے کہ اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔ لڑکی تو مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ اسے شاید اپنے والدین کی عزت کی کوئی چنتا نہ تھی۔

لڑکی جب میک اپ کروا کے چلی گئی تو مہوش اپنی والدہ گلشن کے پاس آئی جو اس وقت برآمدے میں چارپائی پر سلائی مشین رکھے کسی کا سوٹ سلائی کرنے میں مصروف تھیں۔

گلشن کو اس محلے میں آئے بیس پچیس برس گزر چکے تھے۔ سلائی کا کام تب سے وہ کرنے لگی تھیں اور اب تک کر رہی تھیں۔ تب اس کی بیٹیاں بہت چھوٹی تھیں اور اب اس کی تینوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں۔ مہوش ماں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

وہ ماں کے پاس خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کی یہ خاموشی اس کی ماں کو اضطراب میں مبتلا کر گئی۔ ماں نے موٹے اور کالے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے بغور اپنی بیٹی کو گھورا۔

"کیا بات ہے بیٹا تم اتنی مضطرب کیوں دکھائی دے رہی ہو؟" ماں نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

ماں کے الفاظ جیسے ہی مہوش کی سماعت سے ٹکرائے تو وہ چونکی اور چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ "کچھ نہیں امی۔"

ماں سمجھ گئی تھی کہ مہوش ان سے کچھ چھپا رہی ہے۔ "کچھ تو ہے۔"

"امی آپ سے ایک بات کہنی ہے۔" مہوش نے بالآخر جھجکتے ہوئے بمشکل تمام کہا۔

"ہاں ہاں کہو۔" ماں نے ہمہ تن گوش ہو کر کہا۔

"ماں ابھی جو لڑکی نادیہ آئی تھی۔ میک اپ کروانے دیکھی ہے ناں آپ نے؟" مہوش نے ماں سے پوچھا۔

"ہاں ہاں یہ جو روز تمہارے پاس آتی ہے۔ صغریٰ کی بیٹی۔ کل پرسوں اس کی شادی بھی ہے اسی کی بات کر رہی ہو ناں؟" گلشن نے مہوش کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔" مہوش نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا ہے؟" گلشن نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

"امی یہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ نفرت ہو گئی ہے ایک پل میں مجھے اس لڑکی سے۔ اس لڑکی کو اپنے والدین کی عزت پیاری نہیں ہے۔ بس اپنے چاؤ چونچلوں کی پڑی ہے۔ کتنی محبت اور کتنے پیار سے ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ اپنی خوشیوں تک کو اولاد کی خوشیوں پر وار دیتے ہیں اور اولاد کیا صلہ دیتی ہے۔" مہوش نے نفرت سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہوا کیا ہے؟" گلشن نے اب کی بار چنداں دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"امی دیکھو تو وہ غریب اپنی اس بیٹی پر کتنا خرچہ کر رہی ہیں۔ اور یہ ابھی مجھے بتا رہی تھی کہ اس کا کوئی ماموں زاد ہے جو اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اسی سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ کسی کے ساتھ منہ مارے اڑاتی پھر رہی ہے کمینی کہیں کی۔ امی جب اس کی والدہ کو پتہ چلے گا تو ان پہ کیا بیتے گی؟" مہوش بولتی جا رہی تھی اور گلشن کو یوں لگے جا رہا تھا جیسے ایک بار پھر ان کا ماضی کھرچا جا رہا ہو۔

ان کا ماضی بھی تو ایسا ہی تھا۔ ماں باپ کے لاڈ پیار کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے وہ قدم اٹھایا تھا کہ اب بھی اس کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ایک بہت بڑا راز جوان کے سینے میں مدفن تھا۔ جسے آج تک انہوں نے اپنی بیٹیوں کے سامنے عیاں نہ کیا تھا۔ نہ ہی اس بستی میں اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود انہوں نے کسی کو بتایا تھا۔

وہ تو ماضی کو یکسر فراموش کیے بیٹھی تھیں لیکن آج اتنے عرصے بعد اس کی اپنی بیٹی نے ان کے مندمل ہوئے گھاؤ دوبارہ کھرچ ڈالے تھے۔

www.YourDuBook.NET

"دفعہ کرواسے۔ ایسی لڑکیاں اپنی زندگی میں ہی اجر حاصل کر لیتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کی زندگیاں لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بن جاتی ہیں۔ میں صغریٰ کو کہہ دوں گی دوبارہ یہ لڑکی ہمارے گھر نہیں آئے گی۔" گلشن نے مہوش کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اچھا بیٹا تمہاری بہنیں آنے والی ہیں۔ ان کے لیے کچھ کھانا وغیرہ تیار کر لینا تھا۔"

مہوش ماں کی بات سن کر کچن میں چلی گئی جبکہ گلشن بری طرح سے ماضی کے جھروکوں میں پھنس کر رہ گئیں۔ نجانے کتنے عرصے بعد آج انہیں ایک بار پھر اپنوں کی یاد آئی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک اتار کر انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ دوبارہ کام نہ کر سکیں۔

☆......☆......☆

"اے کاش! آج آپ زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ آپ کے بیٹے نے آپ کے خواب کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ جس بیٹے کو آپ دل و جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اس نے بھی آپ کے دیرینہ خواب کو عملی جامہ پہنایا ہے آپ کا بیٹا انسپکٹر بن گیا ہے۔" سدرہ بی بی نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

سدرہ بی بی ایک گھریلو خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی خاتون بھی تھیں۔ ان کا خاوند ایک دھوکے باز کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور پھر اس نے سب کو ختم کر دیا۔ بس وہ دونوں ماں بیٹا وہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔

اس ظالم انسان نے ان کے خاوند ظہیر احمد، بیٹا، بیٹی ثریا اور نتاشہ کو بے دردی سے ابدی نیند سلا دیا تھا۔ وہ تو ان دونوں کے مقدر اچھے تھے کہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

سدرہ بی بی اس دن سے یہی سمجھتی چلی آ رہی تھیں کہ ان کا خاوند بھی اس ظالم کے ہاتھوں ابدی نیند سو چکا ہے۔ ان کی اولاد کو تو اس کی آنکھوں کے سامنے اس ظالم نے اپنے پالتو کتوں کے آگے پھینکوا دیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کتوں نے ان کے چیتھڑے اڑا ڈالے تھے۔ ان کے خاوند کو اس کے کارندوں نے آن دبوچا جبکہ ظہیر احمد نے ان دونوں کو بڑی مشکل سے وہاں سے بھگا دیا تھا۔

سدرہ بی بی اپنے لخت جگر کو لے کر واپس اپنے بھائی مقصود احمد کے ہاں آ گئیں۔ اور ساری بات سے اسے آگاہ کیا تھا کہ اس ظالم نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ مقصود احمد چاہتا بھی تو اس کے خلاف کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ جہاں پر وہ رہتا تھا وہ سارا علاقہ ہی مشکوک گردانا جاتا تھا۔

اس نے پہلے دن ہی انہیں منع کر دیا تھا کہ اس شخص کو گھر میں بالکل پناہ نہ دیں لیکن ظہیر احمد ایک احساس مند اور مخلص انسان تھے۔

اس نے ان کی بات کی طرف کان دھرنا بھی گوارہ نہ کیا اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان سب کو وہ دن دیکھنا پڑا تھا۔

سدرہ بی بی نے خاوند سمیت سب کے غم کو دل و دماغ سے نکال دیا تھا۔ اس کا بیٹا جمال اس وقت چھوٹا اور ناسمجھ تھا۔ ابھی اس کے دودھ پر ہی اس کی پرورش ہو رہی تھی۔ تب اس کے بھائی اور احساس مند بھابھی سمیعہ نے ان کی ڈھارس بندھائی اور انہیں سمجھایا کہ جو ہو گیا اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر پس پشت ڈال کر اپنے اس بیٹے کی خاطر جینا سیکھو۔

شروع میں تو یہ سب ان کے لیے تھوڑا مشکل تھا۔ لیکن وقت ایک بہت بڑا مرہم بھی ہے

ایسا ہی سدرہ بی بی کے ساتھ بھی ہوا۔ انہوں نے سب کچھ بالائے طاق رکھا اور اپنے بیٹے جمال کے لیے جینا شروع کر دیا۔ ان کے بھائی اور بھابھی کی انہیں مکمل معاونت حاصل تھی۔

سدرہ بی بی ہمیشہ یہی سمجھتی چلی آئی تھیں کہ ان کا خاوند موت سے ہمکنار ہو چکا تھا لیکن دوسری طرف ظہیر احمد نے اس ظالم اور اس کے کارندوں کو ابدی نیند سلا کر شرافت کا لبادہ اتار کر وہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ جس نے اس شخص کی ہیت ہی بدل دی تھی۔ کوئی بھی پہچان نہیں سکتا

تھا کہ یہ وہی ظہیر احمد ہے۔ جس نے سب سے پہلے اپنا نام تبدیل کیا تھا۔

ظہیر احمد کی بجائے اس نے اپنا نام غنی بھائی رکھ لیا تھا۔

غنی بھائی...... جو دیکھتے ہی دیکھتے انڈر ورلڈ میں اپنے قدم جماتا گیا اور پھر دنیا میں اس کا نام چلنے لگا۔ اسے چھلاوے کا لقب بھی دیا جاتا تھا۔ انڈر ورلڈ کے اندر غنی بھائی نے اپنی ایسی ساکھ بیٹھائی کہ بڑے بڑے لوگ اس کے تلوے چاٹنے لگے تھے۔ سوائے ایک انسان کے اور وہ تھا سکندر ملک......

☆......☆......☆

"امی آپ ہر وقت رونے دھونے پہ نہ زور دیا کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بابا زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے لیکن کیا ہوا بابا زندہ نہیں تو کیا ہوا آج میں نے ان کے نام کو ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے۔ لوگ جان جائیں گے کہ ظہیر احمد کے بیٹا جمال نے انسپکٹر بن کر اپنے بابا کا خواب پورا کر دیا ہے۔ اپنے بابا کا نام بھی روشن کر دیا ہے۔" انسپکٹر جمال نے ماں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

سدرہ بی بی نے اپنے بیٹے کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا بس سر ہلا دیا لیکن اندر ہی اندر وہ کرچیاں کرچیاں ہو چکی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ انسپکٹر جمال بھی اپنے بابا کو بہت مس کرتا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس شخص پر تاؤ آ رہا تھا جس نے ان کی جنت کو تباہ کر دیا تھا۔ خوشیوں بھرے گھرانے کو غموں کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

ان کا دل چاہ رہا تھا کہ آج وہ شخص ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا تو وہ اس کی تکہ بوٹی ایک کر دیتیں۔ اس سے قبل کہ دونوں ماں بیٹے کے مابین گفت و شنید کا سلسلہ طول پکڑتا انسپکٹر جمال کا موبائل فون بول اٹھا۔ اور وہ ماں سے معذرت کر کے اپنے کمرے کی طرف چل دیا جبکہ سدرہ بی بی کچن میں بیٹے کے لیے کھانا بنانے کے لیے چلی گئیں۔

☆......☆......☆

جوگی بابا ایک ماہر جوگی ہونے کے ساتھ ساتھ کالے علم کے بھی ماہر گردانا جاتا تھا۔ یہی نہیں علم نجوم پر بھی اس کو خاصی دسترس تھی۔ وہ اپنے زیادہ تر کام کالے علم کے ذریعے ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے شمعان اس کی شاگردی میں آیا تھا۔

اس نے علم نجوم کا استعمال بہت کم کر دیا تھا۔ اس نے اس سے قبل کبھی شاگرد نہیں رکھا تھا۔ شمعان پہلا خوش قسمت تھا کہ اس نے اسے اپنے شاگردی میں قبول کر لیا تھا۔

شمعان خود کو قسمت کا دھنی سمجھتا تھا لیکن درحقیقت اس بات سے ناآشنا تھا کہ جوگی بابا اسے کس قدر استعمال کر رہا تھا۔ بے شک وہ تن تنہا ان دونوں ناگوں کے شکار پر گیا تھا لیکن جوگی بابا نے نگاہوں سے دور نہ تھا۔ جوگی بابا از خود اس لیے نہ آیا تھا کہ ایک بار اسے ناگا می کا سامنا ہو چکا تھا۔

اسے شروع سے ہی ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جو دل گردے والا ہو۔ ناگوں کا مقابلہ کرنے کی اس کے اندر سکت ہو۔ وہ ناگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر الٹے قدموں واپس پلٹنے والا یا شکست کھا کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے والا نہ ہو۔

شمعان کو پہلی دفعہ دیکھتے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ شمعان کوئی عام انسان نہیں ہے۔ وہ جلد ہی نہ صرف علوم پر دسترس حاصل کر لے گا بلکہ اس کے لیے کامیابی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوگا۔

واقعی شمعان نے جلد ہی کالے علم پر فوقیت حاصل کرنا شروع کر دی۔

جوگی بابا نہایت ہی عیار قسم کا انسان تھا۔ ایک دن اس نے موقع دیکھ کر شمعان کے سامنے دونوں سانپوں کی بات چھیڑ دی اور اسے بتایا کہ اگر کوئی ان سانپوں کو اپنی گرفت میں لے لے اور ان کا منکا اپنی دسترس میں لے لے تو دنیا بھر کے سانپ اس وقت تک اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہیں گے۔ جب تک وہ منکا ان دونوں ناگوں کو واپس نہیں مل جاتا۔

ان کو اپنی گرفت میں جکڑنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

شیر کے کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے موافق ہے۔ حتیٰ کہ اس نے شمعان کو کچھ اپنے پاس سے بھی باتیں بنا کر سنائیں جنہیں سن کر شمعان خیالوں کی دنیا میں اڑنے لگا تھا۔

جوگی بابا اس بات سے بھی بخوبی آشنا تھا کہ شمعان کو خوابوں سے بہت الفت ہے درحقیقت وہ خوابوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔

جوگی بابا کی عمر اس کے چہرے سے قطعاً عیاں نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کی شکل وصورت دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ چالیس پچاس سال کے درمیان ہی ہوگا لیکن اس بات سے صرف وہی آشنا تھا کہ اس کی عمر ایک صدی کا طویل سفر طے کر کے دوسری صدی کو بھی چالیس پچاس سال پیچھے چھوڑ چکی تھی۔

اگر کوئی اس حقیقت کو جان لیتا تو یہ بات سن کر انگشت بدنداں رہ جاتا۔ جوگی بابا کے جسم کے تمام بالوں پر برف کی تہہ جم چکی تھی۔ جسم پر کوئی بھی کالا بال نہ دکھائی پڑتا تھا بلکہ سارے بال سفید ہو چکے تھے اور یہ اس کی ایک بہت بڑی چال تھی۔

وہ جہاں بھی جاتا تھا اس علاقے میں چالیس پچاس سال سے زیادہ نہ گزارتا تھا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک ہی جگہ اتنا لمبا عرصہ گزارنے کے بعد وہ کسی کی بھی نگاہوں کا مرکز بن سکتا ہے۔

دنیا شکتی مان لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور وہ کسی سے ٹکر لینے کا متمنی نہیں تھا۔ اس کا بھوجن کیا تھا کوئی نہ جانتا تھا لیکن اگر کوئی جان لیتا تو اس کے حواس باختہ ہو جاتے۔ انسانوں کا گوشت اور خون اس کا بھوجن تھا۔

جب سے اس نے علوم پر دسترس حاصل کی تھی اسے کبھی بھی شکار کی خاطر بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ شکار خود اس کے پاس چل کر آتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا جلد ہی لوگوں میں اس کے نام کا ڈنکا بجنا شروع ہو جاتا تھا۔

وہ ہر جگہ اپنے آپ کو نہایت ہی پارسا اور متقی ثابت کرتا تھا۔ وہ ہندو تھا اور ہندو اپنے پنڈت کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت ایک پنڈت کے روپ میں ہی رہتا تھا۔

اس نے اپنے رہنے کے لیے کبھی بھی کوئی الگ سے جگہ نہ لی تھی بلکہ اس نے ہمیشہ مندروں کو ہی اپنا مسکن بنایا۔ وہیں پر وہ اپنی پوجا پاٹ کرتا چلا آرہا تھا اور وہیں پر وہ بیٹھ کر لوگوں کی حاجتیں بھی پوری کرتا تھا۔

ہندو تو اسے بھگوان ماننا شروع کر دیتے تھے۔

آج کل وہ نئی دہلی کے سب سے بڑے مندر کا پنڈت تھا۔ اس مندر میں اسے تیس چالیس سال سے اوپر ہونے کو تھے۔

اس کے پاس لوگ اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے آتے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہ لیتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر غریب لوگوں کی مدد بھی کرتا تھا۔ سونے پہ سہاگا لوگ جب چڑھاوے چڑھانے آتے تو وہ سارا مال و اسباب غریبوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔

غریب لوگ اسے اپنا مسیحا گردانتے تھے اور یہی پارسائی اس کا ہتھیار تھا۔

وہ آنے والی جوان لڑکیوں کو ہپناٹزم کے ذریعے اپنا بندی بنا لیتا تھا۔ پھر عین اس وقت جب مندر کو بند کرنے کا سمے قریب آتا تھا وہ اپنے علم کے ذریعے ان لڑکیوں کو مندر میں بلا لیا کرتا تھا۔

وہیں پر پہلے ان کی عزت کی دھجیاں اڑاتا تھا پھر ان کے گوشت سے اپنی بھوک اور خون سے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔ لوگ اسے مسیحا گردانتے تھے لیکن درحقیقت وہ ایک نہایت ہی خبیث اور ناپاک انسان تھا۔ دنیا کے لیے ناسور تھا مگر دیکھنے میں پارسا تھا۔ اس کا بھانڈا آج تک نہ پھوٹ پایا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ صدیوں کی طویل مسافت اس نے طے کر لی تھی۔ وہ امر ہونے کا متمنی تھا لیکن اس کے لیے آب حیات کا ہونا لازمی امر تھا۔ آب حیات کالی شکتیوں کے بل بوتے پر وہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اسے صرف ایک انسان حاصل

کر سکتا تھا اور شمعان سے پہلے اس کی نظر میں ایسا کوئی انسان بھی نہ تھا جو اس کی یہ اچھا بھی پوری کر دیتا۔

نوجوان لڑکیوں کے تازہ خون اور گوشت سے وہ اتنی لمبی عمر حاصل کیے ہوئے تھا وگرنہ وہ کب کا سورگباش ہو چکا ہوتا اور پھر کالی شکتیوں پر اس کی دسترس اسے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ موت اٹل ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اس بات سے وہ خبیث ناآشنا تھا کیونکہ وہ ایک ہندو تھا۔

وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کو اپنے کنٹرول میں کیا ہوا ہے اور جب تک وہ خود نہ چاہے اسے موت نہیں آسکتی۔ لیکن یہ خام خیالی شیطان کے ہر پجاری کے دل و دماغ پر اثر و رسوخ جما لیتی ہے۔

اس نے اپنی زندگی کو ایک دیو ہیکل الو میں مقید کر رکھا تھا۔ وہ الو عام الو سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ایک عام انسان اگر اس الو کو دیکھ لے تو اس کے حواس باختہ ہو جائیں۔ جوگی بابا نے اس الو کو بھی جہاں جاتا تھا اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ لیکن سب سے چھپا کر تا کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔

وہ سمجھتا تھا کہ اگر کبھی اس کی کسی سے ٹکر ہو بھی گئی تو موت اسے چھو بھی نہیں پائے گی کیونکہ اس نے اپنی زندگی ایک الو میں ڈال رکھی تھی۔

خود تو وہ بس ایک بت تھا جو چلتا پھرتا تھا تو صرف شیطانی شکتیوں کی بنا پر۔ ہندو دھرم میں ایسے کتنے ہی فرسودہ خیالات جنم لیتے ہیں۔ آواگون (بار بار جنم لینا) جیسی احمقانہ بات ان کے دھرم کا ایک حصہ مانی جاتی ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ ایک انسان اس دنیا کے اندر سات بار جنم لیتا ہے اور اپنے کرموں کے عوض اسے ہر جنم میں ایک نیا روپ ملتا ہے۔

انسان کو دنیا میں کیے گئے اپنے اچھے برے اعمالوں کا اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہ ہونا ہوگا۔ انسان جس روپ میں سورگباش ہوگا بروز قیامت اسی روپ میں اٹھایا جائے گا۔

ہندو سمجھتے ہیں کہ وہ منش کو جلا دیتے ہیں تو وہ دوبارہ اس روپ میں جنم نہیں لے سکتا تو ان کو پتہ ہونا چاہیے کہ خالق کائنات جس چیز کو ایک بار بنا سکتا ہے۔ وہ دوبارہ بھی اسے اسی روپ میں بنا سکتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تو بس فرماتا ہے کہ: "کن فیکون"

☆......☆......☆

شنکر اور ناگنی اس وقت ناگ دیوتا کے دربار میں سب کی طرح جمع تھے۔ ناگوں کی دنیا کا یہ شروع سے دستور چلا آرہا ہے کہ وہ سب بہرصورت علی الصباح اور رات گئے ناگ دیوتا کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس طرح اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ کونسا ناگ یا ناگن حاضر ہے اور کون غیر حاضر۔

پھر جو ناگ یا ناگن لاپتہ ہوتی ہے اس کے بارے میں صلاح مشورہ کر کے اس کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ زندہ یا مردہ مل جائے تو اسے ناگ دیوتا کے دربار میں لایا جاتا ہے۔ زیادہ تر زندہ ناگوں کو ہی لایا جاتا ہے کیونکہ مرنے کے بعد زیادہ تر ناگوں کے شریر جلد ہی پھول کر پھٹ جاتے ہیں۔

اس لیے ان کے پھٹنے سے ایک خاص قسم کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ناگوں میں ایک وباء پھیل جاتی ہے اور یکے بعد دیگرے وہ مرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک نئی پریشانی سر اٹھاتی ہے۔ ناگوں کے مرنے سے انہیں بار بار سمندر کی تہہ سے نکال کر سمندر کے پانی میں لانے میں نہ صرف سے لگتا ہے بلکہ اس مردہ ناگ کو اٹھانے والے کی اپنی جان بھی خطرے میں پھنس جاتی ہے۔

ناگ دیوتا ناگوں کا سب سے بڑا مہاراجہ ہوتا ہے۔ جو ناگوں کی دنیا کے نظم ونسق کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہر ناگ بلاناغہ آکر اسے تمام دن کی کارروائی بتاتے ہیں۔ پھر ناگ دیوتا کی انہیں تقریر سننا پڑتی ہے۔ ناگ دیوتا امر نہیں ہوتا لیکن اس کی عمر دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

شیش ناگ، جن کے سروں پر تاج بنا ہوتا ہے۔ اس دنیا کے مہاراجہ بننے کا اعزاز صرف انہی کو نصیب

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہوتا ہے۔ جب مہاراجہ قدرتی یا آفاتی موت کا شکار ہوتا ہے۔ تو اس کے شریر کو کاٹ کر اس کی پوری نسل کو کھلایا جاتا ہے۔ عام ناگوں کی نسبت مہاراجہ اور اس کی نسل کے ناگوں کے شریر کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ان کے شریر میں ایک خاص قسم کی شکتی ہوتی ہے۔

شیش ناگ کو خزانوں کا محافظ گردانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے شریر کو ایک عام منش ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی کھالے تو اس کی نظر کے سامنے سے ہر پردہ چاک ہوجاتا ہے۔ زمین کی تہوں میں پنہاں خزانے اس پر عیاں ہوجاتے ہیں۔

بزرگوں کے مطابق پہلے دور کے بادشاہ اپنے خزانوں کو زمین میں کہیں نہ کہیں چھپادیتے تھے۔ زیادہ تر اپنے خزانوں کو زمین کے اندر کسی دیگ میں یا ایسے ہی کسی برتن میں چھپاکے زمین میں چھپادیا کرتے تھے۔ ان کے مرنے کے ساتھ ساتھ یہ راز بھی چھپ جاتے تھے کہ ان کے خزانے کہاں ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ کچھ خزانے نکال لیے جاتے جب کہ کچھ زمین میں ہی دبے رہ جاتے۔ پھر ان خزانوں کی رکھوالی کے لیے ناگ دیوتا اپنے کسی نہ کسی ناگ کو اس خزانے کی حفاظت پر مامور کردیتا۔

اس وقت بھی سب ناگ دیوتا مہاراجہ کے دربار میں حاضر تھے۔ ناگ دیوتا اپنے تخت پر شاہانہ انداز سے براجمان تھا۔ وہ اپنے سر کو ادھر ادھر پھیر کے سب ناگوں کو تکے جارہا تھا۔

ناگوں کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت و جامد ہوتی ہیں۔ یوں جیسے ان میں زندگی کی رمق ہی نہ ہو۔

ناگ دیوتا نے سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد شنکر کو بلایا۔ شنکر نے ایک نگاہ اپنے والدین پر ڈالی پھر ناگنی کو دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بتارہا تھا کہ ناگ دیوتا کے بلائے جانے سے وہ کافی تذبذب کا شکار ہوگیا ہے۔

''شنکر۔'' ناگ دیوتا نے دوبارہ پکارا۔

شنکر کو یوں لگا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ ناگنی اس کی کیفیت دیکھ کر سمجھ چکی تھی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے جو شنکر یوں پریشان ہوئے جارہا ہے۔ لیکن بات کیا ہے اس سے تو وہ بھی آشنا نہ تھی۔

شنکر دو بے قدموں ناگ دیوتا کے اور بڑھنے لگا۔ پورے دربار میں موت کی سی خاموشی چھا گئی تھی۔ دربار کے اندر انسانی روپ دھارنے کی شکتی حاصل کرنے والوں نے انسانی روپ دھارا ہوا تھا جبکہ باقی ایسے ہی ناگوں کی شکل میں تھے۔ دربار ناگوں سے بھرا ہوا تھا۔ پاؤں تک دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

''ناگ دیوتا آپ کا اقبال بلند ہو۔'' شنکر نے ناگ دیوتا کے چرنوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

ناگ دیوتا نے اسے بغور دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''ہمارا آشیرباد تمہارے ساتھ ہے شنکر۔ کچھ باتیں تم لوگوں کو بتانی بھی ضروری ہیں۔''

ناگ دیوتا نے اسے کندھے سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ شنکر نے پہلی بار ناگ دیوتا کی آنکھوں میں جھانکا اور فوراً ہی نگاہیں جھکالیں۔ وہ ناگ دیوتا سے نگاہیں ملانے کی تاب نہ لاسکا تھا۔

''مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔ ناگ دیوتا یعنی مجھ سے غداری کا انجام بھیانک ہوگا۔ انسان اور ناگ کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ تمہیں وہ شکتی مل چکی ہے۔ جس کی وجہ سے اب ہر سادھو، عامل اور تھوڑی بہت جانکاری رکھنے والا بھی تمہارا دشمن بن جائے گا۔ تمہاری موت ان کے لیے بہت بڑا اپشی خیمہ ثابت ہوگی۔ اور میں تو کیا دنیا کی کوئی طاقت بھی تمہیں انسانوں کے قہر سے نہ بچا پائے گی۔ ایک عورت کی خاطر ایسی احمقانہ حرکتیں کرنے سے گریز کرو۔ جاؤ اب۔'' ناگ دیوتا نے اس کے کان میں سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

ہر لفظ شنکر کے لیے خوف پیدا کرنے کا موجب بن رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہورہا تھا کہ ناگ دیوتا تک اس کی بات پہنچ چکی ہوگی۔ اس نے بارہا ناگنی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تھی کہ ماننے کا نام تک نہ لے رہی

تھی۔

حالات اتنی پیچیدگی اختیار کرجائیں گے اس نے تو تخیل میں بھی نہ سوچا تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا بھانڈہ پھوٹ چکا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوچکی تھی۔ ناگنی کی نگاہیں اسی پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کے بدلتے نقوش اس سے پوشیدہ نہ تھے۔ وہ جان چکی تھی کہ کوئی گھٹنا پیش آچکی ہے۔ لیکن اس نے بھی دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اگر کسی نے اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو وہ بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے۔

☆......☆......☆

''غنی بھائی آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' بالآخر زریاب نے پوچھ ہی لیا۔

اس وقت غنی بھائی، زریاب اور وریام تینوں ٹی وی لاؤنج میں براجمان ٹی وی پر ایک پروگرام دیکھ رہے تھے۔ لیکن زریاب کی نگاہیں پیہم غنی بھائی پر مرتکز تھیں اور وہ دیکھ رہا تھا کہ جس وقت سے وہ واپس آئے تھے۔

اس وقت سے غنی بھائی مضطرب تھے۔ زریاب جانتا تھا کہ غنی بھائی اور سکندر ملک کے درمیان بے شک نہیں بنتی لیکن غنی بھائی اس کی پشت پیچھے بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔

اسے مہان گردانتے تھے۔ کیونکہ سکندر کے غنی بھائی پر کچھ احسانات تھے۔

غنی بھائی اب کی بار بھی معاملہ پیار و محبت سے سلجھانے کی تگ و دو میں تھے لیکن زریاب نے پس پشت وہ کر دکھایا جو نہیں کرنا تھا۔ غنی بھائی وریام کو بھی برابر کا قصوروار ٹھہرا رہا تھا۔

''ہوں۔'' غنی بھائی نے چونکتے ہوئے اس کی بات سن کر اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں بس تھکاوٹ ہورہی ہے اور کچھ سر میں درد بھی ہے۔''

''میں دبائے دیتا ہوں غنی بھائی۔'' اب کی بار وریام نے لقمہ دیا۔

''نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' غنی بھائی نے دوٹوک جواب دیا۔

''ابھی ملازم چائے لاتا ہوگا۔ کہا تو تھا پتہ نہیں کہاں مرجاتے ہیں یہ لوگ کام کرنا تو انہیں عذاب دکھائی دیتا ہے۔''

دونوں جانتے تھے کہ اندر ہی اندر غنی بھائی کے طوفان برپا تھا اور اسے ٹھنڈا کرنا لازم تھا۔ وگرنہ جب لاوا زمین کا سینہ چاک کرکے باہر نکلتا ہے۔ تو دور دور تباہی مچا دیتا ہے۔ اور وہ جانتے تھے کہ غنی بھائی کا غصہ جب برداشت سے باہر ہوجائے تو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

کتنی ہی بار غصے سے بے قابو ہوکر غنی بھائی نے ان دونوں کی بھی حجامت کردی تھی۔

وہ دونوں غنی بھائی کو اپنا سب کچھ مانتے تھے غنی بھائی کے آگے کبھی انہوں نے اوں آں نہیں کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ غنی بھائی کے دل میں ان کے لیے اپنوں کے جیسے جذبات تھے۔

ملازم آکر چائے رکھ چلا گیا۔ زریاب نے اسے چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر اس کے جاتے ہی زریاب اپنی جگہ سے اٹھا اور لوازمات کی طشتری غنی بھائی اور وریام کے سامنے رکھی اور چائے کے کپ بھی ترتیب سے سجادیئے۔

وہ کن انکھیوں سے غنی بھائی کو بھی دیکھ رہا تھا۔

غنی بھائی کے چہرے پر بے شک کوئی ایسے تاثرات نہ تھے جو ان کی اندرونی کیفیت کو عیاں کررہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ ایک طوفان ہے۔ جو ایک ہی جگہ سمٹا ہوا ہے اور جب پھیلے گا تو ہر چیز کو تہس نہس کرتا چلا جائے گا۔

''میں جانتا ہوں آپ مجھ سے ناراض ہیں لیکن سکندر ملک نے حرکت ہی ایسی کی تھی اور اگر وہاں یہ ردعمل نہ اختیار کیا جاتا تو سکندر ملک اور اس کے چیلے ہم سب کو نیست و نابود کرکے رکھ دیتے۔'' زریاب نے گردن جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

جواباً غنی بھائی نے پہلی بار ایک طائرانہ نگاہ دونوں پر ڈالی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"تم لوگوں نے کبھی اپنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت سے ہمکنار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔" غنی بھائی نے دونوں کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں نے دیکھا ہے اپنوں کو اپنی آنکھوں سے موت سے ہمکنار ہوتے ہوئے۔ بے رحمی سے انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ قصوروار کو سزا دی جائے تو ایک الگ بات ہے لیکن بے قصور کو کوئی سزا ملے تو آسمان بھی آنسو بہاتا ہے۔

میری فیملی کا تو کوئی قصور بھی نہ تھا نہ ہی میرا۔ البتہ ہمارا یہ قصور تھا کہ ہمارے اندر احساس تھا دوسروں کے دکھ درد سمجھنے کا۔

دوسروں کو اپنا سمجھنے کا۔ اور پھر ایک دن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ یہ دور کسی سے بھلائی کا نہیں ہے بلکہ سب کو چھری کے نیچے دے کے ذبح کرتے چلے جاؤ۔"

بات کرتے کرتے غنی بھائی کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئی تھیں۔ زریاب اور وریام نے پہلی بار غنی بھائی کی آنکھوں میں اشک دیکھے تھے۔ وہ غنی بھائی کو ایک بے رحم اور سفاک انسان سمجھتے تھے۔

جس کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ کیونکہ جب وہ خود خون کی ندیاں بہاتا تھا تو کچھ لحاظ نہ کرتا تھا۔

لیکن پتہ نہیں کیوں ایک سکندر ملک تھا کہ جس کے خلاف آج تک غنی بھائی نے کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی۔

نہ ہی اس کی کسی بات کو کبھی دل پہ لیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی انہیں کہا تھا کہ اس کے خلاف کوئی پیش قدمی کریں۔ بلکہ اگر کبھی سکندر ملک کوئی اونچ نیچ کر بھی لیتا تو وہ انہیں منع کر دیا کرتا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ردعمل نہ اختیار کیا جائے۔

"سکندر ملک میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے اس وقت زندگی دی۔ جب میں موت کے دہانے پر ایستادہ نگاہیں فلک پر جمائے ہوئے تھا اور امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دے رہی تھی۔"

غنی بھائی نے دوبارہ بولنا شروع کیا اور پھر بولتا چلا گیا اور اس راز سے جس کے بارے میں شاید کسی کو نہ پتہ تھا دونوں کو آگاہ کیا۔

"میرا باپ ایک غریب کسان تھا۔ غریب سے مراد یہ نہیں کہ وہ دوسروں کا محتاج تھا بلکہ جہاں رہتا تھا وہاں سب سے کم رقبہ اور پیسہ اس کے پاس تھا۔ لیکن میرے باپ نے ہمت نہ ہاری اور ایک دن وہ آ گیا۔ جب میرا باپ امیر کسان بن گیا۔

غربت کے مدار میں کولہو کے بیل کے جیسے چکر لگانے کی بجائے میرے باپ نے حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ ہم جس گاؤں میں رہتے تھے وہ روشن پور کے نام سے مشہور تھا۔

میں اپنے باپ کا اکلوتا وارث تھا۔ میری ماں میری پیدائش کے چار سال بعد ہی دنیا تیاگ گئی تھی۔ میرے باپ نے میری شادی اپنی بہن یعنی میری پھوپھو کی بیٹی سے کر دی تھی۔ میری شادی کم عمری میں ہی ہو گئی تھی۔

میری بیوی سدرہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ میرے ساتھ ساتھ میرے باپ کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ میرے باپ نے مجھے سدا ایک ہی بات سمجھائی تھی کہ کبھی بھی اپنے روپے پیسے پر غرور نہیں کرنا۔

غریبوں کو بھی اپنے جیسا ہی تصور کرنا اور جہاں تک ہو سکے ان کی مدد کرنا۔

پیسہ کسی کی ملکیت نہیں نہ ہی اسے کبھی ملکیت سمجھنا کیونکہ یہ ایک بے وفا چیز ہے جو ہاتھ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی اس کے پاس تو کبھی اس کے پاس۔

سدرہ سے مجھے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً چار بچوں سے نوازا تھا۔ جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ میرے تیسرے بچے کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد میرا باپ بھی وفات پا گیا تھا۔ اور یوں ایک اور دھچکا مجھے لگا۔ پڑھائی سے تو مجھے کوئی شغف ہی نہیں تھا۔

جہاں اسکول ہوتا میں اس سے کئی گز دور سے گزرتا۔

شروع میں باپ نے سکول میں چھوڑا تھا لیکن دیواریں پھلانگ کر ان سے پہلے گھر میں آ بیٹھا ہوتا تھا۔

بالآخر وہ بھی تنگ آ گئے تھے اور خوش قسمتی سے میری اولاد بھی مجھ سے کچھ کم نہ ثابت ہوئی۔ البتہ میرا ایک بیٹا جمال بہت ذہین ثابت ہوا۔ اس نے اسکول نہ چھوڑا۔

میرا اصل نام غنی بھائی نہیں بلکہ ظہیر احمد تھا۔ لیکن وقت نے ظہیر احمد سے غنی بھائی بنا ڈالا۔ باپ کی سکھائی ہوئی تعلیمات کو دل میں بٹھایا ہوا تھا۔ اور ہمہ وقت انہی کو ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

ایک دن میں رات کے وقت کھیتوں میں پانی لگا کر واپس آ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ میری زمینوں میں لگے ایک برگد کے درخت کے نیچے کوئی لیٹا ہوا تھا۔

اس کے خراٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں اس کے پاس گیا اور دیکھا کہ اس نے ایک کپڑا بچھایا ہوا تھا اور اس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی صندوقچی پڑی تھی جیسی پالش کرنے والے پٹھانوں کے پاس ہوتی ہے۔ میں نے بغور دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ کم وبیش بیس بائیس برس کا جوان تھا۔

اس وقت میری عمر اور اس کی عمر میں ایک آدھ سال کا ہی فرق ہوگا۔ باپ کی وفات کے بعد ساری ذمہ داریاں میں نے ہی سنبھال لی تھیں۔"

مجھے اس نوجوان پر بہت افسوس ہوا اور میں نے اسے جگا دیا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ میں نے اسے تھپتھپایا۔

"کون ہو میرے بھائی اور کہاں سے آئے ہو؟" میں نے اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں پٹھان ہوں اور یہاں کام کے سلسلے میں آیا ہوں، ہمارا یہاں اپنا کوئی نہیں ہے اسی لیے یہاں آ کے سو گیا۔" اس نے فر فر اردو بولتے ہوئے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

"تم اردو اتنی روانی سے کیسے بول لیتے ہو؟" میں نے پر تجسس لہجے میں پوچھا۔

"اردو ہمارے لیے بولنا مشکل نہیں ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد یہاں آتے رہتے ہیں پھر جب وہاں آپس میں کبھی کبھار وہ اردو بولتے ہیں تو ہم بھی سیکھ جاتے ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی بھی بول لیتا ہوں۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے سوال داغا۔

"میرا نام ہیبت خان ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تم ایسا کرو اپنا سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ آ جاؤ وہیں میرے گھر رات گزار لینا۔" میں نے کہا تو اس نے بنا کوئی جواب دیے اپنا سامان اٹھایا اور میرے پیچھے ہو لیا۔

میں نے باپ کی نصیحت کے مطابق ایک اچھا کام کیا تھا۔ لیکن وہ اچھا کام میرے گلے کا طوق بن گیا۔ میں نے اس پر احسان کر کے زندگی کی بہت بڑی بھول کی تھی اور اسی ایک بھول نے مجھے ظہیر احمد سے غنی بھائی بنا ڈالا۔

ہم گھر پہنچے تو سدرہ ابھی میرے ہی انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے میں نے اپنے ساتھ آنے والے مہمان کے بارے میں بتایا۔ اس وقت ہم دونوں کمرے میں براجمان تھے جب سدرہ کھانا لے آئی۔

"تم نے کھا لیا ہے؟" میں نے سدرہ کی طرف دیکھ کر پوچھا

"نہیں پہلے آپ لوگ کھا لیں پھر میں بھی کھا لوں گی۔" سدرہ نے دھیمے لہجے میں کہا

"نہیں تم ایسا کرو یہیں پہ بیٹھ جاؤ یہ بھی اپنا بھائی ہی ہے۔ یہ آج سے ہمارے ساتھ ہی رہے گا جب تک اس کا کوئی اچھا سبب نہیں بنتا۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر سدرہ نے ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ اور دبے قدموں وہاں سے نکل کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں سارے بچے سو رہے تھے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس کا یہ انداز مجھے قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔ میں ہیبت خان سے معذرت کر کے وہاں سے اٹھ کر اس کمرے کی طرف چل پڑا جہاں سدرہ گئی تھی۔ سدرہ کمرے میں بچوں کے درمیان جا کر لیٹ گئی تھی۔

مجھے کمرے میں آتے اس نے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے اس طرح اچانک ایک نوجوان کو گھر لانے پر ناراض ہے شاید۔

''کیا بات ہے سدرہ مہمانوں سے ایسا رویہ روا نہیں رکھتے؟'' میں نے بیڈ کے پاس کھڑے ہو کر دھیمے لہجے میں کہا لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''وہ مجبور ہے۔ فی الحال بے یار و مددگار ہے۔ جیسے ہی اس کے روزگار کا کوئی اچھا ذریعہ بنتا ہے میں اسے یہاں سے چلتا کروں گا لیکن تب تک ہمیں اسے برداشت کرنا چاہیے۔ وہ ایک غریب انسان ہے اور مجھے پتہ ہے کہ ایسا انسان کبھی بھی نمک حرام نہیں ہو سکتا۔''

''اچھا تو آپ کو صرف ایک یہی غریب دکھائی دیا تھا۔ یہاں غریبوں کی بہتات ہے ایسا کیجیے ان سب کو بھی اٹھا لائیے گھر میں۔'' سدرہ نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے آنکھیں کھولے بنا کہا۔

اس کی بات کا میں نے برا نہ منایا بلکہ بیڈ پر ہی براجمان ہو گیا۔

''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو سدرہ بے جا ضد کیے جا رہی ہو۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا

''ضد میں کر رہی ہوں کہ آپ۔ سمجھنے کی کوشش تو آپ کو کرنی چاہیے ایک انجان انسان کو اٹھا کر گھر لے آئے ہیں آپ۔'' سدرہ نے میری بات سن کر بھنویں اچکاتے ہوئے کہا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ لیکن اس کی نگاہیں دوسری طرف ہی رہیں۔

''ٹھیک ہے میں ابھی اسے چلتا کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات سن کر بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا

''رکیے!'' ابھی میں نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ سدرہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''آپ لوگ کھانا کھا لیجیے پلیز۔''

اس کے لہجے میں سے ترشی اور تلخی ایک دم سے ختم ہو چکی تھی۔ اور یہی میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل سے تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دے۔

''نہیں سدرہ اب اگر میں اکیلا اس کے ساتھ کھانا کھاؤں گا تو اس کے دل میں کئی وہمات سر اٹھائیں گے۔ اس لیے ہمیں اس کے ساتھ میانہ روی اختیار کرنا چاہیے۔ تم بھی اٹھو پلیز۔'' میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

پہلے تو اس نے منہ بنایا لیکن پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہیبت خان اسی طرح بت بنا براجمان تھا۔ اس کی نگاہیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے وہ نگاہیں جھکائے کھڑا ہو گیا۔

''آپ لوگ میری وجہ سے آپس کے تعلقات خراب مت کیجیے پلیز میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔'' اس نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ارے نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہیبت خان تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاحب! آپ لوگوں نے مجھے اتنی عزت دی یہ بھی میرے لیے بہت ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ اب میں یہاں مزید رکوں پلیز آپ لوگ مجھے اجازت مرحمت فرمائیے۔'' ہیبت خان نے متواتر نگاہیں جھکائے ہوئے کہا۔

میں نے سدرہ کی طرف دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ میرے اس طرح دیکھنے کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

''تم فکر مت کرو تمہارے یہاں آنے نہ آنے کی وجہ سے میں ناراض نہیں ہوئی میرے بھائی اس لیے تم جمع خاطر رکھو ہمارے گھر میں مہمان کو عزت دی جاتی ہے۔ مہمان تو خدا کی بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ اس لیے تم بیٹھو اور بے فکر ہو کے کھانا کھاؤ۔'' سدرہ نے اس پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔

سدرہ کی بات سن کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔ اس کے یکبارگی بدلے ہوئے اس رویے پر میں واقعی

حقیقت میں انگشت بدنداں تھا۔ خیر ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر اس دن سے ہیبت خان ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا۔

وہ ایک اچھا انسان تھا لیکن ہم اس بات سے آشنا نہیں تھے کہ اس کا باطن اس کے ظاہر سے خطرناک ہے۔ اس کی حقیقت کتنی بھیانک ہے اس بات سے ہم کاش اس وقت آشنا ہو سکتے۔

ایک سال وہ ہمارے ساتھ رہا اور پھر ایک دن اس نے کہا کہ وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس جا رہا ہے کیونکہ اسے اپنی بہنوں کا فرض ادا کرنا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا اس لیے ہمارا من نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اب واپس جائے وہ ہم لوگوں میں مکمل مل گیا تھا۔ ہم اسے اپنے ہی گھر کا ایک فرد تسلیم کرنے لگے تھے۔

ہم نے اسے کہا کہ وہ ہمیں ضرور بتائے جب اپنی بہنوں کا فرض نبھانے لگے تا کہ ہم بھی ان کی شادی میں شمولیت کریں۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا اور پھر وہ چلا گیا۔

دن پر لگا کے گزرتے چلے گئے اور ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ ان دنوں میں ہم نے اسے ہر وقت بہت یاد کیا لیکن نجانے وہ کیسا انسان تھا جسے ایک پل بھی ہمیں یاد کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی تھی۔

ڈیڑھ ماہ بعد ایک دن اس کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف رہا تھا اور اب بہنوں کی شادی کے دن بھی رکھ چکا تھا۔

اس نے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا۔ جب اس بات کی خبر میں نے گھر میں دی تو میری بیوی سمیت بچوں میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

ہیبت خان کے علاقے میں ٹریفک کی آمد و رفت کا انتظام بہتر تھا۔ ہم صبح کے نکلے پچھلے پہر اس کے علاقے میں جا پہنچے۔ تھکن سے ہم چور چور ہو چکے تھے۔ ہمارے بدن ٹوٹ رہے تھے۔

سخت آرام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ جہاں گاڑی نے ہمیں اتارا تھا وہاں سے چند میٹر کے فاصلے پر ہیبت خان کا علاقہ تھا۔

اس کا علاقہ پہاڑی علاقہ تھا۔ اونچی نیچی جگہوں پر مکانات دکھائی دے رہے تھے۔

ہم چلتے چلتے ایک محلے میں پہنچ گئے۔ ہمیں ہیبت خان نے سمجھایا تھا کہ محلے کے شروع میں ہی ایک پرچون کی دکان ہو گی اس سے معلوم کرنا وہ گھر کا پتہ سمجھا دے گا اور واقعی جیسے ہی محلے میں داخل ہوئے محلے کے شروع میں ہی پرچون کی دکان دکھائی دی۔

آنے جانے والے حیرت سے ہمیں تک رہے تھے۔

اس محلے میں گنتی کے ہی گھر تھے۔

''بھائی صاحب یہاں ہیبت خان کا گھر کونسا ہے؟'' میں نے گھر والوں کو وہیں کھڑا کر کے دکان والے سے جا کے پوچھا۔

میری بات سن کر پہلے تو اس نے مجھے ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو کر دیکھا۔ پھر اپنے دائیں کان میں انگلی گھماتے ہوئے میرے قریب آیا۔

''خیر تو ہے کس کام سے پوچھ رہے ہو؟'' اس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم اس کے مہمان ہیں اور بہت دور سے آئے ہیں۔ وہ ہمارے پاس ایک سال رہ کر کام کرتا رہا ہے۔ بہت اچھا انسان ہے اس کی بہنوں کی شادی ہے اس نے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا ہے۔'' میں نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے اسے بتایا۔

''ہیبت خان کی بہنوں کی شادی؟'' اس نے انگشت بدنداں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے ایسا کرو اس گلی کی نکڑ سے بائیں طرف مڑ جانا وہاں سے تین گھروں کے بعد خالی جگہ ہے اور پھر آخر میں ایک چھوٹا سا گھر ہے۔

وہ گھر پرانے کھنڈر سے مشابہ ہے۔ جس کی کھڑکیاں تک ثابت نہیں ہیں۔ یہی نہیں اس کے چوبی ستون دیمک خوردہ ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مکان کا نصف حصہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہے۔ اور نظر آنے والے حصے پر خشک بیلیں کسی سادھو کی بے ترتیب داڑھی کی مانند پھیلی ہوئی ہیں۔"

ہیبت خان کے مکان کا راستہ سمجھانے کے بعد وہ پیچھے ہو کر اپنے کام میں مگن ہو گیا اور میں گھر والوں کو لیے ہیبت خان کے گھر کی طرف چل دیا۔

سارے راستے میں میرے دل و دماغ پر ایک سوال ہتھوڑے کی طرح برستا رہا کہ اس شخص نے ہیبت خان کی بہنوں کی شادی والی بات پر حیرت سے کانوں میں کھلبلی کیوں کی تھی۔

ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ہزاروں سوال تھے جو میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا۔ جیسے میں ہیبت خان کے گھر کی طرف جیسے جیسے قدم بڑھا رہا ہوں کوئی ان دیکھا بوجھ مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں اس بوجھ کے نیچے دبتا چلا جا رہا تھا۔

میرے قدم منوں بھاری ہوتے جا رہے تھے۔

میری بیوی اور بچے خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے لیکن مجھے ایک ایک قدم منوں وزنی لگنے لگا تھا۔

میرا دل بار بار مجھے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کروں تو کیا کروں۔ انہیں سوچوں میں نجانے کب ہم لوگ اس گھر کے سامنے پہنچ گئے جو ہیبت خان کا تھا۔

گھر کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ہیبت خان کے حالات واقعی دگرگوں تھے۔ یہ تو اچھا ہوا آتے وقت ہم نے اچھی خاصی رقم اٹھالی تھی تاکہ ہیبت خان کا کچھ بوجھ ہلکا کرنے کی ہم بھی کوشش کر سکیں۔

خوشی سے پھولے نہ سمائے بچوں نے ہیبت خان کے گھر کے سامنے پہنچتے ہی گھر کا دروازہ زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔

جلد ہی دروازہ کھول دیا گیا لیکن سامنے کوئی نہ آیا۔ تو میری بیوی اندر چلی گئی۔

دروازہ کھولنے والی ہیبت خان کی بہن تھی۔ جس کو میری اہلیہ نے اپنا تعارف کروایا اور پھر مجھے بھی اندر داخل ہونے کی اجازت ملی۔ اس لڑکی نے مجھ سے حجاب کرنے کی بجائے بے حجاب ہی میرے سامنے سر جھکا لیا اور میں نے دست الفت اس کے سر پر رکھا۔

وہ ہم سب کو لیے ایک کمرے کی طرف چل پڑی۔ میں نے صحن میں ایستادہ ہو کر ایک بھرپور نگاہ چاروں اطراف ڈالی۔ مکان کی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ ان لوگوں کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ مکان کی تعمیر و مرمت کروا سکتے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ہیبت خان ایک سال کے بعد واپس اپنے علاقے میں آیا تھا اور اس ایک سال میں اس نے جس طرح دن رات ایک کر کے محنت کی تھی میں اس کا گواہ تھا۔

پٹھان قوم ویسے بھی کام کاج کرنے کی ماہر سمجھی جاتی ہے اور مشکل سے مشکل کام کو کرنے کی ہمت ان میں پائی جاتی ہے۔ اس مکان میں دو کمرے تھے اور ایک دروازے کے ساتھ ہی خالی اینٹیں رکھ کر باتھ روم بنایا گیا تھا۔ باتھ روم کے ساتھ ہی نلکا لگا ہوا تھا۔

ہم سب کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے سے عجیب سی بساند آ رہی تھی۔ اندر ایک چارپائی پر دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ ایک دوسری چارپائی پر ایک بوڑھی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس ماحول سے میرا جی ہول رہا تھا۔

اس لڑکی نے پشتو میں ان دونوں لڑکیوں اور بوڑھی عورت کو جو ہیبت خان کی ماں تھی ہمارا تعارف کروایا۔

وہ تینوں بھی ہم سے خندہ پیشانی سے پیش آئیں۔

اس تمام وقت میں جو بات میں محسوس کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ گھر کے سبھی افراد نجانے کیوں مجھے سہمے سہمے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

دوسری طرف ڈوبتے سورج کی کرنیں بے بسی سے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔

جو لڑکی ہمیں اندر لائی تھی وہ پلک جھپکتے میں ہمارے لیے دودھ ٹھنڈا کر کے لے آئی۔

سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی اور نیند بھی بہت آئی ہوئی تھی۔ میں شدید جذباتی بھونچال کی زد میں تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

آسودگی کی جگہ اضطراب، بے چینی اور بے سکونی کا راج تھا۔ آنکھوں کے جگنوں ماند پڑ رہے تھے۔

"کیا بات ہے پتر تم اتنے مضطرب کیوں دکھائی دے رہے ہو؟" بالآخر میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے ہیبت خان کی والدہ نے پوچھ ہی لیا

"نن..... نہیں تو کچھ نہیں۔" میں نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ اصل میں میں سوچ رہا تھا کہ ہیبت خان کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ میں بھی آپ سے پوچھنے ہی والا تھا کہ الٹا آپ نے سوال پوچھ لیا۔"

"وہ آتا ہی ہوگا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے اس کے دروازے کے پاس بجلی کا بٹن تھا۔ کمرے کے اندر ایک سبز شیڈ کا لیمپ جو بوڑھی کی چارپائی کے عین اوپر لٹکا ہوا تھا۔ یہ کمرہ عام آرائشی اسباب سے بھرا ہوا اور برہنہ سفید دیواروں پر فقط ایک طرف کعبہ شریف اور مسجد نبوی کی تصویریں آویزاں تھیں۔

میرے بچے وہاں جاتے ساتھ ہی گھل مل گئے تھے۔ میری اہلیہ بھی ہیبت خان کی بہنوں کے ساتھ مل کے باہر نکل گئی تھی۔ ان کی آپس میں گفت و شنید کی بازگشت میری قوت سماعت سے مترشح ٹکرا رہی تھی۔

شاید وہ باہر دیوار کے ساتھ ہی بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں۔ میری اہلیہ بھی ان میں گھل مل گئی تھی اور سب باتیں بھی کر رہی تھیں۔

ساتھ ساتھ ان کے دھیمے دھیمے قہقہے بھی فضا میں گونج رہے تھے۔ لیکن نجانے کیوں میرے دل پہ بوجھ دھرے کا دھرا ہی تھا۔

"ہیبت خان اب کیا کرتا ہے؟" میں نے ہیبت خان کی والدہ سے پوچھا۔

"وہی جو سدا سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ بھلا سفید کاغذ کی ناؤ کہاں چلتی ہے۔ سانپ کا بچہ سنپولا ہی ہوتا ہے۔ باپ کی طرح ایک ظالم انسان ہے۔ اس کے باپ نے اپنے باپ کی جان لی اور اس نے اپنے باپ کو اپنے بھوکے کتوں کے آگے پھینکا۔ تم لوگ یہاں کیوں آ گئے ہو پتر؟" بات کرتے کرتے اس نے پوچھا۔

"ہمیں تو ہیبت خان نے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ اپنی بہنوں کی شادی کر رہا ہے اور ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا ہے۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا

"ہوں۔" ہیبت خان کی والدہ نے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلائی۔

"وہ اور اپنی بہنوں کی شادی کر دے ایسا خبیث انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ میں تو اس دن پر افسوس کرتی ہوں جب اس کو جنا تھا اس کے تو بس میں نہیں ہے وگرنہ پلک جھپکتے میں ہم سب کو بھی اپنے بھوکے کتوں کے آگے پھینک ڈالے۔

"سن پتر" سرگوشیانہ لہجے میں کان کے قریب منہ کر کے بولی۔ اس سے قبل کہ وہ ظالم یہاں آن وارد ہو تم اپنی فیملی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ کوئی شادی وادی نہیں ہے۔"

ہیبت خان کی والدہ کی بات سن کر میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ مجھے اس شخص کا انداز یاد آ گیا جس سے میں نے ہیبت خان کے گھر کا پتہ پوچھا تھا۔ وہ بھی اسی طرح میری بات سن کر چنداں مضطرب ہو گیا تھا۔ پھر نجانے اس نے کیا سوچتے ہوئے مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔

لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ ہیبت خان کے گھر کا پتہ بتاتے وقت وہ چنداں عار محسوس کر رہا تھا۔

اس کے لب و لہجے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سختی سے منع کر رہا ہو کہ اس طرف مت جاؤ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں ماں جی آپ کھل کے بات کرو پلیز۔" میں نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

"پتر کیا کھل کے بات کروں اس سے قبل کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندھیرا چھار سو اپنی گرفت مضبوط کر لے تم اپنی فیملی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ اندھیرا پھیلتے ساتھ ہی ٹریفک کی آمد و رفت بھی بند ہو جاتی ہے۔ یہ جو ہیبت خان ہے ناں یہ اس علاقے کے بہت بڑے ظالم کا بیٹا ہے۔ ہر کس و ناکس اس کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتا دکھائی دیتا ہے۔

تم یہ بتاؤ تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟'' ہیبت خان کی والدہ متواتر سرگوشیانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ میرے لیے کسی آفت ناگہانی سے کم معلوم نہ پڑ رہا تھا۔

''ہاں وہ گلی کے شروع میں جو دکان ہے اسی سے تو پوچھا تھا آپ کا گھر۔'' میں نے چنداں خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔

''او تیرا ستیاناس ہو یہ تو نے کیا کر دیا۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔'' سن رسیدہ بوڑھی غصے سے پیچھے ہوتے ہوئے بولی اور دوبارہ چارپائی پر لیٹ گئی۔

عین اسی لمحے کسی نے زور سے گھر کا دروازہ کھولا۔ میں متفکر ہو رہا تھا کہ جلدی سے دیکھوں کہ کون آیا ہے اور یہ سب لوگ آخر ایسی باتیں کیوں کیے جا رہے ہیں جو میری پریشانی کو متواتر ہوا دے رہی ہیں۔

میں اپنی حسرت ہویدا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا لیکن میری پیشانی پانی کے قطروں سے بار بار چمک رہی تھی اور میں بار بار ان کو صاف کر رہا تھا۔

میرا اضطراب عروج پر تھا اور دل کو کسی طور تشفی نہیں ہو پا رہی تھی۔ تبھی قدموں کی چاپوں کو میں نے اس کمرے کی طرف بڑھتے سنا جہاں میں بیٹھا تھا لیکن قدم باہر ہی رک گئے۔

آنے والا کوئی اور نہیں ہیبت خان ہی تھا جو میری اہلیہ اور بچوں سے مل رہا تھا اور ان کا حال احوال جان رہا تھا۔ پھر وہ کمرے میں آیا اور مجھ سے بغل گیر ہوا۔

ایک بار تو میں اسے پہچاننے سے انکاری ہوا کیونکہ اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھیں ہوئی تھیں جنہیں وہ بار بار تاؤ دے رہا تھا۔

''ارے یار تم لوگوں نے بتایا ہی نہیں کہ تم لوگ آ رہے ہو وہ تو ابھی مجھے اس دکان والے نے بتایا کہ تمہارے گھر کچھ مہمان آئے ہیں۔ بہت دور سے آئے ہیں بتا رہے تھے تبھی مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ تم لوگ ہی ہو گے۔'' ہیبت خان نے بنا آنکھ جھپکائے کہا

اس کے بولنے کے انداز سے کچھ اپنائیت اور کچھ بیگانگی جھانک رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دل سے خوش نہیں تھا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔

''کیسے ہو ہیبت خان۔؟'' میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ میرے سامنے والی چارپائی پر جہاں کچھ دیر قبل اس کی بہنیں بیٹھیں تھیں براجمان ہو گیا۔

''میں ٹھیک ہوں ظہیر بھائی تم سناؤ؟'' اس نے بے رخی سے پوچھا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا رویہ اتنا تلخ کیوں تھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''لگتا ہے تم لوگ آبلہ پا ہو تم لوگ کھانا کھا کے کچھ دیر آرام کرو شام کے دھندلکے پھیلنے لگ گئے ہیں میں بھی اپنا کام نمٹا آؤں پھر مل کر چلیں گے گھوم پھر آئیں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

میں تو سمجھا تھا کہ ہم لوگ جب ہیبت خان کے گھر اس سے ملنے جائیں گے، تو وہ ہمیں دیکھ کر خوشی سے مخمور ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو ایسی بات نہیں تھی۔ مجھے تو الٹا خود سے ہی خجالت محسوس ہونے لگی تھی۔ اندر ہی اندر بھونچال برپا تھا۔

آخر ہیبت خان نے ہم سے ایسا رویہ کیوں روا رکھا میرے کسی سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ تبھی نہ چاہتے ہوئے بھی میری نگاہیں قریب المرگ ہیبت خان کی والدہ پر جا ٹکی۔

ہیبت خان کے آنے کے بعد وہ منہ دوسری طرف

کر کے لیٹ گئی تھی شاید یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سو رہی ہے لیکن اس کے جاتے ہی اس نے منہ میری طرف کر لیا تھا۔ اس کی نگاہیں متواتر مجھ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔

میں مضمحل تھا اس بات سے وہ بخوبی آشنا تھی۔ لیکن میں کیوں پریشان تھا اس کا مجھے بھی نہیں پتہ تھا۔ شاید اس لیے کہ ہیبت خان کا رویہ بہت روکھا روکھا تھا۔

ہم اتنی چاہ سے اس کے پاس اس سے ملنے اور اس کی بہنوں کی شادی میں شمولیت کے لیے آئے تھے اور وہ تھا کہ ہمیں گھاس تک ڈالنے کو تیار نہ تھا۔ یا پھر اس وجہ سے کہ اس دکان والے اور ہیبت خان کی ماں کی باتیں مجھے پریشان کیے جا رہی تھیں۔

''بھاگ جاؤ پتر تم لوگ یہاں سے کس درندے کی باتوں میں پھنس کر یہاں چلے آئے ہو۔ یہ انسان نہیں حیوان ہے۔ بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔ اس کے اندر دل نہیں ہے۔ پتھر کا ٹکڑا ہے جو اس کے سینے میں ہے۔ اگر اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی زندگی پیاری ہے تو نکل بھاگو یہاں سے۔''

ہیبت خان کی ماں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی ہر بات مجھے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کیے جا رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنے ہی بیٹے کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کیے جا رہی ہے۔

''وہ جیسا بھی ہے ہمارے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہیں کرے گا۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''اس کا ظلم شروع بھی اسی انسان سے ہوتا ہے، جو اس کے ساتھ احسان کرتا تھا۔ کیا تم اس کے باپ سے زیادہ اس کے قریبی ہو نہیں ناں جو انسان اپنے باپ کو ابدی نیند سلا سکتا ہے۔ اپنے بھوکے کتوں کے آگے ڈال سکتا ہے وہ کسی کو بھی ابدی نیند سلا سکتا ہے۔'' ہیبت خان کی ماں نے جواب دیا۔

ہیبت خان کی بیمار والدہ کی باتوں سے دل گرفتہ ہوئے جا رہا تھا۔ کیا کوئی اتنا بھی ظالم ہو سکتا ہے۔ میرے خدا! ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ جب یہاں آ رہے تھے تو خوشی سے دل بلیوں اچھل رہا تھا اور اب حیرت و پریشانی سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی پسلیوں کو چیرتا ہوا باہر نکل آئے گا۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ ہیبت خان کی بہنیں کھانا لے آئیں۔ سدرہ بھی انہی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اشتہا انگیز بساند کھانے سے اٹھ رہی تھی۔ لیکن بھوک دم توڑ چکی تھی۔ ایک خلش سی پورے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔

ہیبت خان کا اصلی روپ اتنا بھیانک ہو سکتا ہے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کھانا کھانے پر وقت ضائع کیے بنا مجھے اپنی فیملی کو لے کر یہاں سے بہر صورت نکلنا تھا۔

''کیا بات ہے آپ اتنے مضمحل کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟'' سدرہ نے میری پریشانی کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

''بچے کہاں ہیں؟'' میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا۔

سدرہ کی گود میں صرف میرا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ باقی تینوں بچے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پریشانی کے مارے میری پیشانی شکن زدہ سی ہو گئی تھی۔

''آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' سدرہ نے دوبارہ سوال پوچھا۔

''جو میں پوچھ رہا ہوں تم اس کا جواب دو بچے کہاں ہیں جلدی بتاؤ؟'' میں تقریباً غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا تو سدرہ سہم سی گئی۔

ہیبت خان کی ماں بھی چارپائی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ حیرت سے مجھے تکے جا رہی تھی یہی نہیں ہیبت خان کی تینوں بہنیں بھی حیران و ششدر مجھے تکے جا رہی تھیں۔

''وہ تو اپنے انکل کے ساتھ باہر کہیں گئے ہیں۔'' بالآخر سدرہ نے تمام تر ہمت کو یکجا کر کے جواب دیا

''تمہارا ستیاناس ہو اس ظالم انسان کے ساتھ میرے بچوں کو کہاں بھیج دیا تم نے۔'' میں نے پژمردہ

لہجے میں کہا اور ہونقوں کی طرح اسے تکنے لگا۔

''دیر مت کرو کھانا بعد میں کھانا پہلے میرے ساتھ چلو تم لوگ۔'' اچانک میری قوت سماعت سے ہیبت خان کی ماں کی آواز ٹکرائی۔

''آخر ہوا کیا ہے۔؟'' سدرہ نے حیرت زدہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے ہم دونوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم ٹھیک کہتی تھی سدرہ ہیبت خان اچھا انسان نہیں ہے وہ درندہ ہے درندہ۔'' میں نے خجالت سے نگاہیں جھکا کر کہا۔

''میرے بچے۔'' اس نے جلدی سے چارپائی سے کھڑے ہوتے ہوئے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا ہمارے بچوں کو۔ تیغ ستم آج ٹوٹ جائے گی ہیبت خان کے ظلم کی تاریکی آج ختم ہوجائے گی۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا اور ہیبت خان کی ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

بوڑھی نے پشتو میں اپنی بیٹیوں کو کچھ کہا اور وہ دو سرے کمرے میں گھس گئیں۔ جب وہ واپس لوٹیں تو ان کے ہاتھوں میں دو چھوٹے چھوٹے خنجر اور ایک پسٹل تھا۔ پسٹل انہوں نے میری طرف بڑھا دیا۔ لیکن خنجر انہی کے ہاتھوں میں تھے۔

''آج ہم سب جائیں گے تمہارے ساتھ پتر۔ بہت کرلیا ظلم اس نے۔ میں اپنے ناتواں ہاتھوں سے اس کی جان لوں گی۔'' ہیبت خان کی ماں نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور سب سے آگے آگے چلنے لگی۔

ہمیں وہاں گئے اتنا وقت نہیں بیتا تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ میں انگشت بدنداں تھا کہ اندھیرا سرعت سے ہر چیز پر قابض ہوتا جارہا تھا۔ ہم لوگ پیہم ہیبت خان کی ماں کے پیچھے پیچھے چلتے جارہے تھے۔

میرا دل بری طرح سے اچھل رہا تھا۔ یہی نہیں سدرہ کی حالت بہت خراب ہورہی تھی۔

جمال کو سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہورہا تھا۔ ہیبت خان کی ایک بہن نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے جمال کو تھام لیا تھا اور باقی دونوں بہنیں اس کی ڈھارس بندھاتی ہوئی جارہی تھیں۔ میرا خون کھول رہا تھا میں جلد سے جلد اپنے بچوں کو اس ظالم کے چنگل سے بچانا چاہتا تھا۔

چلتے چلتے آنافانا ہیبت خان کی ماں رک گئی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ سامنے دیکھ رہے ہو۔'' اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے شہادت والی انگلی سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

''وہی اس ظالم کے ظلم کا ٹھکانہ ہے۔ جب بھی علاقے میں کوئی غلطی کرتا ہے، تو اسے یہاں لاکر بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے۔ لائٹیں جل رہی ہیں، اس کا مطلب ہے، وہ یہاں ہی آیا ہے۔

لیکن احتیاط کا دامن کسی طور ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ ہمیں مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنا ہے اگر ہم قبل ازوقت ہمت ہار گئے تو وہ لوگ ہمیں بھی بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔''

ہیبت خان کی ماں کی بات نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ یہاں تھا اس کا مطلب اس نے میرے بچوں کو.....

نہیں نہیں ایسا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میں نے کھوئی کھوئی سدرہ کا ہاتھ خود تھام لیا تھا۔ میرا دوسرا ہاتھ پسٹل پر مضبوطی سے جم چکا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے آج اس ظالم کو ابدی نیند سلائے بغیر میں بھی واپس جانے والا نہیں ہوں۔ جلد ہی ہم لوگ اس جگہ پہنچ گئے۔

وہ جگہ کم وبیش دو کنال اراضی پر مشتمل تھی۔ چاروں اطراف چاردیواری بنائی گئی تھی۔ چاردیواری اتنی اونچی نہیں تھی۔

میں نے ایک دیوار کے پاس کھڑے ہوکر اندر جھانکا تو اندر کا منظر دیکھ کر میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ (جاری ہے)

(فروری کے شمارے میں ایم اے راحت کی نئی قسط وار کہانی ''دشمن روحیں'' ضرور پڑھیں)

خمیازہ

مہر پرویز دولو۔میاں چنوں

اندھیری رات میں نوجوان سر پٹ بھاگا جارہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے ایک دیو ہیکل وجود سامنے آگیا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور پھر اس کا وجود اونچا ہونا شروع ہوا تو.....

جو اپنی نفسانی خواہشات پر قابو نہیں رکھتے نشان عبرت بن جاتے ہیں۔ سبق آموز کہانی

بزرگ نے کہا۔ ''بیٹا! اگر تم اتنے ہی مجبور تھے تو میرے بیٹوں کے پاس چلے جاتے۔ وہ تمہاری ہر ممکن مدد کرتے، مگر تم نے روپے اکٹھے کرنے کا غلط طریقہ اپنایا ہے۔

ان کے پاس تو اس دکھ کی گھڑی میں وہی رقم تھی جو تم نے چھین لی۔ پھر تم نے اسی پر بس نہ کیا انہیں مارا پیٹا بھی، موٹر سائیکل پنکچر کردیا، چابی دور کھیت میں پھینک دی اور انہیں زخمی کر کے بے یارومددگار ویران جگہ پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

میری روح کو ثواب پہنچانے کے لئے انہوں نے فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا تھا۔ مگر تم نے پورے پروگرام کو درہم برہم کردیا، میری روح بار بار گھر کا طواف کرنے لگی۔

تم میرے گھر والوں کی پریشانی کا موجب

WWW.URDUPOINT.NET

بنے، میں تمہارے حق میں دعا کر سکتا ہوں، تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا مگر تم کو اس زیادتی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تمہاری اس زیادتی کا بدلہ تم سے کوئی تم جیسا بدطینت ہی لے گا۔

نیک لوگ تو معطر پھولوں کی مانند ہوتے ہیں۔

مگر تم کانٹے کی مانند ہو، تمہارے وصف یہ ہے کہ تم لوگوں کو زخمی کر دیتے ہو تم سے جسم، کپڑے، مال و متاع کچھ بھی محفوظ نہیں، تمہاری تو سوچ ہی آدمی کو زخمی کر دیتی ہے، کانٹے بوتے ہو کانٹوں کی فصل ہی کاٹو گے، تمہارے ہاتھ بھی زخمی ہوں گے، روح کو کچوکے لگیں گے، تم جینا چاہو گے، جی نہ سکو گے، موت تم سے نفرت کرے گی۔"

☆......☆......☆

جابر خان گاؤں کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا کوئی اس کے شر سے محفوظ نہ تھا۔ وہ اپنی ہر برائی پر فخر کرتا غرور سے سیاہ کارناموں کی تشہیر کرتا۔ چوری، شراب، جوا، کوئی ایسی برائی نہ تھی جو اس کی ذات میں نہ پائی جاتی ہو۔ جب بھی کسی پر زیادتی کے خنجر چلاتا اس کا سر فخر سے تن جاتا کتنے ہی لوگوں کی مجبوریوں سے کھیل چکا تھا۔ بہت سے گھرانوں کی عزت کے چراغ بجھا چکا تھا ہر کوئی اس کے آگے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔

لڑکیوں کو اپنی دوستی کے جال میں پھانسنا، جھوٹی محبت کے چنگل میں پھنسانا، پھر بھنورے کی طرح عزت کا رس نچوڑ کر ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے گرا دینا، اس کا مشغلہ تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے نجمہ ابھی بچپن کی پگڈنڈیوں پر محو سفر تھی کہ اس کی ماں کسی کے ساتھ فرار ہوگئی، ماں کی عدم موجودگی میں اس کی تربیت نہ ہو سکی۔ آوارگی، بے راہ روی اور سرکشی اس کے نمایاں وصف تھے عزت و آبرو کے تقدس سے نابلد تھی صرف عیاشی کو مقصد حیات سمجھتی تھی اپنی عزت کو کھیل بنا رکھا تھا، کتنے ہی من چلوں کے دلوں کی دھڑکن تھی اس کے حضور کتنے ہی دل جلے اپنا دل ہار چکے تھے۔

بن ٹھن کر ایسے رہتی جیسے کسی نگری کی شہزادی ہو، چال میں نخرہ ایسا کہ جو بھی دیکھتا سانس لینا بھول جاتا، دلوں کی دھڑکن کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

ایک دور پار کے رشتے دار کی شادی پر ایسے بن ٹھن کر گئی تھی کہ ہر کوئی اس کی نگاہ محبت کی بھیک مانگنے لگا۔ آسمان پر سے اتری حور معلوم ہوتی تھی۔ سینے کی قید میں دلوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا اور پھر اس دوران اتنے لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کا اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔

بہت سے لفنگوں کو بے وقوف بنا چکی تھی، ناز نخرے اداؤں سے کتنی ہی نظریں گھائل ہو چکی تھیں۔

جابر خان دولہا کا لنگوٹیا یار تھا وہ بھی شادی میں خوب آن بان کے ساتھ آیا ہوا تھا اس نے جب نازنخروں والی نجمہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی سانس تو سینے میں اٹکنے لگی۔

نجمہ کو دیکھتے ہی اپنا دل اس کے حسن اور نخروں کے آگے ہار گیا۔

نجمہ ایک گھاگھ لڑکی تھی اس نے تو سیدھے منہ بات نہ کی۔

نجمہ نے اپنے آپ کو بہت بڑے زمیندار کی بیٹی کی حیثیت سے پیش کیا اور جابر خان کو جھڑکتے ہوئے طنز کے نشتروں سے یوں زخمی کیا کہ وہ زخموں کو چاٹنے لگا۔

"بھوکا ننگا، آوارہ، نکما۔" کہہ کر اس کی غیرت کو للکارا۔ اس کی چاہت کے پھولوں کو نفرت کے پاؤں تلے روندا۔

"اگر مجھ سے دوستی کرنی ہے، میری چاہتوں، محبتوں سے لطف اندوز ہونا ہے، میرے دل کی نگری میں حکومت کرنی ہے تو اپنی حیثیت بتاؤ۔

اپنی جاں و حشم اور دولت مجھے دکھاؤ۔

"تمہاری سماجی اور مالی حیثیت دیکھ کر ہی میں تم سے دوستی کے بارے میں فیصلہ کروں گی۔" اتنا سننا تھا کہ جابر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کی محبت کے لئے ہر قربانی دینے کا عزم ظاہر کیا۔

نجمہ جب اچھی طرح اس کے جوش محبت کو بھڑکا چکی، لوہا جب خوب گرم ہو گیا تو اس نے خوب زوردار

چوٹ لگائی۔

"اگر مجھ سے دوستی کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے ایسا تحفہ دو جیسا آج تک کسی نے نہ دیا ہو۔

تمہارے تحفے سے ہی میں اندازہ لگالوں گی کی تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔"

جابر چور اچکا تو پہلے ہی تھا۔ اس نے کون سا مزدوری کر کے تحفہ دینا تھا لوٹ مار ہی کرنی تھی۔

پس اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے اب کی بار کوئی بڑا ہاتھ مار کر محبوبہ کو مہنگا تحفہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

بابا کرم دین زندگی کی ایک سو دس بہاریں دیکھ چکے تھے۔

اور پھر ایک دن اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ان کی محبتوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔

بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں لواحقین کا ایک جم غفیر تھا جو سوگوار تھا لیکن مرنے والوں کے ساتھ کب مرا جاتا ہے۔ آخر کار سب کو صبر کرنا پڑا۔

برادری والے لوگ تھے، دوست، احباب کا حلقہ وسیع تھا۔ سوئم کے موقع پر تمام دوست احباب اور رشتہ داروں کو مدعو کیا گیا۔

سوئم کے موقع پر چونکہ بہت سے لوگوں کے کھانے پینے کا اہتمام کرنا تھا اس لئے اس سے ایک دن قبل دونوں بھائی تقریباً اچھی خاصی رقم لے کر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ضروری سامان خریدنے کے لئے شہر چلے گئے۔

شہر گاؤں سے پندرہ کلومیٹر دور تھا۔ ابھی راستے میں ہی تھے کہ ایک موڑ مڑتے ہی گھات لگائے ڈاکوؤں نے فائرنگ کر دی۔

ایک فائر موٹر سائیکل کے ٹائر میں لگا۔ ٹائر پھٹتے ہی موٹر سائیکل قابو سے باہر ہو گئی اور پختہ سڑک پر گر گئی۔ دونوں بھائیوں کے پاؤں بائیک کے نیچے آ گئے تھے

رائفل بردار ڈاکو قریب آئے، ان کو نیچے سے نکالا۔ چابی نکال کر دور کھیت میں پھینک دی، موبائل جیب سے نکال لیا۔ انہیں گھسیٹ کر دور کھیت میں لے گئے جامہ تلاشی لی تو رقم ان کے ہاتھ لگی۔

زخمی بھائیوں نے بڑی منت سماجت کی کہ۔

"ہمارے ابا جی کا سوئم ہے۔ مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہے یہی ہمارے پاس جمع پونجی تھی جو آپ نے نکال لی ہے۔

آپ کا احسان ہوگا۔ آپ ہم پر مہربانی فرمائیں اور ہمارے پیسے واپس کر دیں تاکہ ہم سوئم کے سامان کا بندوبست کر سکیں۔ ایسا نہ ہوا تو ہماری بہت ذلت رسوائی ہوگی۔ آپ کو بھی مرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے۔"

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، الٹا ان کو تھپڑوں اور رائفلوں کے بٹوں سے مارنا شروع کر دیا۔ گالیاں دیں، سخت سرزنش کی اور کہا۔

"ہمیں صرف پیسے چاہئیں کوئی مرے، جیے اس کا ختم پڑھا جائے نہ پڑھا جائے، مہمان بھوکے جائیں یا کھانا کھا کے، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں پیسے چاہئیں تھے وہ ہمیں مل گئے ہیں۔

تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ چپ چاپ پڑے رہو، جب تک ہم نظروں سے اوجھل ہو کر محفوظ مقام تک نہ پہنچ جائیں، تم نے آواز نہیں نکالنی اگر تم نے غلطی سے بھی شور کرنے کی کوشش کی تو واپس آ کر تم کو گولیوں سے بھون دیں گے۔

ہمارا دین، زندگی، ایمان، خواہش، ضرورت صرف پیسہ ہے اور وہ ہمیں مل چکا ہے۔

یہ بولتے ہوئے وہ رفو چکر ہو گئے۔ ہم تو پیسے کے لئے لوگوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اگر کوئی ہمارے راستے میں روڑے اٹکائے تو ہم اس سے اس کی زندگی چھین لیتے ہیں۔"

☆......☆......☆

قیمتی ٹچ موبائل، سونے کا لاکٹ، سونے کی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چوڑیاں اور قیمتی انگوٹھی دیکھ کر نجمہ پر تو سکتہ طاری ہوگیا اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جابر خان یہ سب کچھ اس کے لئے لایا ہے۔ اتنے مہنگے اور خوب صورت تحائف اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔

جابر خان نے جب یہ سب کچھ اس کے حوالے کیا تو وہ تو اس کی بے دام کنیز بن گئی۔ اس پر صدقے واری جانے لگی۔ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے اس کے اوپر لوٹ پوٹ ہونے لگی صرف اس کا ہو کے جینے مرنے کی قسمیں کھانے لگی۔

اپنی محبت کو سچا ثابت کرنے کے لئے، اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرنے کے لئے اور اس کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کے لئے اسے رات میں اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور بولی۔

''آج رات تم میرے مہمان ہو گے، تم نے مجھے خوش کیا ہے میں رات میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔ تمہاری رگ رگ میں خون بن کر گردش کروں گی۔ تمہاری محبت کی پیاس بجھاؤں گی تمہیں آج تک کسی نے اتنا پیار نہیں دیا ہوگا جتنا پیار میں تمہیں دوں گی۔

میں تمہارے تحائف کا حق ادا کردوں گی۔ تمہاری جھولی میں اتنی خوشیاں ڈالوں گی کہ تم کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ تم میرے خوابوں کے شہزادے اور میرے من کے راجا ہو۔ میں تو مدتوں سے اس طرح کے پیار کو ترس رہی تھی۔ آج رات۔ ہم تم ہوں گے بادل ہوگا..... رقص میں سارا جنگل ہوگا۔

اگر تم نے مجھ پر قیمتی تحائف کی بارش کر کے مجھ پر اعتماد کیا ہے تو میں بھی رات کو محبت کے جھولے میں چاہت کے جام پلا کر تمہیں نشے سے مخمور کردوں گی۔''

اور پھر شام ڈھلتے ہی نجمہ محبوب کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئی۔ دیسی مرغ کا گوشت پکانے کی یوں تیاری کی جیسے اس علاقے کا بہت بڑا سردار دعوت پر آرہا ہو کھانے پکانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غسل کیا۔ اپنا مہنگا اور خوبصورت سوٹ زیب تن کیا۔ ایک دوست کا گفٹ کیا ہوا پیرس کا پرفیوم کپڑوں کے اوپر اسپرے کیا۔ بہترین میک اپ کیا۔

اس نے بننے سنورنے کی یوں تیاری کی جیسے آج اس کی شادی ہو اور خوبصورتی کی وجہ سے ہی پسند کر کے دلہن بنایا جائے گا۔

غرض اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں اس نے اپنا سارا عقل وشعور صرف کیا اور پھر محبوب کا انتظار کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

جابر خان آج بہت خوش تھا۔ ایک ایسی چڑیا اس کے جال میں پھنسی تھی جس کی خوشنودی کے لئے اس نے ایک مرحوم کے سوئم پر خرچ ہونے والے پیسے لوٹے تھے۔ اس رقم سے محبوبہ کی سوچ سے بھی بڑھ کر تحفے اس کی نذر کئے تھے۔

انہی خوش کن خیالوں میں محو رات کی تاریکی میں گلیوں۔ بازاروں سے ہوتا ہوا محبوب کے کوچے کی طرف جارہا تھا کہ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہی اس کی مڈبھیڑ ایک باریش بزرگ سے ہوئی۔

بزرگ سفید لباس میں لاٹھی کے سہارے کھڑے تھے۔ اسے پاس سے گزرنے پر روکا اور کہا۔

''تم نے میرے بیٹوں کو لوٹا، جو میرے سوئم کا سامان خریدنے رقم لے کر شہر جارہے تھے۔ تم کتنے ظالم ہو، نہ صرف پیسے چھینے انہیں مارا پیٹا گالیاں دیں، زخمی کیا موٹر سائیکل ناکارہ کردی۔ انہیں بیچ دوراہے پر بے بس ولاچار چھوڑ کر چلے گئے تمہیں ذرا برابر ان پر ترس نہ آیا۔

میں تو اپنے دیگر مرحوم ساتھیوں کے ساتھ آنے والی دعاؤں کا منتظر تھا۔ مگر تم نے میری ان دعاؤں پر پڑا کہ ڈالا۔ گھر والوں کے دکھوں میں اضافہ کیا مجھے ساتھیوں کے سامنے شرمندہ کیا۔ مجھ مرحوم پر تمہیں ترس نہ آیا۔ تم کتنے پتھر دل ہو موت کے خوف سے بھی نہ گھبرائے۔ بے دردی کے ساتھ میرے سوئم کے پیسے لوٹے اور پھر ان پیسوں سے ایک فاحشہ عورت کو تحفے خرید کر دیئے۔

تم صرف جسمانی عیاشی کے لئے انسانیت کی توہین کرتے چلے گئے۔ تم کو احساس نہیں کہ ہم مرحومین کو دعاؤں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔

میرے ساتھ دیگر ایسے مرحوم بھی تھے جن کی اولادیں تمہاری طرح انسانیت کے نام پر دھبہ ہیں۔ وہ دنیاوی عیاشیوں میں کھو کر ان کو کب کے بھول چکے ہیں۔

وہ دعاؤں کے کتنے طلب گار تھے، اس شدت اور پیاس کو میں جانتا ہوں تمہاری درندگی کی وجہ سے وہ میری مہمان نوازی سے بھی مایوس اور غمزدہ ہی گئے۔

جب ہم لوگ مایوس ہوگئے تھے۔ تو جو کرب ان کے چہروں پر تھا اس نے مجھے قبر میں ایک دفعہ پھر اذیت سے ہمکنار کردیا تھا۔

میں نے آج تک کسی پر زیادتی نہیں کی۔ تم پر بھی زیادتی نہیں کروں گا مگر ظلم کا بدلہ تم سے لیا جائے گا میں نہیں تو کوئی اور ضرور تم سے باز پرس کرے گا۔''

اتنا کلام کرتے ہی وہ بزرگ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

جابر خان کا خوف کے مارے برا حال تھا پیشانی پسینے سے شرابور ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کافی دیر بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ بزرگ اور ان کی باتوں کو وہم سمجھا۔

نجمہ کی یادوں میں گم ہو کر ایک دفعہ پھر اپنے محبوب کی گلی کی طرف بڑھنے لگا۔

ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک درخت کے نیچے سے گزرتے ہی اس پر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ وہاں سے بھاگا اور درخت کے نیچے سے نکل کر دور پہنچ گیا۔ بھاگا جارہا تھا کہ اس پر کتوں نے بھونکنا شروع کردیا ایک پتھر اٹھا کر جب کتے کی طرف پھینکنا چاہا تو وہ پتھر بھاری ہوگیا اور ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

پیچھے مڑ کر دیکھا تو کتوں کا ایک ریوڑ دوڑا چلا آرہا تھا جو اس کو کاٹنے کے درپے تھا ان سے ڈر کر بھاگا تو سامنے ایک آدمی آگیا۔ اس نے روک کر پوچھا۔

''کیوں بھاگے جارہے ہو؟''

خوف کے مارے یہ اس کے ساتھ چمٹ گیا۔

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ چھنتے ہی اس شخص کا قد اونچا ہونا شروع ہوگیا۔ یہ بھی اس کے ساتھ ہی بلند ہوتا گیا وہ اتنا بلند ہوگیا کہ گاؤں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

اس شخص نے اسے وہاں سے نیچے پھینک دیا۔

وہ ایک گندے پانی کے نالے میں دھڑام سے آگرا۔ بدبودار پانی سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک عورت لمبے سیاہ رنگ لمبے لمبے دانت ڈراونی شکل اس نے اسے گردن سے دبوچ لیا منہ پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ نوکیلے ناخنوں سے سارا چہرہ لہولہان کردیا۔

وہ بولی۔ ”مرحوم لوگوں کا کفن چوری کرتا ہے۔ فاتحہ کے پیسے لوٹتا ہے مرحومین کا مذاق اڑایا مرے ہوئے ہمارا کیا بگاڑلیں گے۔“

”وہ بزرگ بہت نیک آدمی ہیں۔ جب تک زندہ رہے، لوگوں کے لئے باعث رحمت بنے رہے۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوکر انہیں سکھ پہنچاتے رہے وہ میرے بھی محسن تھے۔

ان پر کئے گئے ظلم کا بدلہ میں تجھ سے لوں گی، تجھے خون کے آنسو رونے پر مجبور کردوں گی تیری زندگی اجیرن کردوں گی۔

وہ پھر بولی۔

”میرا جی چاہتا ہے تیرا خون پی جاؤں، مگر پھر خیال آتا ہے تیرا گندہ خون پی کر میں اپنے منہ کا ذائقہ کیوں خراب کروں۔ ہاں تجھ کو سبق ضرور سکھاؤں گی کہ تو جب تک زندہ رہے چوری، لوٹ مار کا نام نہیں لے گا۔“

پھر جابر کے جسم کو ناخنوں سے آری کی طرح چیرنے لگی۔ جابر خان کا زخمی ہونا تھا کہ اس کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

جابر خان پر تکالیف کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چیختے چیختے گلا بیٹھ گیا اور پھر اس پر غشی کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

ادھر نجمہ انتظار کی سولی پر چڑھی سخت پریشان تھی۔ آنکھیں تھک ہار کر بند ہونے کو تھیں کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے آگ کا انگارہ اس کے ہاتھ پر گر گیا ہو۔ فوراً ہاتھ پیچھے ہٹالیا لیکن اب تو وہی گرمی اور جلن کی شدت گلے پر محسوس ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے گرم سلاخ گردن پر پھیر دی گئی ہو آگ کی جلن سے درد بڑھنے لگا۔ پھر تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔

یہ درد نہیں تھما تھا کہ انگلی میں ڈالی انگوٹھی بجتی میں ڈالے لوہے کی طرح گرم ہوکر انگلی کی جلد جلانے لگی۔

پھر کلائی میں ڈالی چوڑیاں آگ کی طرح تپ کر کلائیاں جلانے لگیں درد کی شدت سے اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔

چیختی چلاتی صحن میں چکر کاٹنے لگی۔ پھر اس کو یوں لگا جیسے انگاروں کے اوپر چل رہی ہو۔ پاؤں کے تلوے گرم ہوکر ٹانگوں کی ہڈیوں کو پگھلانے لگے پھر تو گرمی اور آگ کی تپش نے اس کے جسم کے ایک ایک عضو کو پگھلانا شروع کردیا گرمی کی شدت سے اس کا برا حال تھا۔ چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

گھر چھوڑ کر باہر بھاگنے لگی یوں لگتا تھا آج گرمی کی حدت پگھلا کر اسے مار دے گی۔

اپنے آپ کو آگ کی تپش سے بچانے کے لئے گاؤں کے تالاب کی طرف بھاگنے لگی لیکن گرمی کی شدت نے تو اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے مدد کے لئے پکارنے لگی۔

لوگ شور سن کر باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا اور اچنبھے میں پڑ گئے۔ بھاگتے بھاگتے وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں جابر خان زخموں سے چور بے ہوش گرا پڑا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی وہ درد سے نڈھال گر کر بے ہوش ہوگئی۔

شور وغوغا سن کر پیچھا کرنے والے اس جگہ پہنچ گئے جہاں نجمہ اور جابر خان بے ہوش پڑے تھے۔

ان کو زخمی بے ہوش دیکھ کر لوگوں نے ترس کھا کر گاؤں کے حکیم صاحب کو بلایا، جو حکمت کے ساتھ ساتھ عامل بھی تھے اور دم درود بھی کرتے تھے۔ کتنے ہی لوگ ان کی وجہ سے صحت یاب ہوچکے تھے۔ جن بھوت ہٹانے میں بھی ماہر تھے۔

وہ جب وہاں پہنچے تو دو مریضوں کو شدید زخمی حالت میں دیکھا تو انہیں مطب میں لانے کو کہا۔

ان دونوں کو لوگوں نے مطب میں پہنچادیا تو حکیم صاحب نے کلام الٰہی پڑھ کر ان پر دم کیا اور پھر چند آیات بتائیں کہ وہ پڑھتے رہیں۔

پھر حکیم صاحب نے دم کیا ہوا پانی ان پر چھڑکا جس سے ان کی طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی۔

آرام آنے پر ان دونوں کو نجمہ کے گھر بھیج دیا گیا۔ وہ دونوں جونہی دروازے سے اندر داخل ہونے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کا صحن پانی سے جل تھل ہے اور چھوٹے چھوٹے سانپ کثیر تعداد میں تیر رہے ہیں ان کی آنکھیں جل رہی ہیں اور منہ سے آگ کی لکیریں نکل رہی ہیں۔

یہ خوف ناک منظر دیکھ کر ان کے تو ہوش اڑ گئے۔ بڑی مشکل سے حکیم صاحب کا بتایا ہوا ورد یاد کرکے زور زور سے پڑھنے لگے۔

ورد شروع کیا ہی تھا کہ پانی آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا۔ کافی دیر بعد صحن بالکل خشک ہوگیا۔ تب وہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔

دونوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے برا حال تھا۔ بھوک مٹانے کے لئے جب نجمہ نے فریج کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ تمام برتنوں میں خون بھرا ہوا ہے خون کی وجہ سے تمام فریج سرخ ہوچکا ہے۔

ایک دفعہ پھر وہ خوف سے لرزنے لگے، بھوک اور پریشانی سے برا حال تھا۔

دوبارہ روٹی پکانے کے لئے جب آٹا پرات میں ڈالا جانے لگا تو پانی ڈالتے ہی آٹا خون اور گوشت کے لوتھڑوں میں بدل گیا۔

نجمہ اور جابر خان نے رو دھو کر خوف وہراس کی کیفیت میں رات گزاری۔ علی الصباح دونوں مطب کی طرف روانہ ہوگئے راستے میں تھے کہ بے شمار رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کو حکیم صاحب کے پاس جانے سے روکا جارہا ہو۔

اچانک ان کو حکیم صاحب کا بتایا ہوا ورد یاد آیا اور پھر پڑھنے کی دیر تھی کہ ہر چیز غائب ہوگئی راستہ صاف ستھرا ہوگیا۔

وہ بھاگم بھاگ مطب میں پہنچ گئے اور فوراً حکیم صاحب کے پاؤں میں گر گئے رو رو کر رات کے واقعات سے لے کر اب تک کے واقعات سنائے اور مدد کے لئے گڑگڑا کر منت سماجت کرنے لگے حکیم صاحب کو ان پر بڑا ترس آیا۔

ان کو سامنے بیٹھایا ایک گول دائرہ کھینچا خود بھی دائرہ کے اندر بیٹھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ یوں لگا جیسے زلزلے سے زمین اور مکانات تھرتھرانے لگے ہوں۔ سخت سیاہ گھٹا ٹوپ آندھی چلی۔ لگتا تھا کچی دیواروں، درختوں کو اڑا کر ساتھ لے جائے گی۔ لیکن مجال ہے جو دائرے کے اندر ہلکا سا ہوا کا جھونکا بھی گیا ہو۔

حکیم صاحب بڑے سکون سے آنکھیں بند کئے کلام الٰہی پڑھنے میں مصروف تھے۔ جبکہ نجمہ اور جابر خان بڑی مشکل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں مصروف تھے۔

پھر آہستہ آہستہ آندھی تھمنے لگے، آسمان صاف ہونے لگا، اچانک لمبے ناخنوں، بڑے دانتوں اور جلتی آنکھوں والی ایک انتہائی بدصورت عورت سامنے آگئی۔

اس مکروہ صورت نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں حکیم صاحب پر مرکوز کردیں اتنے میں حکیم صاحب کی آواز سنائی دی۔

”ان معصوموں کا جینا حرام کیوں کررکھا ہے۔ کیوں ان کی زندگی اجیرن کررکھی ہے۔ خوف ودہشت سے زندہ درگور کردیا ہے یہ لوگ تمہاری وجہ سے خون کے آنسو رو رہے ہیں کسی پل ان کو چین نصیب نہیں۔ اپنے اوچھے ہتھکنڈے ختم کرو اوران کی جان چھوڑ دو ورنہ......“

”آپ مجھے دھمکیاں دے کر اپنے مقصد سے روک نہیں سکتے۔ میں مر تو سکتی ہوں، عبرتناک انجام

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سے دوچار ہوسکتی ہوں مگر ان کو زندہ گور میں گاڑ جاؤں گی یہ زندگی کی بھیک مانگیں گے کوئی ان کو قری پھٹکنے نہیں دے گا۔

یہ موت مانگیں گے مگر موت ان سے دور بھاگے گی۔ ان مکروہ لوگوں سے موت بھی نفرت کرے گی۔

آپ ان کو معصوم کہہ رہے ہیں ان کو تو انسان کہنا بھی انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ تو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ ہیں۔ ان کو عبرتناک انجام تک پہنچانے کے لئے اپنی قربانی دینی پڑی تو میں دریغ نہیں کروں گی۔ ان کے سبق آموز انجام سے کتنے ہی لوگ سکھ کا سانس لیں گے یہ لوگ جو آپ کی نظر میں معصوم ہیں انسانوں کے لئے یہ موذی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

میں اپنا مقصد ضرور پورا کروں گی۔"

یہ نفرت آمیز باتیں سن کر حکیم صاحب سخت پریشان ہوکر نجمہ اور جابر خان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے حقیقت حال جاننا چاہی۔

وہ دونوں دوزانوں بیٹھ کر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے اپنے کئے پر سخت شرمندہ تھے جابر بولا۔

"میں نے ناجائز خواہشات کی تسکین کے لئے لوگوں کو لوٹنا شروع کردیا اس دوران دو ایسے آدمیوں کو لوٹا جو اپنے مرحوم والد کے لئے سوئم کا سامان لینے جارہے تھے۔

اس لوٹی ہوئی رقم سے میں نے پاس بیٹھی نجمہ کے لئے سونے کے تحائف اور نیچ موبائل خریدا۔ اس دن کے بعد سے ہماری یہ حالت ہوئی ہے۔ میں اپنے کئے پر سخت شرمندہ ہوں۔"

یہ سنتے ہی نجمہ بھی زاروقطار رونے لگی اور اپنے کئے پر سخت نادم تھی، ناجائز فرمائشوں سے توبہ کرنے لگی، دونوں حکیم صاحب کے قدموں میں پڑے معافی مانگ رہے تھے۔ اور آئندہ تمام گناہوں سے توبہ تائب ہونے کا وعدہ کیا۔

اس گریہ زاری سے حکیم صاحب کا دل پسیجا۔ تو انہوں نے اس آسیبی عورت سے معافی مانگنے کا حکم دیا اور خود بھی اس سے رحم کی درخواست کرنے لگے اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ زندگی بھر یہ کوئی برا کام نہیں کریں گے پہلی غلطی کی معافی دے دو یہ پہلے والا نقصان بھی پورا کریں گے اور آئندہ کوئی بھی ایسا کام سرانجام نہیں دیں گے جس سے کسی کی دل آزادی ہو۔

حکیم صاحب کی بات اس آسیبی عورت نے مان لی اور وہ بولی۔

"اگر آپ کہتے ہیں تو میں ان کو معاف کردیتی ہوں۔ یہ وہ رقم واپس مرحوم کے گھر والوں کو دیں اور ان سے جا کر معافی مانگیں آئندہ بچی توبہ کریں کوئی برا کام نہیں کریں گے۔ دراصل وہ مرحوم بزرگ میرے محسن تھے۔" اور یہ بول کر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

حکیم صاحب نے نجمہ اور جابر خان کو پندونصائح کرکے رخصت کیا۔

نجمہ نے سارے زیور جابر خان کو واپس کئے اس نے بازار جا کر فروخت کردیئے کم ہونے والے پیسے اپنی جیب سے ڈالے اور رقم پوری کردی۔

جابر خان مرحوم بزرگ کے گھر والوں کے پاس گیا رقم ان کو واپس کی اور اپنے فعل کی معافی مانگی۔ دوسرے دن نجمہ اور جابر خان ایک بار پھر حکیم صاحب کے مطب پہنچ گئے۔

رقم کی واپسی کے بارے میں بتایا تو مخصوص ورد کرکے حکیم صاحب نے اس آسیبی عورت کو بلایا اور تمام کارروائی اس کے گوش گزار کی، یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی، نجمہ اور جابر خان کو سچے دل سے معاف کردیا۔

لوگوں نے گناہ کی بجائے ان کو ہمیشہ کے لئے شرعی طریقے سے شادی کے بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کیا اور پھر تھوڑے عرصے بعد ہی ان کی شادی ہوگئی، آج وہ اپنے دو معصوم بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

☠

پراسرار آواز

رضوان علی سومرو۔ کراچی

دونوں شخص ایک دوسرے کو قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے کہ آناً فاناً ان دونوں میں سے ایک مہیب سانپ بن گیا اور دوسرا ایک سیاہ بلا میں بدل گیا ار پھر دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے۔

ظلم وزیادتی اور خوف کے خمیر میں گندھی ہوئی پراسراریت کے لبادے میں لپٹی کہانی

آج دانیہ نے پھر وہی خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب بہت ہی عجیب اور خوفناک تھا۔

وہ دیکھتی ہے کہ وہ ایک انتہائی خوبصورت کمرے میں شاہانہ مسہری پر لیٹی ہے اس کے جسم کا اوپری دھڑ بالکل برہنہ حالت میں ہے اس کے چہرے پر کیف ومستی کے تاثرات ہیں آنکھیں جیسے نشے کی زیادتی کے سبب سرخ ہورہی ہیں...... دفعتاً نہ جانے کہاں سے ایک لمبا سیاہ رنگ کا کالا سانپ جو کہ موٹائی میں کسی اژدھے سے کم نہ تھا۔

دھیرے دھیرے رینگتا ہوا مسہری پر چڑھ جاتا ہے، دانیہ اس سانپ کو دیکھ کر اٹھنا چاہتی ہے مگر اٹھ نہیں پاتی اس کا پورا جسم مفلوج ہوجاتا ہے، خوف سے وہ چیخنا چاہتی ہے مگر چیخ نہیں پاتی۔ وہ کالا سانپ اس کے جسم کے اوپری حصے سے جیسے ہی لپٹتا ہے تو اس کی فلک

WWW.URDUBOOKS.NET

شگاف چیخ پورے کمرے کو دہلا دیتی ہے اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

دانیہ کو اس خوف ناک خواب کے سبب ساری رات نیند نہ آئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی، صبح سو کر اٹھی تو اس کا پورا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، ذہن بھی بوجھل سا تھا، کالج کی بھی چھٹیاں تھیں اس لئے بے زاری کا احساس دوچند ہو گیا تھا۔

دانیہ کی عمر کی ہر لڑکی خواب میں کسی ایسے انسان کا تصور کرتی ہے جو کہ خوب صورت ہو مردانہ وجاہت کا شاہکار ہو، جس کے بازو مضبوط اور سینہ اتنا چوڑا ہو کہ اس میں سما کر وہ ہر دکھ بھول جائے۔

دانیہ بھی کسی ایسے مرد کا خواب دیکھنا چاہتی تھی، جس کی بانہوں میں اسے تحفظ اور زندگی کا نیا احساس ملے۔

دانیہ عمر کے اس دور میں تھی جب ہر طرف رنگ ہی رنگ ہوں ہر شے حسین نظر آنے لگتی ہے بے اختیار مسکرانے کو دل چاہے وہ تو خود بھی بے حد حسین تھی سرخ وسفید رنگت، گھنے چمک دار سیاہ بال، بوٹا سا قد، جسمانی اعضاء بے مثال، قیامت خیز جسم۔

دانیہ نے اپنی ایک دوست کو فون کر دیا تھا جسے وہ اس پراسرار خواب کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد روبی اس کے گھر میں تھی۔

''کیا بات ہے کس سے کشتی کر کے آئی ہو۔'' دانیہ کی اڑی اڑی رنگت پریشان چہرہ دیکھ کر وہ ہنس کر بولی۔

''نن...... نہیں...... تم ہنسو گی سن کر......'' دانیہ سہمے ہوئے بولی۔

''ارے بابا...... بات اگر ہنسی کی ہوئی تو ضرور ہنسوں گی۔'' وہ شوخ لہجے میں بولی۔

دانیہ نے مختصراً اسے اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔

روبی نے جب دانیہ کے خواب کے بارے میں سنا تو ہنس ہنس کر اس کے پیٹ میں مروڑ پڑ گئے۔

جبکہ دانیہ کی وہ کیفیت تھی جیسے کسی نے سرِ بازار اسے جوتے سے پیٹ دیا ہو۔

دانیہ کا بنا ہوا منہ دیکھ کر روبی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''میرا تمہارا مذاق اڑانے کا ارادہ نہ تھا۔ تمہاری حیرت کی کیفیت دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔''

''نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بالکل سچ ہے۔'' دانیہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''ارے...... میری جان...... ایسا کچھ نہیں...... خوابوں کی کتاب میں، میں نے پڑھا تھا کہ سانپ انسان کی خواہشات کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔'' روبی فلسفیانہ لہجے میں بولی۔

''مگر...... مجھے ڈر لگ رہا ہے......'' دانیہ بدستور خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا چلو تیار ہو جاؤ آرٹ گیلری چلنا ہے وہاں پر تصویری نمائش ہو رہی ہے۔'' روبی نے زبردستی دانیہ کو غسل خانے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

اور پھر دونوں آرٹ گیلری میں پہنچ گئیں۔ موِن آرٹ گیلری کا شمار ملک کی سب سے بڑی آرٹ گیلری میں ہوتا تھا، یہاں اس فنکار کے فن کی نمائش ہوتی تھی جو کہ واقعی قابل ہوتا تھا۔ آج آفاقی کے فن پاروں کی نمائش اس گیلری میں تھی، آفاقی کون تھا کوئی نہیں جانتا تھا مگر اس کے فن پارے فن کی دنیا کا شاہکار ہوتے تھے۔

آفاقی کی بنائی گئی تصویریں واقعی شاہکار تھیں۔ دانیہ تو ان تصویروں کو دیکھ کر مبہوت ہو گئی تھی، تصویریں مختلف قسم کے موضوعات پر بنائی گئی تھیں۔ ہر تصویر اپنی مثال آپ تھی۔

''واقعی...... آفاقی کمال کا مصور ہے۔'' دانیہ نے روبی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ان تصویروں کو دیکھ کر اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' روبی مسکرا کر بولی۔ دونوں تصویریں دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں

آرٹ گیلری میں رش خاصا بڑھتا جا رہا تھا۔

دفعتاً ایک تصویر کو دیکھتے ہی دانیہ ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی، یہی حال روبی کا بھی ہوا تھا وہ تصویر تھی ہی اتنی خوف ناک۔

دانیہ کے چہرے پر دہشت اور خوف کے تاثرات نظر آ رہے تھے اس نے اپنے خوابوں کو تصویر کی صورت میں دیکھ لیا تھا۔

ایک نہایت جوان اور خوبصورت عورت نیم برہنہ حالت میں مسہری پر لیٹی تھی، اسکے چہرے پر خوف ودہشت کے تاثرات نظر آ رہے تھے...... عورت کے چہرے پر موجود دہشت وخوف کو اس خوب صورتی سے کینوس پر منتقل کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے کو حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔

''ی...... یہی...... وہ خواب ہے جو میں نے دیکھا تھا۔'' دانیہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

''یہ محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔'' روبی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''نن...... نہیں...... یہ اتفاق نہیں۔'' دانیہ کا لہجہ لرزیدہ تھا۔

''جان من...... کول ہو جاؤ...... ریلیکس...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے اس تصویر کو پہلے کہیں دیکھ رکھا ہو...... وہ تمہارے تحت الشعور میں محفوظ ہو گئی ہو۔'' روبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر...... وہ خواب۔''

''جان من...... خواب ہی تو ہے اور سانپ تم کو کھا تو نہیں جائے گا......'' روبی نہایت نرم لہجے میں بولی۔

''واقعی...... ٹھیک کہا آپ نے...... یہ سانپ انہیں کھا تو نہیں جائے گا۔'' ایک شوخ سی آواز ان دونوں کو اپنے عقب سے سنائی دی دونوں نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئیں۔

انہوں نے اپنی زندگی میں اس قدر متاثر انگیز شخصیت کا مالک پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ نوجوان بھرپور مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا، دانیہ کو ایسا لگا کہ کوئی یونانی شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اس نوجوان کا قد کسی بھی طرح سے 6 فٹ سے کم نہیں تھا بھرے بھرے بازو، کسرتی جسم، نیم غنودہ آنکھیں گندمی رنگ، چوڑا چکلا سینہ۔

اس نوجوان نے جب دیکھا کہ دونوں لڑکیاں اسے ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہی ہیں تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''محترمہ...... نیند سے جاگیے۔'' وہ ان دونوں کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا کر بولا۔

''اوہ......'' دونوں بیک وقت چونکیں۔

روبی اور دانیہ دل ہی دل میں بے حد شرمندہ تھیں کہ ایک اجنبی کو اس طرح گھور رہی تھیں۔

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ ان کے دل کی بات جان کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' دانیہ بگڑ کر بولی، ویسے اس کا پینٹنگ کا خوف کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔

''میں نے کہا یہ محض ایک مصور کا شاہکار تخیل ہے جس سے آپ خوف زدہ ہو رہی تھیں......'' نوجوان مسکرا کر بولا۔

''آپ کی تعریف؟'' روبی نے منہ بنا کر پوچھا۔

''تعریف...... اس خدا کی جس نے انہیں حسین بنایا۔'' دانیہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

اتنی بے باکی اور بے تکلفی پر دانیہ بری طرح گھبرا گئی۔

''بدتمیز ہیں آپ، آپ کو لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔'' روبی بری طرح سے سیخ پا ہو کر بولی۔

''کسی کے حسن کی تعریف کرنا کوئی بدتمیزی نہیں ویسے خاکسار کو آفاقی کہتے ہیں۔''

''آپ آفاقی ہیں...... اس نمائش میں آپ کی

ہی پینٹنگز ہیں۔'' روبی نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''جی میں ہی آفاقی ہوں۔'' وہ مسکراہٹ سے بولا۔

''یہ آپ نے کیسے بنائی ...... میرا مطلب کہیں سے دیکھ کر بنائی ہے۔'' دانیہ نے سانپ والی پینٹنگ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ارے ...... یہ ایک تصویر کا انلارجر سمجھ لیں...... جوکہ ایک میگزین میں چھپی تھی۔'' آفاقی وضاحت کرتا ہوا بولا۔

''ہوگئی...... تسلی......'' روبی نے دانیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا آپ لوگ میرے ساتھ ایک کپ کافی پینا پسند کریں گی؟'' آفاقی بولا۔

''جی...... ضرور۔'' دانیہ چاہنے کے باوجود بھی منع نہ کرسکی۔

وہ دونوں آفاقی کے ساتھ جاتے ہوئے نہ دیکھ سکیں کہ اب وہ پینٹنگ وہاں نہیں ہے بلکہ غائب ہوچکی ہے۔

آفاقی کے ساتھ دونوں نے کافی پی اس کے بعد دونوں کوئی ایک گھنٹہ تک وہاں موجود رہیں پھر دونوں آفاقی کو بائے بائے کہتے ہوئے واپس آگئیں۔

دانیہ رات کو بستر پر لیٹی تو اس کے ذہن میں صرف آفاقی کا تصور تھا آفاقی کی باتیں اتنی اچھی تھیں کہ بے اختیار دل اس کی طرف کھینچا چلا گیا۔ کافی کے ساتھ آدھے گھنٹے کی ملاقات دانیہ کو اپنی زندگی کا حاصل لگنے لگی تھی۔

دانیہ کافی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی، اچانک ایسے لگا کہ جیسے آفاقی اس کے سامنے کھڑا ہو اس کا خیال اس قدر قوی تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

آفاقی کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

''آپ میرے بارے میں سوچ رہی تھیں؟''

''نن...... نہیں......'' دانیہ کے لہجے میں لرزہ طاری ہوگیا۔

''جھوٹ...... جھوٹ بولتے ہوئے تم پکڑی جاتی ہو۔'' آفاقی فوراً آپ سے تم پر آتے ہوئے بولا۔

دانیہ کو حیرانی ہوئی کہ آفاقی نے اس کا جھوٹ کیسے پکڑ لیا یقیناً وہ کوئی جادوگر ہے۔ دانیہ نے دل میں سوچا۔

''نہیں...... جادو تو تم میں ہے...... میں جادوگر کہاں......'' آفاقی اس کی سوچ کو پکڑتا ہوا بولا۔

دانیہ کو پھر حیرانی ہوئی لیکن دوسرے ہی پل وہ شرما سی گئی اس کی آنکھوں میں سرخ سے ڈورے تیرنے لگے چہرہ حیا کی لالی سے سرخ ہوگیا تھا۔

آفاقی کے اس بھرپور بوسے میں بڑی دل بستگی تھی جو اس نے دانیہ کے ہاتھ پر دیا تھا۔

دانیہ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا لیکن اسے اپنے ہاتھ پر شدید قسم کی حرارت محسوس ہورہی تھی...... وہ حرارت جو اس کے پورے جسم میں ہزاروں وولٹ کا کرنٹ بن کر دوڑ رہی تھی۔

دانیہ آفاقی کو اس بے باکی کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا...... وہ موبائل کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ آفاقی یک دم چھلاوہ ہوگیا تھا۔

دانیہ نے فون ریسیو کیا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ابھی آپ میرے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں ناں۔'' آفاقی کی مانوس آواز سن کر دانیہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''نن...... نہیں تو......'' دانیہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ۔'' دوسری طرف سے ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔

''آپ کو کیسے معلوم؟'' دانیہ کے منہ سے از خود نکلا۔

''آپ کی سانسوں کی مہک سے۔'' آفاقی رومانی انداز میں بولا۔

دانیہ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ آفاقی کی باتوں سے دانیہ پر سحر سا طاری ہوا جا رہا تھا۔ آفاقی کی لچھے دار اور سحر انگیز باتوں نے دانیہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

پھر آفاقی نے دانیہ کو تنہائی میں ملنے پر آمادہ کرلیا، آفاقی سے دانیہ کئی مرتبہ ملی، ایک ماہ کے اندر اندر ہی آفاقی نے دانیہ کو پوری طرح سے محبت کے حصار میں جکڑ لیا تھا۔

ایک روز آفاقی نے دانیہ سے کہا۔ ''جان...... آج میں تمہیں اپنے والدین سے ملانے لے چلوں گا۔'' وہ دونوں اس وقت ہائی سرکل نائٹ کلب کے ڈانسنگ فلور پر ڈانس کررہے تھے یہ جملہ دانیہ کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ابھی......'' دانیہ نے مخمور لہجے میں کہا۔ شاید دانیہ پر آفاقی کی محبت کا خمار طاری تھا۔

''ہاں...... جان...... اب مجھ سے یہ دوری برداشت نہیں ہوتی۔'' آفاقی نے رقص کا گول راؤنڈ لیتے ہوئے کہا۔

''تم...... بہت اچھا ناچتے ہو......'' دانیہ نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں...... تمہاری محبت نے سب سکھا دیا۔'' وہ اس کی زلفوں سے کھیلتا ہوا بولا۔

''اس راؤنڈ کے بعد ہم گھر چلیں گے تمہارے۔''

''ضرور...... ضرور۔'' آفاقی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

رات تاریک اور سرد تھی۔ دانیہ اس بات سے بے پرواہ آفاقی کے ساتھ کار میں بیٹھی چلی جارہی تھی وہ یوں ایک ایسے شخص کے ساتھ جارہی تھی جس کو وہ ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں تھی۔

کار کچھ دور چلنے کے بعد ایک عمارت کے سامنے رک گئی سڑک پر اندھیرا تھا آفاقی دانیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے گھر کے اندر لے آیا۔ آفاقی کا ڈرائنگ روم نہایت شاندار تھا۔ دانیہ نے اتنا شاندار اور خوب صورت ڈرائنگ روم پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، چاروں دیواریں وال پیپرز سے مزین تھیں۔

آفاقی اسے بٹھا کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

اسے بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دانیہ کے نتھنوں سے عجیب سی بو ٹکرائی جیسے کہیں گوشت سڑ رہا ہو پھر دفعتاً دانیہ کے کانوں میں سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں سنائی دیں، تو دانیہ کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا...... آفاقی کو وہ پکارنا ہی چاہتی تھی کہ اس کا منہ پیچھے سے کسی نے دبا دیا، گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ مچل بھی نہ سکی اور پھر اس کو کچھ ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

دو سال بعد

انسپکٹر جمشید کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا دو سال بعد آج چھٹی پر وہ اپنے گھر جارہا تھا، پولیس کی سروس جمشید کے لئے کسی چیلنج سے کم نہ تھی مگر دو سال کے اندر اندر اس نے مشہور اور خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کرکے حکام بالا کے دل جیت لئے تھے آج اسے اپنے گھر جانے کی بے حد خوشی تھی، ریل کا سفر ویسے بھی جمشید کی بڑی کمزوری رہا تھا، جیسے جمشید اپنے سامان کے ساتھ پلیٹ فارم پر پہنچا تو یہ انکشاف نہایت روح فرسا تھا کہ ٹرین دو گھنٹے لیٹ تھی والدین سے دو سال کی دوری تو جمشید نے کاٹ لی مگر یہ دو گھنٹے اسے دو صدی کے برابر لگ رہے تھے اس نے سوچا یہ وقت پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونکتے ہوئے گزار دینا چاہئے۔

دفعتاً اس کی نظر ایک عورت پر پڑی عورت انتہائی غریب اور مفلس معلوم ہوتی تھی اور شاید بھوکی بھی، جمشید آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس عورت کے قریب پہنچ گیا جو کہ اسٹال والے سے اپنی بھوک کی شکایت کررہی تھی، اسٹال والا نہایت نفرت بھری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''اماں کھانا کھاؤ گی......'' جمشید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... بیٹا...... بھوک بڑی ظالم ہے جب لگتی ہے تو سوال پر مجبور کردیتی ہے۔'' اماں فلسفہ بگھارتے ہوئے بولی۔

جمشید نے اپنا ٹفن اماں کے سامنے رکھ دیا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اماں بولی۔

"بیٹا..... اللہ بڑا کارساز ہے وہ انسانوں کو انسانوں کی مدد کا ذریعہ بناتا ہے..... تو نے ایک غریب بڑھیا کی مدد کی ہے میری دعا ہے اللہ تجھے ہر مصیبت سے نجات دے۔ تیرے مصائب دور کرے....." اماں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اماں تمہارا شکریہ۔" جمشید کی آنکھوں میں آنسو تھے تھوڑے سے سالن اور دو تین روٹیوں کے بدلے اتنی ساری دعائیں۔

"کوئی ہے بیٹا جسے تیری ضرورت ہے..... کوئی پریشانی میں تجھے پکارے تو اس کی مدد ضرور کرنا۔"

"کون ہے اماں جسے میری ضرورت ہے؟" اماں جواب دینے کے بجائے حق اللہ کا نعرہ بلند کیا اور دوسری طرف چل دی۔

ٹرین کا سفر جمشید کے لئے انتہائی دلچسپ ثابت ہوا۔ جیسے جیسے سفر آگے بڑھتا جاتا جمشید کے دل میں اپنے پیاروں سے ملنے کی طلب اور بڑھتی جاتی جیسے ہی ٹرین شہر کی حدود میں داخل ہوئی جمشید کے دل میں جیسے خوشی کے شادیانے بج اٹھے۔

دو سال کے اندر محلے میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ پرانے مکانوں کی جگہ نئی اور کئی کئی منزلہ عمارتیں بن چکی تھیں سڑکیں صاف ستھری اور پختہ ہو چکی تھیں جمشید کو یہ دیکھ کر نہایت حیرت بھی ہوئی وہ میدان جو کہ دو سال قبل گندگی اور تعفن کا ڈھیر ہوا کرتا تھا اب خوب صورت اور وسیع و عریض پارک کی صورت اختیار کر چکا تھا جہاں سرِشام ہی خوب صورت اور عمر رسیدہ بوڑھوں کا جھمگٹا نظر آنے لگتا تھا۔

دو سالہ پولیس کی زندگی اور گھر سے دور رہ کر جو تھکن جمشید محسوس کر رہا تھا اسے اتارنے کے لئے جمشید صرف آرام کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنی آمد کی اطلاع کسی کو نہ دی وہ چاہتا تھا کہ اپنے سارے پرانے دوستوں سے خود ہی ملے سب کو سرپرائز دے۔

چنانچہ چوتھے روز جمشید اپنے دوستوں سے ملنے گھر سے نکل پڑا۔ سب سے پہلے وہ اپنے پرانے دوست ڈاکٹر ٹیپو سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کے گھر اور کلینک پر تالا لگا دیکھ کر جمشید کو خاصی مایوسی ہوئی۔

چنانچہ جب اس نے اپنے والد سے ٹیپو کے متعلق دریافت کیا تو وہ منہ بنا کر بولے۔ "بیٹا..... وہ بے غیرت جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟" جمشید چونک کر بولا۔

"ہاں..... عطائی ڈاکٹروں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔" والد صاحب سرد لہجے میں بولے۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" جمشید نے سنجیدگی سے کہا۔

"بیٹا..... اس کی دوا سے ایک بچہ مر گیا تھا۔ اسے سزا ہو گئی۔ 10 سال کی۔"

جمشید نے ٹیپو کے انجام کے بارے میں سنا تو اسے نہایت ہی دکھ محسوس ہوا۔ کچھ دیر تک وہ والد صاحب سے ادھر ادھر کی گفتگو کر کے جب وہ باہر جانے کے ارادے سے نکلا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کے والد صاحب کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

بعد میں جمشید نے بھی دیکھ لیا کہ انہوں نے اس کے اٹھتے ہی اسکی والدہ کو کچھ ایسا اشارہ کیا جس کا واضح مطلب یہی تھی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں جمشید کی والدہ کی زبانی کہلوانا چاہتے ہیں اس سے قبل جمشید کمرے سے نکلتا والدہ نے آواز دے دی۔

"جمشید.....؟" والدہ نے کچھ سوچ کر قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"تم شاید اس وقت چہل قدمی کی نیت سے باہر جا رہے ہو۔"

"جی امی۔" جمشید نے سعادت مندی سے کہا۔

"ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔" والدہ کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات دیکھ کر جمشید کے اندر تجسس پوری طرح بیدار ہو گیا۔ جمشید کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ضرور کوئی اہم بات ہے جو اس کی والدہ اس سے کرنا چاہتی ہیں۔ "بات ضرور اتنی اہم تھی جمشید کے والد خود بھی کر سکتے تھے مگر والدہ سے کروانے کا

مقصد نہایت حیرت انگیز تھا۔ جمشید باادب کھڑا اماں کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم آسیب یا شیطانی قوتوں کو مانتے ہو؟" ماں نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"جی....." جی کچھ ضرورت سے طویل ہو گیا تھا جمشید کے لہجے میں حیرت تھی آج والدہ کس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔

"میں سمجھا نہیں....." جمشید نے حیرت سے کہا۔

"میں..... تم..... سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم اپنے تمام پرانے دوستوں سے ضرور ملنا..... لیکن....."

لیکن کہنے کے بعد والدہ خاموش ہو گئیں تو جمشید کا ذہن جلد از جلد اس بات کو جان لینے کے لئے اور بھی مضطرب ہو گیا جو کہ ابھی تک مخفی تھی چونکہ جمشید شروع سے ہی الجھاؤں کا قائل نہ تھا اس لئے والدہ کی خاموشی محسوس کر کے جلدی سے بولا۔

"امی..... کیا بات ہے؟ کیا آپ مجھے کسی خاص دوست سے ملنے نہیں دینا چاہتیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں، بات یہ ہے کہ تم اپنے دوستوں سے ضرور ملو، ہو سکتا ہے وہ تمہارے سامنے آفاقی کا ذکر کریں اور میں نہیں سمجھتی کہ تم اس سے ملو۔" والدہ کے لہجے میں مامتا کا احساس جھلک رہا تھا۔

"میرا خیال ہے یہ نام میں پہلی بار سن رہا ہوں۔" جمشید نے کہا۔

"ہاں..... یہ غلیظ اور مردود انسان کوئی ڈیڑھ سال قبل اس علاقے میں آیا ہے۔" والد صاحب نے پہلی بار زبان کھولی۔

"یہ انتہائی ذلیل اور کمینہ طبیعت کا مالک ہے۔" والد نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا آفاقی نے خدانخواستہ آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی....."

"جس دن اس کی نوبت آئی میں اسے زندہ درگور کر ڈالوں گا۔" جمشید کے والد نے جمشید کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

ساتھ ہی جمشید یہ بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کے لہجے میں غصے کے ساتھ احساس مجبوری بھی جھلک رہا تھا۔

"محلے والے آفاقی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اسے غلیظ اور کمینہ سمجھتے ہیں تو اسے نکلوایا بھی جا سکتا ہے۔" جمشید بولا۔

جمشید نے آفاقی کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی غرض سے کہا۔ "محض میری ایک درخواست کافی ہے اسے محلے سے نکالنے کے لئے۔"

خدا کے لئے ایسا مت کرنا..... آفاقی انسان نہیں..... اگر انسان ہوتا تو اب تک محلے والے اسے بھگا چکے ہوتے۔" اتنا کہہ کر جمشید کی والدہ خاموش ہو گئیں۔

اپنی والدہ کو خاموش دیکھ کر جمشید کا تجسس عروج پر پہنچ گیا۔ ضرور کوئی بات ہے جسے زبان پر لاتے ہوئے جمشید کی والدہ ڈر رہی تھیں۔

"وہ انسان نہیں تو پھر کیا ہے۔" جمشید نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں..... وہ مردود کچھ شیطانی اور پراسرار قوتوں کا مالک بھی ہے..... شروع شروع میں جب وہ یہاں آیا تو لوگ اسے نہایت ملنسار سمجھتے رہے۔ لوگ اس سے ملنے بھی گئے۔ لیکن ایک واقعہ نے پورے محلے میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔" والد صاحب خاموش ہو گئے ان کے چہرے سے خوف و ہراس ظاہر ہونے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ واقعہ انتہائی خوف ناک اور سنسنی خیز ہے جسے بیان کرتے ہوئے بھی وہ ہچکچا رہے ہیں۔

جمشید انتہائی بے چینی اور انجانی سی کشش محسوس کر رہا تھا قدرے توقف کے بعد والد صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔

"جس وقت لوگ آفاقی سے ملنے اس کے بنگلے میں داخل ہوئے نہ جانے کہاں سے ایک سیاہ رنگ کا سانپ جو کہ موٹائی میں کسی اژدھے سے کم نہ تھا، لوگوں

www.PakSociety.com

کے سامنے پھن اٹھا کر لہرانے لگا ہجوم میں سے ایک شخص نے اپنے پستول سے اس پر فائر کر دیا، چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ سانپ کو ساری کی ساری گولیاں لگیں اور سانپ زخمی ہو کر ان کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو۔'' جمشید حیرت سے بولا۔

''محلے والوں کا بھی یہی خیال تھا لیکن دوسرے دن آفاقی زخمی حالت میں گھر سے برآمد ہوا جس ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا تھا اس کا کہنا تھا کہ 4 گولیاں اس کے جسم میں پائی گئیں تھیں اتنی گولیاں لگنے کے بعد کوئی عام آدمی دو گھنٹے کے اندر اندر مر جائے۔ مگر یہ آفاقی ایک گھنٹے میں جانبر ہو گیا۔'' جمشید کے والد بولے۔

''بہت..... خوب..... یعنی کافی دلچسپ اور پراسرار شخصیت ہے۔'' جمشید نے مسکرا کر کہا۔

''جس شخص نے سانپ پر گولیاں چلائی تھیں دو دن بعد وہ شخص پراسرار طور پر ہلاک ہو گیا۔'' والد صاحب غصے میں بولے۔

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آفاقی ایک سانپ ہے جس نے اس شخص سے بدلہ لیا جس نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔'' جمشید کے لہجے میں الجھن تھی۔

''بالکل.....'' والد صاحب نے سر ہلایا۔

''مگر..... یہ کیسے ممکن ہے.....'' جمشید نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم غالباً..... دوسرے مذاہب اور ان کے دیوتاؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے..... کوئی بھی یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے بے شمار لوگوں کی زبانی یہ ضرور سنا ہے کہ سانپ جب 100 سال کا ہو جائے تو وہ کسی بھی صورت میں آ سکتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ آفاقی ایک سانپ ہو لیکن مجھے کیا۔'' جمشید نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

''میں یہی چاہتی ہوں کہ تم ان معاملات میں نہ پڑنا۔'' اس بار والدہ صاحبہ نے دخل اندازی کی۔

''آپ بے فکر رہیں۔'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دراصل جمشید کے اندر فطری تجسس پیدا ہو چکا تھا وہ اس معاملے میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماں باپ کو دکھانے کے لئے بے نیازی ظاہر کی تھی۔ جمشید فیصلہ کر چکا تھا کہ آفاقی کی تہہ تک ضرور پہنچے گا۔

☆.....☆.....☆

دن بھر جمشید اپنے تمام واقف کاروں سے ملتا رہا لیکن کسی بھی واقف کار نے آفاقی کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی، جمشید کو نہایت تعجب ہوا اس بات پر لیکن اس کا تعجب اس وقت دور ہوا جب اس کے پرانے دوست ڈاکٹر کلیم گجر نے اسے بہت سی حیرت انگیز باتیں بتائیں۔

''دیکھو جمشید میں عمر میں تم سے بڑا ہوں..... اس لئے تم سے کہوں گا کہ ان معاملات میں مت پڑو۔'' گجر نے کہا۔

''دیکھ ڈاکٹر بے شک تو بڑا ہے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے مت روک۔'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر..... میرا فرض ہے کہ تجھے خطرات سے روکوں۔'' گجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں روک لینا..... مگر تو وہی ڈاکٹر ہے نا جس نے آفاقی کا علاج کیا تھا۔'' جمشید نے کہا۔

اتنا سننا تھا کہ ڈاکٹر کلیم گجر کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا۔

''ہاں..... وہ مردود واقعی شیطان ہے چار گولیاں نکالیں میں نے اس کے جسم سے..... لیکن وہ بچ گیا..... اور ایک گھنٹے کے اندر بستر چھوڑ کر کھڑا بھی ہو گیا..... دوسرے دن میں، میں اسے چیک اپ کے لئے اس کے بنگلے پر گیا تو میں نے انتہائی عجیب منظر دیکھا۔''

اتنا کہنے کے بعد ڈاکٹر خاموش ہو گیا لیکن جمشید نے دیکھا کہ وہ تذبذب کی کیفیت کا شکار ہے۔

اس طرح تذبذب کی کیفیت کا شکار دیکھ کر

جمشید کا تجسس بڑھ گیا۔

''ابے بول تو چپ کیوں ہو گیا۔'' جمشید نے بے چینی سے کہا۔

''اور پھر ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا اسے سن کر جمشید کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس کا کہنا تھا کہ ''آفاقی کے احاطے میں ایک سیاہ رنگ کے کالے سانپ اور ایک کالے بلے کے درمیان ہولناک جنگل دیکھی تھی، محلے کے دوسرے لوگ بھی قرب و جوار کی عمارتوں سے اس جنگ کا تماشہ دیکھ رہے تھے پھر لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اچانک سانپ اور بلا یکدم نگاہوں سے غائب ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد تو لوگوں کا یقین اور مزید پختہ ہو گیا کہ آفاقی ضرور شیطان ہے بلکہ کوئی شخصیت وہاں ایسی بھی ہے جس نے بلے کا روپ دھار کر سانپ سے ٹکرانے کی کوشش کی تھی۔

اس واقعہ کے اگلے روز کسی نامعلوم شخص کی مخبری پر آفاقی پکڑا گیا، آفاقی کو ثبوت نہ ہونے کے سبب ضمانت مل گئی مگر اس انسپکٹر کو جس نے آفاقی کو گرفتار کیا تھا خودکشی کرنا پڑی وجہ نہ معلوم، جس وقت آفاقی کو لے جایا جا رہا تھا اس وقت اس کے ہونٹوں پر نہایت معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اس واقعہ کے بعد آفاقی سے لوگوں نے ڈرنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر کلیم نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ کافی تھیں، جمشید کا لہو گرمانے کے لئے۔

''کیا آفاقی نے کبھی کسی کا خون کیا ہے؟'' جمشید نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا۔'' ڈاکٹر چونکتے ہوئے بولا۔

''ہو سکتا ہے آفاقی کا کوئی خاص مقصد رہا ہو۔ اس محلے میں قیام کا۔'' جمشید نے مسکرا کر کہا۔

''یہ تو نہیں معلوم مگر اتنا ضرور ہے کہ اس کی نحوست کا میں بھی قائل ہوں وہ مردود ضرور کسی شیطانی قوت کا مالک ہے۔''

''ایک بات اور.....'' جمشید نے جلدی سے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں وہ سیاہ بلا بھی کسی شیطانی قوت کا مالک ہے۔ یا وہ اس کسی کا روپ بدل کر بلے کا روپ دھار رکھا ہے۔''

''اس کے علاوہ تو میرے خیال سے اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا۔'' ڈاکٹر کلیم دبے دبے لہجے میں بولا۔

''کیا آج تک کوئی شخص آفاقی سے ملنے اس کے بنگلے میں گیا۔

''مجھے اس سلسلے میں زیادہ معلوم نہیں۔ مگر ایک لڑکی ہے۔ جو کہ اکثر اس کے بنگلے میں آتی جاتی دیکھی گئی ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' جمشید کی دلچسپی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''مگر تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں دکھا رہے ہو۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

''بس یونہی.....'' جمشید نے پہلو بدل کر کہا۔

''خیر میرا تمہیں مشورہ ہے کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا دانشمندی نہیں۔'' ڈاکٹر نے ناصحانہ لہجے میں بولا۔

''تم اس لڑکی کا نام بتا رہے تھے۔'' جمشید نے اس کی بات سرے سے نظر انداز کر کے پوچھا۔

''اس کا نام دانیہ ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ مظلوم ہے..... لیکن وہ بہت حسین اور خوب صورت لڑکی ہے، اسے ایک بار دیکھ لو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''وہ رہتی کہاں ہے؟'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں.....؟''

''تو تو جانتا ہے کہ لڑکیوں کے معاملے میں ویسے ہی خشک ہوں۔ یہ دل پتھر ہے۔'' ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

''مگر اتنا سن لے، تو جب اسے دیکھے گا تو تیرا دل بھی پانی ہو جائے گا۔''

''بالکل نہیں۔'' جمشید نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

www.paksociety.com

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد جمشید وہاں سے اٹھ گیا۔

انسپکٹر جمشید کا ڈاکٹر کلیم سے ملنے کے بعد تجسس اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اسے رات بھر نیند نہ آئی ان پراسرار واقعات کے بارے میں سوچتا رہا جو کہ اب تک اس کے علم میں آچکے تھے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے یقین تھا کہ موت کا جو وقت مقرر ہے موت اسی وقت پر آئے گی نہ اس سے پہلے نہ بعد لیکن اس نے دل میں پکا ارادہ کرلیا تھا کہ آفاقی کا راز جانے گا کہ وہ کون ہے؟ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی تفتیش کا آغاز دانیہ سے کرنا چاہئے۔

☆.....☆.....☆

جمشید نے دانیہ کو دیکھا تو واقعی وہ ڈاکٹر کلیم کے بیان سے بڑھ کر تھی، وہ انتہائی حسین و دلکش ثابت ہوئی اس کے تراشیدہ اور نرم و ملائم چمکدار بال دل موہ لینے کے لئے کافی تھے بونا سا قد قیامت خیز جسم واقعی جنس مخالف کے لئے بے حد جاذب تھے اس کے بھرے بھرے ہونٹ کافی دلکش اور جاذب نظر تھے جمشید کو دانیہ کے چہرے پر غم کی پرچھائیں نظر آئی اور خوبصورت آنکھیں جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ مدد کی طالب ہے۔

جمشید نے اپنا تعارف ایک انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے کرایا تو وہ ایک لمحہ کے لئے غور طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی اور کافی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

"زندگی کا بیمہ واقعی اہم چیز ہے..... مگر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ میری موت کے بعد اسے وصول کون کرے گا۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

"کیا مطلب..... آپ کے والدین وغیرہ۔"

"معلوم نہیں زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔" اس نے غم آلود لہجے میں کہا۔

"اوہ..... میں سمجھا نہیں۔" جمشید نے چونک کر پوچھا۔

"نہ ہی سمجھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ ویسے بھی آج کا دور کسی دوسرے کے معاملے میں دخل اندازی کا نہیں۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

"معافی چاہتا ہوں مس دانیہ..... مگر پلیز! برا نہ مانیں۔" جمشید لجاحت سے بولا۔

"اوکے..... آپ اب جاسکتے ہیں۔" دانیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"ایک منٹ دانیہ..... میں ایک نجی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہتا ہوں، اگر اجازت ہو تو؟"

"ضرور....." اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پھیل گئے۔

"کیا آپ آفاقی کو جانتی ہیں؟"

اتنا سننا تھا کہ دانیہ کے چہرے پر دہشت اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔

"کک..... کون ہو تم....." اس کی آواز میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔

"تم انشورنس ایجنٹ نہیں ہو سکتے۔"

"آپ کا خیال درست ہے....." جمشید نے نہایت صاف گوئی سے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

دانیہ اسے یوں گھور رہی تھی جیسے وہ کوئی دیوانہ ہو اس کے چہرے کے تاثرات نہایت تیزی سے بدل رہے تھے۔

جمشید سمجھ رہا تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہے۔

"دیکھو مسٹر..... یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ ورنہ میں پولیس کو فون کروں گی۔" دانیہ سخت لہجے میں بولی۔

"بہت خوب..... ضرور..... میں خود پولیس آفیسر ہوں۔" جمشید طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تت تم چاہتے کیا ہو....." دانیہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔

"کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ آپ مجھے اپنا راز دار بنالیں تاکہ شیطانی قوتیں ہمیشہ کے لئے آپ کا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"ناممکن ہے....." وہ مردہ لہجے میں بولی۔ "وہ

دونوں کسی شیطان سے بھی زیادہ طاقتور اور خطرناک ہیں، انسان سب سے لڑ سکتا ہے لیکن آسیبی قوتوں سے نہیں۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"رحمان شیطان سے زیادہ طاقتور ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم ضرور آزاد ہو جاؤ گی..... اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"آپ نے وہ دونوں کا لفظ استعمال کیا، آفاقی کے علاوہ اور کوئی بھی ہے۔"

"ہاں..... لیکن میں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی ہو سکتا ہے ان دونوں میں سے کوئی ہماری گفتگو سن رہا ہو۔"

"میں ان باتوں کا قائل نہیں ہوں لیکن میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں....." جمشید مسکرا کر بولا۔

"میں کیا بتاؤں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"آفاقی کو کیسے جانتی ہیں؟"

"میں وہ بدنصیب لڑکی ہوں جو نہیں جانتی تھی کہ میری کمر پر چاند گرہن کا نشان جو کہ قدرتی ہے میرے لئے نحوست بن جائے گا مجھ جیسی لڑکی ہزاروں میں ایک ہوتی ہے جن کا ہونا شیطانی قوتوں کے لئے کسی عید سے کم نہیں۔ آفاقی نے مجھے محبت کے جال میں پھنسایا اور قید کرلیا..... جس دن بھی اس کی تپسیا پوری ہوگئی وہ مجھے مار دے گا۔" اتنا کہہ کر دانیہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

دانیہ کے نکلتے آنسو دیکھ کر جمشید بہت متاثر ہوا۔

"کیا وہ کوئی بلا ہے۔؟" جمشید نے پوچھا۔

"ہاں....." دانیہ سرد لہجے میں بولی۔

"مگر وہ چاہتا کیا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"آج سے ٹھیک 3 دن بعد پورن ماشی کی رات ہے اس روز آدھی رات کے بعد میں آفاقی کے پاس جاؤں گی پھر تم خود ہی دیکھ لینا..... وہ کیا چاہتا ہے۔" دانیہ گویا ہوئی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ آپ وہاں جائیں؟" جمشید دبی زبان میں بولا۔

"ہاں..... میں اس کے لئے مجبور ہوں ورنہ۔" اچانک ڈرائنگ روم کے دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی جمشید چونکہ پشت کئے بیٹھا تھا اس لئے کچھ نہ دیکھ سکا لیکن دانیہ چونکی تھی پھر یکدم اس کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہوگئی اس افتاد سے پریشان ہو کر جمشید تیزی سے اٹھا پھر کچھ سوچ کر دروازے کی طرف لپکا مگر باہر سے دروازہ بند تھا ساتھ ہی دروازے کی دوسری سمت سے کسی بلے کی تیز غراہٹ ابھری تو جمشید چونک گیا آواز اتنی خوف ناک تھی کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

دوسرے ہی لمحے جمشید اس کھڑکی کے قریب آگیا جو کہ راہداری میں کھلتی تھی کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر جب اس نے راہداری کے دروازے کی سمت دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سیاہ رنگ کا ایک بلا جو کہ جسامت میں کسی شکاری کتے سے کم نہ تھا ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑا بڑی خون خوار آواز میں غرا رہا تھا۔

جمشید کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے ایک ٹانیہ کے لئے سوچا پھر بڑی پھرتی سے گن نکال کر بلے کا نشانہ لیا لیکن نہ جانے کیسے اسے جمشید کے ارادے کی خبر ہوگئی اور وہ یکدم غائب ہوگیا۔

جمشید کی زندگی کا یہ حیرت انگیز واقعہ تھا..... دہشت کے مارے جمشید کانپ اٹھا پھر اسے دانیہ کا خیال آیا۔ دانیہ بے ہوش پڑی تھی اس نے جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا اور وہاں سے نکل گیا۔

ساری رات جمشید سو نہ سکا کبھی خواب میں اس کو وہ سیاہ بلا نظر آتا کبھی اسے وہ کالا سانپ، اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آفاقی کا سانپ اور بلے کے بیچ میں کیا تعلق ہے۔

کروٹیں بدلتے سوچتے رات گزر گئی، سوچتے سوچتے جمشید اس نتیجے پر پہنچا کہ چاہے کچھ بھی ہو آفاقی دانیہ اور بلے کا تعلق ضرور معلوم کرنا ہے؟ چاہے اسے اپنی جان سے کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں۔

☆.....☆.....☆

جس روز پورن ماشی کی رات تھی اس روز خلاف

www.paksociety.com

معمول جمشید کی آنکھ جلد ہی کھل گئی اس نے نماز فجر کی ادائیگی کی، سجدے میں گر کر دیر تک اپنی کامیابی کی دعا مانگی، دعا کے بعد جمشید کے دل کو قدرے سکون ملا اسے یقین ہوگیا کہ آج ہر حال میں اسے کامیابی ضرور ملے گی۔ بس اسے تھوڑی ہمت پکڑنی ہوگی اور پھر دن گزر گیا، رات سر پر آ گئی۔ جمشید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا الماری سے سوٹ نکال کر پہنا سروس ریوالور نکال کر اس کو لوڈ کیا اور کچھ فاضل راؤنڈ واچ پاکٹ میں رکھ کر کمرے سے باہر آ گیا، باہر راہداری میں ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ راہداری عبور کرتا لان تک آ گیا دوسرے لمحے وہ کھلی سڑک تک آ گیا۔

آفاقی کی رہائش گاہ تھوڑی ہی دور تھی جمشید جلد ہی وہاں پہنچ گیا..... وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مکان کی پشت پر آ گیا، جہاں ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی چند ثانیہ تک وہ دیوار کی حد بندی کے ساتھ کھڑا سوچتا رہا اسے کیا کرنا چاہئے چند لمحے تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے دیوار پھلانگی اور احاطے میں داخل ہوگیا کسی فوری خطرے کے پیش نظر اس نے پستول مضبوطی سے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑلی اور آگے بڑھنے سے پہلے تین بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا اور آگے بڑھ گیا، وہ ایک ایک قدم ناپ تول کر اٹھا رہا تھا، اس کی عقابی نظریں اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف تھی.....

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

دفعتاً اس کے بڑھتے قدم رک گئے ایک عجیب سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا..... جمشید نے اسے اپنا وہم جان کر آگے بڑھنا چاہا اس بار وہی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی آواز نہایت واضح اور صاف تھی جیسے کوئی اس کے کانوں کے پاس گہرے گہرے سانس لے رہا ہو۔

جمشید سمجھ گیا کہ آفاقی کی پراسرار قوتیں اس کا راستہ روکنے کے لئے تیار ہو رہی ہیں۔ جمشید نے آیت الکرسی کی تلاوت شروع کر دی۔ جیسے آیت الکرسی ختم ہوئی جمشید نے اپنے دل میں ایک تقویت سی محسوس کی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا راہداری میں آ گیا، راہداری میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا کام اس نے اس کے زیرو پاور کے بلب کو نکال کر الگ کر دیا۔

بلب کو نکالتے ہی بیرونی راہداری میں اندھیرا چھا گیا۔ اب اس کو اس بات کا بالکل خدشہ نہ تھا کہ کوئی شخص اسے دیکھ سکے گا۔

دفعتاً اسے وہی آواز پھر سنائی دی جو کہ کچھ دیر پہلے سنائی دی تھی۔

وہ چونک گیا جیسے کوئی شخص گہرے گہرے سانس لے رہا ہو، خوف کی ایک سرد لہر اس نے اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں دوست....."

ایک صاف اور واضح آواز جمشید کو سنائی دی۔

"کک..... کون ہو تم؟"

یہ جاننے کی تمہیں ضرورت نہیں..... بس اتنا جان لو کہ اگر میں کوئی بری قوت ہوتا تو آیت الکرسی کی نورانیت مجھے بھسم کر دیتی، میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔"

"تم کیوں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ جاننا بھی تمہارے لئے ضروری نہیں بس اتنا جان لو کہ اس وقت بھی میری مدد کے بغیر آفاقی کو نہیں ہرا سکتے، اب اندر جاؤ کھڑکی سے دیکھو کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔"

جمشید نے جواب دینے کے بجائے سر ہلایا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا آفاقی کی خواب گاہ کی کھڑکی کے نزدیک پہنچ گیا اس کا اندازہ تھا کہ کھڑکی بند ہوگی مگر وہ صرف بند تھی بولٹ نہیں تھی۔

جمشید آہستہ آہستہ اس پردے کو کھسکانے لگا جو کہ کھڑکی پر موجود تھا، جیسے ہی پردے کے درمیان خلا پیدا ہوا اندر کا منظر دیکھ کر جمشید کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں خوف کی لہر جیسے اس کے پورے جسم میں سرایت کر گئی خوف و دہشت سے قریب تھا کہ اس کی چیخ نکل جاتی اس نے پوری قوت سے اپنا الٹا ہاتھ اپنے منہ پر جما لیا..... وہ منظر تھا ہی اتنا دہشت ناک کہ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا سارا خون جسم میں

منجمد ہو جائے گا۔

اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ نہایت خوف ناک اور دہشت زدہ کرنے والا منظر تھا۔

دانیہ ایک شاندار مسہری پر نیم برہنہ حالت میں تھی اور ایک سیاہ رنگ کا موٹا تازہ سانپ اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ دانیہ کے چہرے پر کرب اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

جمشید یہ سب دیکھ کر سن ہو کر رہ گیا وہ اس وقت چونکا جب سیاہ ناگ پھن اٹھا کر جھومنے لگا۔

دانیہ بدستور بے حس و حرکت پڑی تھی دفعتاً جمشید کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ کیوں ناں اپنے پستول کی ساری گولیاں اس سانپ پر چلا دوں جمشید سوچ رہا تھا کہ سیاہ ناگ تیزی سے رینگتا ہوا مسہری سے اتر کر نیچے آیا، مسہری سے اترتے ہی زمین پر قلابازیاں کھانے لگا، دوسرے لمحے وہاں ایک نیم برہنہ انسان کھڑا تھا جو کہ نہایت ہی وجیہہ اور خوب صورت تھا، وہ انتہائی حقارت سے دانیہ کو دیکھ رہا تھا۔

"جان من آج اپنے آفاقی کو دیکھ لو آخری دفعہ..... آج تمہاری وجہ سے میری تپسیا پوری ہوگی اور میں دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور بن جاؤں گا..... آج تمہیں ذبح کر کے تمہارے خون سے اشنان کرنے کے بعد ساری کالی قوتیں میری ہوں گی۔"

"مم..... مجھے معاف کر دو..... آفاقی۔" دانیہ سسکتے ہوئے بولی۔

"ہاہا..... معافی کا وقت گزر گیا، دو سال سے میں نے تم کو اس لئے سنبھالا کہ معافی دے دوں۔"

دانیہ کی آنکھوں میں بے بسی مجبوری اور کرب کی جھلک تھی۔

جمشید نے دانیہ کو دیکھ کر اپنا ریوالور نکالا اور آفاقی کی طرف فائر ہی کرنا چاہا تھا کہ..... وہی آواز اسے سنائی دی۔

"رک جاؤ..... ورنہ سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔"

"مگر..... وہ مردود۔" جمشید بولا۔

"کہا نا رک جاؤ..... ویسے بھی یہ مردود گولیوں سے نہیں مرے گا۔"

جمشید اپنے ہونٹ چباتا ہوا آگے کے مناظر دیکھنے لگا۔

آفاقی نہایت تضحیک بھری نظروں سے دانیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر بولا۔ "جان من..... بس تھوڑی دیر اور اس کے بعد..... تم زندگی کی قید سے آزاد ہو جاؤ گی، اور میں طاقتور۔" آفاقی بولا۔

دانیہ نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھوں سے ابھرنے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ سخت قسم کی ذہنی اذیت اور خوف میں مبتلا تھے۔

دفعتاً دانیہ کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اس کی دہشت و خوف سے پھٹی ہوئی نظریں آفاقی کے عقب پر جمی تھیں، نظروں کی یہ کیفیت آفاقی سے چھپی نہ رہ سکی۔

جمشید نے آفاقی کی نظروں کا تعاقب کیا تو اس کی آنکھیں دہشت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جمشید کی نگاہوں کے سامنے وہی خون خوار سیاہ بلا موجود تھا۔

جسے تین روز قبل وہ دانیہ کے یہاں دیکھ چکا تھا، اس کی خونی اور بڑی بڑی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں، حلق سے ہلکی ہلکی غراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں، اس کی خوف ناک آنکھیں دانیہ پر جمی ہوئی تھیں جو کہ بید مجنوں کی مانند کانپ رہی تھی۔

آفاقی کی بھی کیفیت کچھ ایسی تھی بس وہ یک ٹک بلے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

دفعتاً آفاقی کے لب ہلے۔

"موہن لال..... آج تیرے اور میرے درمیان آخری فیصلہ ہو ہی جانا چاہئے جو بچا، اس لڑکی کی بلی دے گا۔"

دوسرے ہی لمحے آفاقی نے سانپ کی صورت اختیار کر لی۔

"جیسے یہ دونوں لڑنا شروع کریں تم یہ ڈوری ان

www.Paksociety.com

کے گلے میں ڈال دینا..... ڈوری تمہاری جیب میں موجود ہے۔'' وہی آواز جمشید کے کانوں سے ٹکرائی۔

''مگر کیسے؟'' جمشید نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم اندر چلے جاؤ..... جب یہ دونوں لڑتے لڑتے یکجا ہو جائیں تب۔''

جمشید آہستہ سے اندر داخل ہو گیا، رینگتا ہوا بائیں جانب والے صوفے کے پیچھے پہنچ گیا۔

سیاہ بلا اور سانپ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے میں اتنا مگن تھے کہ انہیں کمرے میں جمشید کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوا۔

سانپ اور بلا یک ٹک ایک دوسرے کو گھورتے جا رہے تھے، ان کی دہشت ناک آوازوں نے عجیب خوف ناک دل ہلاتا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

سیاہ ناگ فضا میں دھڑا اٹھائے کسی مدمست شرابی کی طرح لہراتا ہوا۔ سیاہ بلے کے قریب ہوتا جا رہا تھا، جیسے ہی اس نے اپنے حریف پر حملہ کیا تو بلا یکدم اچھل کر پیچھے ہٹ گیا، ساتھ ہی اس کے حلق سے نکلنے والی خوف ناک غراہٹیں اور مزید بڑھ گئیں، سانپ کا پھن اپنی جھونک میں پتھریلے فرش سے ٹکرایا تو وہ اور غضب ناک ہو گیا، دوسری بار اس نے اپنا پھن مارا تو بلا پھر اچھل کر ہٹ گیا.....

جس لڑکی کے لئے ان شیطانی قوتوں میں جنگ جاری تھی وہ لڑکی ایک طرف بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی جبکہ جمشید صوفے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

سیاہ بلا سانپ کی طرف نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر اس نے اچھل کر سانپ پر حملہ کر دیا، سانپ اور بلا ایک دوسرے سے بری طرح الجھ گئے تھے۔

''یہی وقت ہے جمشید..... اگر وہ الگ ہو گئے تو پھر انہیں مار نہیں پاؤ گے۔'' وہی آواز جمشید کے کانوں سے پھر ٹکرائی تو جمشید نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈوری نکال لی۔

وہ ڈوری زیادہ بڑی نہ تھی اس کا قطر گلے میں ڈالنے والے ہار سے ذرا کم تھا لیکن وہ اس طرح چمک رہی تھی جیسے اندھیرے میں ریڈیم ڈائل والی سوئیاں چمکتی ہیں۔

جمشید تیزی سے صوفے سے باہر نکلا اور بڑی سرعت سے وہ ڈوری لڑتے ہوئے سانپ اور بلا کی جانب اچھال دی۔

ڈوری ان دونوں پر گرتے ہی ان سے لپٹ گئی اور نہایت ہی تیزی سے اس کا قطر بڑا ہونا شروع ہو گیا۔

ڈوری کے گرتے ہی بلے اور ناگ کے حلق سے عجیب و غریب دہشت ناک آوازیں نکلنا شروع ہو گئیں، آوازیں بہت ہی بھیانک اور خوف ناک تھیں۔

ڈوری نے بڑی تیزی سے ان کے جسموں کو جکڑنا شروع کر دیا۔ جب ڈوری اچھی طرح سے انہیں جکڑ چکی تو فوراً اس میں آگ لگ گئی۔

فضاء میں غیر انسانی چیخیں منتشر ہونا شروع ہو گئیں۔ جمشید کو یہ تو یاد نہیں کہ دانیہ کو لے کر وہاں کیسے نکلا بس اتنا ضرور یاد تھا کہ آگ کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا، بنگلے سے باہر نکلتے ہی وہ دونوں بے ہوش ہو چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

ان دونوں کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک اسپتال میں پایا۔

لوگوں کی زبانی صرف اتنا پتہ چلا کہ آفاقی کے بنگلے کو آگ لگ چکی تھی، آگ اتنی شدید تھی کہ ہر چیز جل کر خاکستر ہو گئی۔

دانیہ اب دانیہ جمشید بن چکی ہے، اب وہ ان تمام یادوں کو بھلا دینا چاہتی ہے لیکن جب کبھی اسے کوئی سیاہ بلا نظر آتا ہے تو اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کے جسم میں لرزش ہونے لگتی ہے اور وہ سہم جاتی ہے۔

جمشید کو وہ غیبی آواز پھر کبھی سنائی نہیں دی لیکن جمشید اب بھی اس ٹوہ میں ہے کہ وہ آواز کس کی تھی؟

آسیبی چکر

محمد ذاکر۔ ہلاں آزاد کشمیر

کمرے میں موجود کئی افراد خوش ذائقہ کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا، کھانا کھانے کے بعد نوجوان اپنے کمرے میں آیا اور اس کی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ اچانک.....

کیا نادیدہ قوتیں بھی دل میں نرم گوشہ رکھتی ہیں..... حیرت سے دوچار دل فریفتہ کہانی

میرا بچپن اپنے گاؤں ہلاں ہی میں گزرا ہے۔ اس دور میں شہر کا تصور کبھی انسان کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ دیہات تھا سڑک کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ضروریات زندگی کی ہر شے ناپید تھی۔ لوگ کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے بزرگوں سے گاڑیوں ٹرکوں اور بسوں کا نام سن سن کر حیران ہوتے تھے۔ شہر کی باتیں سن سن کر ہم حیران اور ہکا بکا رہ جاتے تھے۔

جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو کتابوں میں شہروں کے قصے کہانیاں پڑھتے تھے۔ کبھی ہم اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر دور تک دیکھتے تھے اور ایک سرد آہ بھر کر کہتے تھے۔ ''آہ کبھی ہم بھی اس جگہ سے گزر کر شہر جائیں گے۔'' میٹرک ہم نے اپنے ہی گاؤں کے اسکول سے پاس کیا، اب آگے پڑھنے کا مسئلہ تھا۔ تو وسائل محدود ہونے کی وجہ سے آگے نہ پڑھ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.URDUBOOKS.NET

سکا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم شہر میں آ گئے اور پھر شہر ہی کے ہو کر رہ گئے اور آج اپنے گاؤں کے لئے ترس رہے ہیں۔

کافی عرصہ سے اپنے گاؤں جانے کی ہمارے دل میں خواہش مچل رہی تھی۔ اللہ اللہ کر کے ایک دن گاؤں جانے کا ارادہ کر ہی لیا اور پھر آہستہ آہستہ دل پر پتھر باندھ کر گاؤں جانے کی تیاری کر ہی لی۔ سیاحت بچپن ہی سے میرا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ اپنے وطن کے گاؤں شہر پہاڑ جنگل ہر صحرا دیکھنے کی آرزو ہر وقت دل میں مچلتی رہتی تھی۔ آج شادی کو بھی اٹھارہ برس گزر چکے ہیں۔ پھر بھی یہ عادت بدلی نہیں سفر ہمیشہ میں تنہا ہی کرتا ہوں اس معاملے میں کسی اچھے سے اچھے دوست کا ساتھ بھی پسند نہیں بس بیگ میں ضروری سامان ڈالا۔ اور تین چار دن کی چھٹی لے کر انجانے سفر پر چل پڑا۔ اس روز بھی میں آفس جاتے ہوئے بیوی کو بتا گیا تھا کہ تمہاری اٹھارہ سال پرانی صورت اور ایک ہی طرح کا معمول دیکھ کر میں اکتا گیا ہوں۔ اب مجھے چار جنگ کی ضرورت ہے اور یہ چار جنگ صرف سفر ہی کی صورت میں ممکن ہے گھر آ کر میں نے بیگ کو ٹٹولا جو چیزیں رکھی تھیں ان کی فہرست گنوائی پھر چائے بنوائی اور کشمیر کی وادیوں میں گم ہو گیا، اس بار میں آزاد کشمیر اپنے گاؤں بلاں میں ایک ہفتہ گزارنا چاہتا تھا۔ ارادہ تھا کہ شام ہونے سے پہلے ہی نکل جاؤں۔

مگر چھوٹی بیٹی اس سلسلے میں پاؤں کی زنجیر بن جاتی تھی۔ اس لئے میں رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ بیگ چھپا دیا تھا۔ اور اب اس انتظار میں تھا کہ وہ سو جائے تو میں چپکے سے نکل جاؤں، میں نے ایسا ہی کیا۔ لاری اڈے پر کافی رش تھا۔ راولپنڈی کا ٹکٹ لیا اور ٹکٹ پر درج سیٹ نمبر کے مطابق اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ جون کا مہینہ تھا موسم میں کافی حدت آ چکی تھی۔ اے سی ابھی آن نہیں ہوا تھا اور گاڑی روانہ ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ایک اخبار فروش اندر داخل ہوا میں نے اس سے ایک اخبار لے لیا اور پیسے ادا کر کے اخبار کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کو تہہ کر کے رکھ دیا۔ ''بھائی صاحب ذرا اخبار دکھائیں۔'' پیچھے سے ایک آواز آئی، میں نے ناگواری سے پیچھے دیکھے بنا اخبار اٹھا کر اس کو دے دیا اتنے میں ایک دوا بیچنے والا اندر داخل ہوا، وہ دوا کی کرامات بیان کرنے لگا اس چلتے پھرتے حکیم کے دعوے کے مطابق اس دوا کی پڑیا میں پیٹ درد سے لے کر گردے پھیپھڑے اور معدے کا اکسیر علاج موجود تھا۔ نیز اس کے مسلسل استعمال سے بال بھی کالے ہو جاتے تھے۔ کمپنی کی مشہوری کے لئے اس پڑیا کی قیمت بیس روپے تھی۔

ڈرائیور شان بے نیازی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور سامنے لگے ہوئے آئینے کو سیٹ کرنے لگا جب اس آئینے میں اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ایک عورت فٹ ہو گئی تو اس نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی اور گاڑی کو اپنی جگہ سے کھسکا کر روڈ پر لے آیا میں اس خاتون کی پچھلی سیٹ پر براجمان تھا، مجھے اس آئینے میں آدھا چہرہ ڈرائیور کا نظر آ رہا تھا اور پورا چہرہ خاتون کا نظر آ رہا تھا۔ جو چہرے سے نقاب ہٹا کر اپنے سرخ ہونٹوں کی نمائش کر رہی تھی۔ خاصی پرکشش خاتون تھی۔ میں نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی اور کھسک کر شیشے والی سائیڈ پر جا بیٹھا۔ اب مجھے اس آئینے میں صرف ڈرائیور کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

خاتون نظر نہیں آ رہی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ رفتار پکڑتی جا رہی تھی۔ تین گھنٹے کے سفر کے بعد ایک ہوٹل پر ڈرائیور نے بریک لگایا۔ تمام مسافر نیچے اتر گئے میں نے بھی چائے کا ایک کپ لیا اور حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ اس وقت مجھے چائے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور چائے بھی میرے ذوق کے مطابق تھی۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔ اور پھر مسافر باری باری سوار ہونے لگے۔ میں بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

شام کے سات بجے ہم راولپنڈی پہنچ گئے، معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ راولاکوٹ کی آخری گاڑی ایک

گھنٹہ پہلے نکل گئی تھی۔ اب مجھے رات راولپنڈی میں بسر کرنا تھی۔ مجھے ایک انتہائی مخلص دوست کا خیال آیا جو پنڈی میں ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ لیا ہوا تھا کہ میں جب بھی پنڈی آؤں گا تو قیام اس کے فلیٹ پر کروں گا۔ میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا تو اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''اڈے پر کھڑا ہوں۔''

''کہاں ہو تم؟'' میں نے سلام کے بعد سوال کیا۔

''تم وہیں ٹھہرو میں ابھی آیا۔'' پھر اس نے مجھ سے لوکیشن معلوم کی اور فون بند کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ میرے سامنے تھا۔ تپاک سے ملا اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی۔ جو پردیس میں کسی آشنا کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ مجھے ایک اوسط درجے کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ ''کیا کھاؤ گے؟'' اس نے سوال کیا۔

''یار دال یا سبزی ٹھیک رہے گی۔''

''گوشت کیوں نہیں؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''یار ہوٹل کے پکے ہوئے گوشت پر میں اعتبار نہیں کرتا کیا پتہ کسی گدھے کا ہو، کتے کا بھی ہو سکتا ہے اور میں نے یہاں تک سنا ہے کہ مری ہوئی مرغیاں بھی ان ہوٹلوں میں سپلائی ہوتی ہیں۔''

''اب تمام ہوٹل تو یہ کام نہیں کرتے نا۔ مگر کچھ ہوٹل والے تو کرتے ہیں نا۔'' میری اس لمبی گفتگو کو نظر انداز کر کے اس نے مغز فرائی کا آرڈر دے دیا پھر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں ہوٹل کے مالک کو جانتا ہوں۔''

''تم بے فکر ہو کر کھاؤ۔''

یہ بتا کر وہ میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ ویٹر کھانا لگا کر چلا گیا جب ہم رات گئے سہیل کے فلیٹ پر آئے تو کافی طمانیت کا احساس ہوا اس نے میرا بیگ مجھ سے لیا اور مجھے لاؤنج میں بٹھا کر چائے بنانے کے لئے کچن میں چل دیا، ٹی وی پر مختصر چینل بدلنے کے بعد میں نے ایک اسپورٹس چینل پر چند لمحوں تک خواتین کی ریسلنگ دیکھی پھر ٹی وی آف کر دیا۔ سہیل کی بنائی ہوئی چائے زیادہ اچھی تو نہیں تھی مگر اے سی والے کمرے کی ٹھنڈک میں کافی فرحت بخش محسوس ہوئی۔ چائے کے دوران میں اور سہیل ماضی کے اوراق کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ سہیل بھی میرے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ہم، ہم عمر ہی تھے اور کلاس فیلو بھی وہ بھی کافی عرصے سے راولپنڈی میں مقیم تھا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ اور وہ باروزگار تھا۔ پنڈی میں ہی رہ رہا تھا۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو ہمیں نیند نے آلیا دس بجے میری آنکھ کھلی تو سہیل اپنے آفس جا چکا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ایک کاغذ میرے سرہانے رکھ گیا تھا کہ کچن میں ناشتے کا سامان موجود ہے۔

''بہتر ہوگا کہ ہم دن کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے اور اگر تم ناشتے کے بعد جانا چاہو تو تالا لگا کر جانا۔ جو فریج کے اوپر رکھا ہوا ہے۔''

میں اس کو گزشتہ رات بتا چکا تھا کہ ''ان مصنوعی ترقی یافتہ چیزوں کو دیکھ دیکھ کر اکتا چکا ہوں اب صرف فطرت کے رنگ دیکھنا چاہتا ہوں جو صرف اور صرف اپنے کشمیر میں ہیں۔''

میں جب راولاکوٹ کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں سوار ہوا تو وہ روانہ ہونے والی تھی۔ مجھے سب سے پچھلی سیٹ ملی تھی۔ ہماری گاڑی کچھ دیر تک پنڈی کی سڑکوں پر دوڑتی رہی، کہوٹہ آیا تو پہاڑی سلسلے کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے جب گاڑی راولاکوٹ کی حدود میں داخل ہوئی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ میرے آس پاس صرف سرسبز پہاڑ تھے اور ایک پرسکون خاموشی تھی تا حد نگاہ دور تک پھیلے ہوئے آنکھوں کو بھلے لگتے وسیع جنگل تھے۔

میں اپنے پروگرام کے مطابق گاؤں جانے سے پہلے راولاکوٹ سے پانچ کلومیٹر پہلے ہی اتر گیا۔ مجھ اکیلے مسافر کو اتارنے کے بعد گاڑی روانہ ہوئی تو ایک پرسکون وادی میرے سامنے تھی، کچھ فاصلے پر پہاڑ کے

تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔

دامن میں مختلف میں کسی گیسٹ ہاؤس کی آس پر ایک طرف چلا گیا کہ رات آرام کروں اور پھر صبح ہوتے ہی میں بنجوسہ کے لئے روانہ ہو جاؤں گا جو راولا کوٹ کا بہت ہی خوب صورت اور صحت افزا مقام ہے دور دور سے سیاح لوگ وہاں پر آتے ہیں۔

میں آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی چرواہا دکھائی دے جاتا یا کوئی پرندہ ایک درخت سے اڑ کر دوسرے درخت پر بیٹھ جاتا۔ چلتے چلتے میں آگے نکل گیا تو کچھ تھکاوٹ کا احساس ہوا، میں نے بیگ ایک طرف رکھا اور پتھر پر بیٹھ گیا۔ اب تک مجھے راستے میں اکا دکا گھر تو نظر آتے تھے مگر کوئی گیسٹ ہاؤس نام کی چیز نظر نہ آئی تھی۔

اچانک درختوں کی اوٹ سے ایک ساٹھ سالہ شخص برآمد ہوا اس کی سفید داڑھی تھی اور سر پر سفید ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ کو اپنی مسکراہٹ سے خوش آمدید کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''چاچا کوئی گیسٹ ہاؤس نہیں ہے یہاں پر؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیوں نہیں ہے۔ یہاں پر گرمیوں میں پنجاب سے کافی لوگ آتے ہیں یہاں کچھ لوگوں نے ایک یا دو کمروں کے گیسٹ ہاؤس بنا رکھے ہیں، تمہارے ساتھ فیملی نہیں ہے کیا۔'' وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے میرے گھر والے آس پاس موجود ہوں نہیں۔

''چاچا میں ایک ہفتے کے لئے یہاں آیا ہوں، بس مجھے ایک کمرہ چاہئے۔'' میری بات سن کر اس نے انگلی سے سامنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ گھر ایک ریٹائرڈ افسر کا ہے اس نے گھر کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس بنا رکھا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ وحید خان ہے نام اس کا، گر کھانا کھانا ہے تو میرے ساتھ چلو۔'' وہ انتہائی سادگی سے بولا۔

''بڑی مہربانی چاچا کیا نام ہے تمہارا؟''

''سکندر علی۔'' وہ مختصراً بولا۔

''بہت مہربانی چاچا۔'' میں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے ہوئے گھر کی طرف چل دیا جو لگ بھگ دو سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ مختلف جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا میں اس گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جو دوسرے گھروں سے کافی ہٹ کر بنایا گیا تھا اور کافی خوب صورت تھا۔ یکبارگی میرے سامنے سے ایک نیولا نکلا اور پتھر کے پیچھے بیٹھے ہوئے سانپ پر جھپٹ پڑا، یہ منظر میرے لئے بہت ایڈونچر لئے ہوئے تھا۔ میں محویت سے یہ لڑائی دیکھنے لگا، میں نے بچپن میں نیولے اور سانپ کی لڑائی کے متعلق سنا تھا۔ آج وہ منظر میرے سامنے تھا۔

نیولا بڑی چابک دستی سے سانپ کے ڈسنے سے خود کو بچا رہا تھا۔ پھر اس نے انتہائی مہارت سے سانپ کی گردن میں اپنے دانت گاڑ دیئے، سانپ بل کھانے لگا مگر وہ بے بس ہو چکا تھا، پھر نیولا اس کو گھسیٹتا ہوا دور لے گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیئے، نیلی چھت والا گھر اب میرے سامنے تھا۔ پہاڑی علاقوں کے دیگر مکانات کی طرح یہ گھر بھی چار دیواری کے بغیر تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دینا چاہی مگر اس سے پہلے ہی ایک سفید ریش نورانی صورت بزرگ نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر فراخدلانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''وحید خان آپ ہی ہیں نا۔'' میں نے مصافحے اور سلام کے بعد سوال کیا۔

''جی میرا ہی نام وحید خان ہے۔''

''مجھے عرفان کہتے ہیں ارادہ ہے کہ ایک ہفتہ اس وادی جنت نظیر میں بسر کروں آپ کا پتا مجھے ایک بزرگ نے دیا ہے غالباً سکندر علی نام ہے ان کا، ان کا کہنا تھا کہ آپ نے ایک گیسٹ ہاؤس بنا رکھا ہے۔'' میری بات سن کر وحید خان نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا، میں بیگ اٹھائے اندر داخل ہو گیا وہ کمرہ خاصا خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا میں یکدم جیسے صوفے پر گر پڑا، صوفہ کافی پرانے ڈیزائن کا تھا۔

وحید خان میرے مقابل بیٹھ گیا اور بولا۔

''آپ جس شہر سے آئے ہیں وہاں کیا کرتے ہیں؟''

''میں ایک فرم میں منیجر ہوں، ہنگاموں ٹریفک کے شور اور مصنوعی زندگی سے اکتا کر ایک ہفتہ فطرت کے قریب رہنے آیا ہوں۔ یوں سمجھے بس کسی موبائل کی طرح چارج ہونے آیا ہوں۔''

وحید خان ایک بھرپور قہقہہ لگا کر بولا۔ ''کافی دلچسپ آدمی لگتے ہو۔''

''بس جی ہم ایک دوسرے کو کم سے کم ہنسنے کا موقع تو دے سکتے ہیں نا، اور اگر کچھ نہیں دے سکتے تو۔''

''ہاں مجھے آپ نے جواب نہیں دیا کہ کیا یہاں کوئی گیسٹ ہاؤس ہے کہ نہیں۔'' دفعتاً پردہ اٹھا اور ایک دراز قامت لڑکی اندر داخل ہوئی اس نے سر پر دوپٹہ رکھا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کے بال کسی ناگن کی طرح بل کھاتے ہوئے کمر سے نیچے جھانک رہ تھے۔ اس کی آنکھیں زیادہ بڑی نہیں تھیں۔ مگر ان میں بلا کی کشش تھی۔ اس نے سلام کیا اور وہیں کھڑی رہی، یوں لگا جیسے وہ وحید خان کو کچھ کہنا چاہتی ہو مگر میری موجودگی میں کہہ نہ پا رہی ہو۔ ''یہ میری پوتی صاحبہ ہے اس کا، باپ کینیڈا میں رہتا ہے ماں بھی کینیڈین ہے۔'' لڑکی نے مجھے نہایت ادب سے سلام کیا، میں نے سر کی جنبش سے زیر لب اس کے سلام کا جواب دیا۔ ''چائے لے آؤ۔'' وحید خان نے قدرے مشفقانہ انداز میں کہا۔

''جی اچھا'' کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد وحید خان میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''گیسٹ ہاؤس کی چھت ٹپکتی ہے اور یہاں کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے لہٰذا آپ یہیں اسی کمرے میں رہیں چھ سات دن کی تو بات ہے کھانا بھی آپ کو مل جائے گا، یہاں پر، آپ خود کو ریلیکس محسوس کریں گے، اچھا یہ بتاؤ کہ ہمارا راولا کوٹ آپ کو کیسا لگا؟''

''بہت خوب صورت بہت شاندار میرا شاید یہاں سے جانے کو دل نہ چاہے اچھا یہ بتایئے رہائش اور کھانے کا کیا حساب کتاب ہو گا؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''حساب کتاب بھی ہو جائے گا۔''

''آپ فی الحال آرام کریں نہالیں اور پھر سو جائیں میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر چلے گئے، کمرے میں سکون تو تھا مگر ایک پراسراریت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے باہر کھلنے والی واحد کھڑکی کے پٹ وا کئے تو سامنے سرسبز پہاڑوں کا دلکش منظر تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے سبحان اللہ نکلا اور پھر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا، صبح اپنے وقت پر میری آنکھ کھل گئی سفر کی ساری تھکن غائب ہو چکی تھی، موسم میں ہلکی ہلکی خنکی تھی، میں نے کمبل ایک طرف سرکایا اور چہل قدمی کے لئے باہر نکل گیا۔

گھر کے سامنے ہی خوب صورت لان تھا۔ جس کے چاروں طرف درخت کچے سیبوں کو تھامے ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ پہاڑوں پر چھائے ہوئے بادل عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ سامنے صاحبہ کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے سرسری نظر سے مجھے دیکھا کشمیری حسن اس کے چہرے سے پھوٹ رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزر گیا۔

وہاں رہتے ہوئے مجھے کوئی تکلیف نہ تھی۔ آج دوسرا روز تھا اور شام کا وقت، میں آج بازار سے کافی سامان لایا تھا تاکہ ان کو میری ذات گراں نہ گزرے میری شاپنگ پر وحید خان نے برا بھی مانا مگر میں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ''یہ میرا بھی گھر ہے اور اپنے گھر میں کوئی چیز لانا بری بات نہیں۔''

اس شام کھانے سے پہلے کافی گپ شپ رہی، صاحبہ سے بھی بات ہوئی مگر وہ عموماً خاموش رہتی تھی۔ رات کا کھانا کھاتے ہی میں بستر میں جا گھسا، میری آنکھ کسی آہٹ پر کھلی تھی۔ میری نظر وال کلاک پر پڑی جس کی سوئیاں رات کے دو بجے کا اعلان کر رہی تھیں۔ میں نے دروازے کو دیکھا جو کھلا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یاد تھا کہ میں دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا کر سویا تھا پھر ایک بلی نمودار ہوئی اور دروازے کے بیچ آ کر بیٹھ گئی، میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو بھگانے کی کوشش کی مگر بے سود میں نے اپنی چپل اس پر اچھالی۔ جس پر وہ ہلکی سی غرائی اور کمرے کے اندر داخل ہو کر میرے بیڈ کے نیچے گھس گئی، میں نے کمرے کے اندر داخل ہوتی بلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پھر میں نے اس کو بھگانے کے لئے فوراً بیڈ کے نیچے دیکھا مگر بلی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے سارا کمرہ چھان مارا مگر بلی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی، میں نے دروازہ بند کیا اور خود کو کمبل میں لپیٹ کر سو گیا، اگلی صبح ناشتے کی میز پر رات والے واقعے کا ذکر چھیڑا وہ دونوں حیران ہوئے کہ اس علاقے میں بلیاں موجود ہی نہیں ہیں۔

صاحبہ نے فوراً اس واقعہ کو میرا واہمہ قرار دے دیا مگر یہ واہمہ نہیں تھا کہ صبح میری ایک چپل کمرے کے باہر پڑی تھی۔ اگلی رات بخیریت گزر گئی مجھے آج تیسرا روز تھا۔ یہاں کے سحر نے مجھے پوری طرح حصار میں لے لیا تھا۔ اس شام وحید خان کا موڈ کافی خوشگوار تھا۔ میرے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ لگاتا رہا۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ صاحبہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کالے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ آتے ہی ہمارے مقابل بیٹھ گئی۔ ''چائے کا موڈ ہے؟'' وحید خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا، وحید خان نے صاحبہ کو سر کے اشارے سے چائے بنانے کا کہا اور وہ کمرے سے نکل کر کچن کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اندر آئی تو اس نے چھوٹی سی ٹرے میں رکھے ہوئے کپ ہمارے آگے رکھ دیئے ہم نے اپنے اپنے کپ اٹھائے، صاحبہ نے تیسرا کپ اٹھالیا اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ آج میں نے اس کو پہلی بار دل کی آنکھ سے دیکھا وہ شاید میری نظر میں چھپے جذبات کو بھانپ گئی تھی۔ اب اس کے ہونٹ تو چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، وہ شام بھی اپنے مقررہ وقت پر رات میں ڈھل گئی۔ میں اس گھر میں خاصا مطمئن تھا۔

مگر جب اس پراسرار رات کی یاد آتی تو خوف کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی تھی۔ جب میں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آیا تو بارش شروع ہو گئی شام سے ہی کالے بادل سر پر منڈلانا شروع ہو گئے تھے اور اب تیز بارش ٹین کی چھت پر اپنی آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو سامنے گرج اور چمک کا راج تھا۔ بجلی کی روشنی جب درختوں پر پڑتی تو بارش کی شدت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ میں باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔

رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ جب دروازے سے میں نے صاحبہ کو دیکھا۔

جو اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک کچن کے برتن کھٹکنے کی آواز سنائی دی، پھر خاموشی چھا گئی، میری نظریں بدستور دروازے پر تھیں، صاحبہ ابھی تک کچن میں تھی مگر وہاں سے اب کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا میں کسی انجانے احساس کے تحت اپنے بیڈ سے اٹھا اور باہر آ گیا کچن میں لائٹ جل رہی تھی میں بے آواز قدموں سے کچن کی طرف بڑھا دروازہ کھول کر اندر جھانکا، مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

کیا صاحبہ کا گزرنا اور کچن سے برتنوں کی آواز میرا واہمہ تھا میں نے خود سے سوال کیا مگر نہیں یہ وہم ہرگز نہیں تھا۔

مجھے خوف سے جھرجھری سی آ گئی اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر یک لخت پھر برتنوں کے کھٹکنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اس وقت میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا، جب میری نظر کچن میں پڑی تو میں پھٹی

پھٹی سی نظروں سے اندر کا منظر دیکھنے لگا، پانی کی ٹونٹی کھلی تھی، اور برتن خود بخود دھل رہے تھے۔ ہر ایک برتن اچھل کر پانی کی ٹونٹی کے نیچے جاتا اور پھر صاف ہو کر ایک طرف کرینے سے لگ جاتا۔ جتنے بھی برتن کچن میں موجود تھے ان سب کو میں نے اپنی آنکھوں سے خود بخود دھلتے ہوئے دیکھا اور حیرت سے میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں یکدم مجھے غنودگی سی آنے لگی، لمحے بھر کو میری آنکھیں بند ہوئیں اور پھر میں سنبھل گیا، سامنے کا منظر جوں کا توں تھا کچن کی لائٹ جل رہی تھی اور ماحول پرسکون تھا۔

میں فوراً اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پھر بیڈ پر دراز ہو گیا اور ان واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔ جو رونما ہو رہے تھے۔ صاحبہ کا میری نظروں کے سامنے سے گزر کر کچن میں جانا اور پھر اس کا وہاں سے غائب ہو جانا اور برتنوں کا خود بخود دھلنا یہ سب باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ یہی سوچتے سوچتے پھر نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح بہت سہانی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ ننگے پیروں کے ساتھ گیلی گھاس پر چہل قدمی کرنے سے ایک خوشگوار سا احساس ہوا، تھوڑی دیر کے بعد وحید خان اپنے کمرے سے کلا اور مجھے مسکرا کر سلام کر کے واش روم چلا گیا۔

چند منٹوں کے بعد صاحبہ بھی اپنے کمرے سے نکلی لیکن اب وہ پھولدار لباس میں تھی۔ اس نے سر پر دوپٹہ رکھا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی میری طرف آئی اور قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی میرا دل چاہا کہ اس سے رات والے واقعے کا ذکر کروں مگر خاموش رہا۔ ''یہاں کا موسم بہت خوب صورت ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی واقعی موسم بہت خوب صورت ہے لیکن یہاں دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگ بہت گند کرتے ہیں، معاف کیجئے گا میں جنرل بات کر رہی ہوں، آپ کی بات نہیں کر رہی، میرا ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو فیملی کی صورت یہاں آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان تھا۔

''صاحبہ آپ رات کو کتنے بجے تک جاگتی ہیں؟'' میں نے کل رات والے واقعے کو ذہن میں رکھ کر سوال کیا۔ میری طرف اس نے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ جیسے میں نے کوئی انوکھی بات کی ہو۔

پھر وہ نارمل ہو گئی اور بولی۔ ''یہی کوئی دس یا گیارہ بجے تک۔''

میں نے پہلو بدلا اور اصل بات کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''صاحبہ کیا کل رات گیارہ بجے آپ کچن میں گئی تھیں؟''

اس سے پہلے کہ اس کی طرف سے جواب آتا وحید خان نمودار ہوئے اور چائے کی فرمائش کی، صاحبہ کرسی سے اٹھی اور کچن کی طرف چل دی۔

''ہیلو جینٹلمین ہاؤ آر یو؟'' وحید خان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں جناب۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''ہمارا علاقہ کیسا لگا آپ کو؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہاں کا حسن تو عالمی طور پر تسلیم شدہ ہے جی، فطرت اپنے تمام رنگوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ یہاں کے حسین نظارے انسان کو مسحور کر دیتے ہیں اور پھر اتنی خاموشی کہ شہروں کے باسی اس سے آشنا ہی نہیں وہ لوگ ٹریفک اور ٹی وی چینلوں کے شور میں بس یوں سمجھیں پھنسے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں کہ اپنے اعصاب کو پرسکون کر سکوں لیکن یہاں ایک مسئلہ مجھے پریشان کئے دے رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ آپ سے کہوں یا نہ کہوں۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''وحید صاحب یہاں میں نے دو باتیں ایسی نوٹ کی ہیں جس سے اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہو گیا ہے کہ

www.Paksociety.com

یہ گھر آسیب زدہ ہے، کیا آپ نے بھی کوئی ایسی بات نوٹ کی ہے۔"

اس سے قبل کہ مجھے جواب ملتا صاحبہ نے کچن سے صدا بلند کی کہ ماچس نہیں مل رہی ہے، اس کی بات سن کر، وحید خان وہاں سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جا گھسا۔

اب اس گھر میں میرا رہنا کافی مشکل ہوگیا تھا۔ ابھی میں صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ صاحبہ چائے لئے ہوئے اندر داخل ہوئی اور مجھے چائے کا کپ تھما کر باہر نکل گئی۔

"وحید صاحب کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی کام؟"

"جی نہیں میں یوں ہی پوچھ رہا تھا۔" وہ زیرلب مسکرا کر باہر چلی گئی۔

مجھے اپنے واہمے پر غصہ آگیا۔ میں نے دل میں خود کو مطمئن کیا کہ اب تک جو بھی واقعات پیش آئے ہیں وہ یقیناً میرے ذہن کی اختراع ہیں مگر بلی والا واقعہ مجھے واہمہ نہیں لگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ گھر آسیب زدہ ہو جیسے عام گھر ہوتے ہیں، پھر یہ گھر ہے بھی ذرا بستی سے ہٹ کر قرب وجوار میں جنگل ہیں اس لئے یہاں آسیب موجود ہوسکتے ہیں، پھر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے میں واپس، شہر جانے کے ارادے سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اب اپنا ارادہ بدل چکا تھا۔ مجھ میں مزید تین چار دن رہنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے چائے کا کپ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگالیا۔

اسی اثنا میں وحید خان اندر داخل ہوا۔ "ہیلو جینٹلمین لگتا ہے تم اس گھر سے خوف زدہ ہو۔ یہ گھر تھوڑا سا پراسرار ضرور ہے۔ مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس ستر سالہ بوڑھے میں ابھی تک جوانوں جیسی چستی تھی پھر بولا۔ "آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ شہری ہونا اس لئے دیہاتی زندگی سے واقف نہیں ہو۔ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا رہتا ہے۔ اگر آپ مکمل یہاں رہو تو روزانہ ایک نیا واقعہ دیکھنے کو ملے گا۔"

نہیں بزرگو! ایسی کوئی بات نہیں، آپ کو سن کر شاید حیرت ہوگی کہ میں شہری نہیں ہوں، میں بھی دیہاتی ہوں۔"

بوڑھے وحید خان نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "تمہارا کیا مطلب ہے تم شہری نہیں ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں بھی کشمیری ہوں اور ذریعہ معاش کی خاطر شہر کی آغوش میں پناہ گزین ہوں۔"

"اچھا کہاں کے رہنے والے ہو میرا مطلب ہے کہ کون سے گاؤں کے رہنے والے ہو؟" وحید خان نے مجھ سے پوچھا۔

"میں فاروڈ کہوٹہ کا رہنے والا ہوں۔"

"فاروڈ کہوٹہ خاص یا آگے پیچھے۔"

نہیں جی فاروڈ کہوٹہ سے تقریباً پندرہ میل دور میرا گاؤں ہے۔"

"کون سا گاؤں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی میں ہلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں کافی عرصہ پہلے ہم شہر چلے گئے تھے اور پھر مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے پھر تم کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تمہاری رگوں میں بھی دیہات کا خون گردش کررہا ہے۔ اس لئے ڈرا پنے دل سے نکال دو۔" اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر بیڈ پر میرے استری شدہ سوٹ پر نظر ڈال کر سوال کیا۔ "کہیں جانے کا ارادہ ہے کیا؟"

"جی میں ذرا راولاکوٹ کا بازار دیکھنا چاہتا ہوں کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔"

"ضرور!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سوٹ پہنا اور شیشے میں اپنے کلین شیو چہرے کو چیک کیا۔ جب میں کمرے سے باہر نکلا تو صاحبہ تحسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی بار اس کی آنکھوں میں چمک آئی

تھی۔ "کہاں جارہے ہیں آپ؟" اس نے سوال کیا۔

"جی میں ذرا بازار تک جارہا ہوں۔ کچھ منگوانا ہے تو بتادیں۔"

"نو تھینکس۔" وہ مسکرا کر بولی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا۔ شہر تقریباً آٹھ کلومیٹر دور تھا۔ میں جب سڑک پر آیا تو اکا دکا گاڑیاں آجارہی تھیں میں کچھ دیر تک پیدل چلتا رہا، پھر دور سے ایک موٹر سائیکل کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جو شہر کی طرف جارہی تھی۔ تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا، موٹر سائیکل رک گئی اور میں موٹر سائیکل پر بنا کچھ کہے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، تقریباً بیس منٹ بعد میں شہر میں تھا۔ وہاں کافی گہما گہمی تھی۔ میں کافی دیر تک یونہی بے مقصد گھومتا پھرتا رہا پھر ضرورت کی چند چیزیں خریدنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ ابھی میں نے چند قدم ہی طے کئے ہونگے کہ بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔

بادل منڈلاتے رہے تھے۔ اس لئے پتا ہی نہ چلا کہ کب بارش شروع ہوجائے، رفتہ رفتہ بارش تیز ہوگئی، میں بارش سے بچنے کے لئے ایک دکان میں جا گھسا، یہاں ذرا طمانیت کا احساس ہوا، بارش کے باعث سردی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دکان میں کافی حدت تھی۔ میں کچھ دیر کھڑا ہوکر شیشے کے پار بارش کو دیکھ رہا تھا۔ جو اب رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا اور میں سردی سے ٹھٹھر گیا تھا یہی تو شان ہے ہمارے کشمیر کی کہ شدید گرمی کے موسم میں بھی یہاں سردی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے موبائل کی اسکرین پر ٹائم دیکھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ پھر جب بارش کافی کم ہوگئی تو میں وہاں سے نکلا مقامی ویگنوں کے اڈے کی طرف بڑھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ویگن میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو دن کا ایک بج رہا تھا۔

دروازہ صاحبہ ہی نے کھولا تھا۔ وہ سیاہ لباس میں تھی۔ اس نے سلام کرکے مجھے راستہ دے دیا، میں اپنے کمرے میں جا گھسا، کمرے کی کھڑکی بند تھی، میں نے کھڑکی کھول کر فضا کا جائزہ لیا اور ایک پٹ بند کردیا،

ڈر

ہم لوگ سانپ سے ڈرتے ہیں کہ ڈس لے گا آگ سے گھبراتے ہیں کہ جھلسادے گی۔ پانی سے خوفزدہ ہیں کہ لہریں نگل لیں گی۔ امراض سے گھبراتے ہیں کہ ہلاک کردیں گے۔ آفات سے ڈرتے ہی کہ تباہ کردیں گے۔

لیکن

اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں ڈرتے جو ان تمام چیزوں پر قادر ہے اور اس کے حکم کے بغیر یہ کچھ نہیں کرسکتیں تو پھر کیوں نہ اس سے ڈریں جس سے سب ڈرتے ہی۔

(ایس امتیاز احمد، کراچی)

بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ مجھ سے یہاں رہنے کا کرایہ بھی نہیں لیتے اور کھانا بھی اس طرح دیتے ہیں جیسے میں ان کے گھر کا فرد ہوں، آج مجھے کچھ رقم ان کو دینا چاہئے میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ جیسے کسی نے ہاتھ کی جنبش سے وا کیا ہو۔

پھر ایک کالی بلی کمرے میں داخل ہوئی اور بیڈ کے نیچے گھس گئی۔ میں نے فوراً جوتا اٹھایا اور بیڈ کے نیچے پھینکا۔ میں نے جھانک کر دیکھا، بیڈ کے نیچے جوتا تو موجود تھا مگر بلی کا نام ونشان تک موجود نہیں تھا۔ مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا وہ مریے سامنے ہی تو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی پھر کہاں غائب ہوگئی۔ اس رات کی بلی بھی مجھے یاد تھی۔ اس کا رنگ براؤن تھا۔ مگر یہ مکمل سیاہ تھی۔ ابھی میں حیران وپریشان کھڑا تھا کہ صاحبہ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا بات ہے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" اس

نے سوال کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ایک بلی کمرے میں داخل ہوئی تھی، مگر پھر نظر نہیں آئی۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے، جب میں نے اسے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''دروازے سے باہر چلی گئی ہوگی ویسے بھی بلی کے چلنے کی آواز تو ہوتی نہیں اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' وہ اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں ہوسکتا ہے کہ نکل گئی ہو۔'' میں نے کچھ یقین اور کچھ بے یقینی سے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ کے ابو کہاں ہیں؟''

''ابو نہیں دادا ابو۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''وہ اپنے روم میں ہیں، خیریت تو ہے کیا بلی کی شکایت کرنی ہے ان سے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''تم اتنا ہنستی کیوں ہو؟'' میں نے اس کے مقابل آ کر سوال کیا۔

''ظاہر ہے ایک بلی سے آپ اتنا پریشان ہوگئے، ہنسنا تو چاہئے۔'' وہ پھر ہنس دی۔

''نہیں تم محض بلی کی وجہ سے نہیں ہنسی ہو۔ یہ وقت بے وقت کی ہنسی کسی اور وجہ سے ہے۔''

''کس وجہ سے ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''شاید کسی نے تمہیں احساس دلایا ہوگا کہ تمہاری ہنسی بہت دلکش ہے۔'' وہ جھینپ گئی۔

''میں چپ ہوگیا وہ بھی خاموش ہوگئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔''

''وہ جی بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں میں یہاں رہتا ہوں کھاتا پیتا ہوں مجھے اس کی پے منٹ کرنی چاہئے، مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا آپ اپنے دادا ابو سے بات کرکے مجھے بتائیں، ہوسکتا ہے میں ان سے بات کروں وہ برا مان جائیں آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔'' میں نے پوچھا۔

''آپ دادا ابو سے ایسی کوئی بات نہ کریں۔ وہ برا مان جائیں گے۔ ویسے بھی آپ ہمارے مہمان ہیں۔'' پھر اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور نکل گئی۔

شام ہوتے ہی سرد ہوا چل پڑی، جون کا پہلا ہفتہ میدانی علاقوں میں جہنم جیسا ہوتا ہے مگر یہاں کافی سردی تھی پھر رات ہوتے ہی ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔

رات کا کھانا کھاتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈ میں جا گھسا، کمرے کی واحد کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی آج بند تھی، میں بیڈ پر کمبل اوڑھے اپنی واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دو دن بعد مجھے واپس جانا پڑے گا پھر اپنے علاقے کی گرمی کا خیال آتے ہی دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح جون جولائی یہیں راولاکوٹ میں بسر کیا جائے۔ مگر آفس میں اسی سوچ میں گم تھا کہ لوڈشیڈنگ کا ٹائم ہوگیا اور لائٹ چلی گئی، کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایمرجنسی لائٹ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر الماری میں رکھی ہوئی تھی۔ مگر اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی طرح آدھا گھنٹہ گزر گیا اب نیند جیسے میری آنکھوں میں سمانے لگی تھی۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا جیسے کمرے میں کوئی چل رہا ہو۔ ''کون ہے؟'' میں نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے زور سے سوال کیا، خوف اس لئے کہ دروازے کی چٹخنی لگی ہوئی تھی اور کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا کمبل تھوڑا سا کھسکایا ہو، میں حوصلہ کرکے اٹھا اور الماری کی جانب بڑھا۔

اسی اثنا میں لائٹ آگئی اور کمرہ جگمگا اٹھا، کمرے میں کوئی نہیں تھا مگر کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے میں نے کھڑکی کی کنڈی خود لگائی تھی۔ پھر میری نظر دروازے کی طرف گئی اور خوف کی لہر میری رگ و پے میں اتر گئی، دروازہ کھلا تھا۔

میں نے اسی وقت اگلے دن واپسی کا ارادہ کرلیا۔

اس رات میں نے کمرے کی لائٹ نہیں بجھائی، دروازے اور کھڑکی میں نے پھر بند کردیئے تھے۔ مگر

میرا زیادہ وقت دروازے اور کھڑکی کو دیکھنے ہی میں گزر گیا پھر نہ جانے رات کے کس پہر نیند آگئی، جب میری آنکھ کھلی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے، میں فوراً بیڈ سے اترا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

ساتھ والے کمرے میں تین چار افراد کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچن سے صاحبہ برآمد ہوئی۔ ''جناب رات کیسی گزری؟'' اس نے سوال کیا۔

''مجھے جلدی نیند آگئی تھی۔'' میں نے جواب دیا، رات والے واقعہ کا ذکر یوں نہیں کیا کہ وہ یقیناً ساری بات ہنسی میں اڑا دیتی۔ ''مہمان آگئے ہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''چچا اور چچی ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں آپ فریش ہوجائیں میں ناشتہ لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر کچن میں داخل ہوگئی، میں بھی منہ ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم چلا گیا، ناشتے سے فراغت کے بعد میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

آج میرا پکا ارادہ واپس جانے کا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ واپس جانے سے پہلے کیوں نا بنجوسہ کو بھی جاتے جاتے دیکھ لوں اور پھر اگر وقت ہوا تو آج شام ہی کو میں واپس چلا جاؤں گا۔ فی الحال میں نے واپسی کا ارادہ ملتوی کردیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ گھر سے تھوڑی دور سڑک تھی، میں سڑک پر کھڑا ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر ایک ویگن میرے قریب آ کر رک گئی اور میں سوار ہوکر بنجوسہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد میں وادی بنجوسہ میں موجود تھا، صبح صبح وادی کا حسن قابل دید تھا۔ میں وادی کے دلفریب نظارے کے سحر میں جکڑا جا رہا تھا۔

سرسبز وادی بنجوسہ کا حسن اپنی مثال آپ تھا۔ وادی کی خوب صورتی اپنی مثال آپ تھی۔ دن بھر وادی دلفریب میں گھومتا رہا۔ جہاں تک جا سکتا تھا خوب گھوما پھرا۔ پھر تھک ہار کر ایک چھوٹے سے پھولوں سے لدے ہوئے گارڈن کا رخ کیا، جہاں خوب صورت پھولوں کا ایک کنج تھا۔ درمیان میں ایک بنچ بنی ہوئی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور ٹھنڈی ہوا دل کو معطر کررہی تھی۔ بنچ پر بیٹھ کر میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگا اور پھولوں کی خوشبو اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو اپنی سانسوں کے ذریعے دل میں سمونے لگا مجھ پر ایک عجیب سی سرمستی چھانے لگی۔ اسی سرمستی کے عالم میں میری نظر پھولوں کے کنج میں پڑی پھولدار جھاڑیوں کے درمیان ایک بہت بڑی کالی بلی اپنے پنجوں پر منہ رکھ کر اپنی نیلی نیلی چمکدار آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہے۔ مجھے ایسا لگا۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی ہے اور پھر ابھی مجھ پر جھپٹ پڑے گی میں اس کو دیکھ کر کچھ سہم سا گیا۔ پھر سوچا دن کا وقت ہے دن کو آسیب وغیرہ نہیں ہوتے میں خواہ مخواہ ڈر رہا ہوں پھر میں نے اپنا دھیان دوسری طرف کرلیا۔ اور دور دور تک پھولوں کے کنج کو دیکھنے لگا جو قطار در قطار تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ میں قدرت کے حسین شاہکار دیکھنے میں غرق تھا کہ اچانک ہی مجھے غرانے کی آواز آئی، میں نے پیچھے کی طرف دیکھا تو وہ بلی کھڑی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک پھولدار جھاڑی کے اوپر سے جست لگائی اور میاؤں میاؤں کرتی ہوئی میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

اس کی میاؤں میاؤں میں بھی ایک عجیب قسم کی کاٹ تھی۔ جسے سن کر کلیجہ کانپ جاتا تھا۔ دن کے اجالے میں بھی میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا اور ماحول پر عجیب سی یاسیت طاری تھی۔ پارک میں کافی رش تھا۔ سیاحوں کی ٹولیاں جمع ہورہی تھیں مگر میرا دل اچاٹ ہوگیا تھا کہ کس طرح میں گھر پہنچوں اور شہر کا رخ کروں، مرے مرے سے قدموں کے ساتھ میں پارک کے گیٹ سے باہر نکل آیا اور پھر ایک الوداعی سی نظر وادی بنجوسہ کے پارک پر ڈال کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ تھوڑی ہی دور ایک ویگن کا کنڈیکٹر آوازیں لگا رہا تھا۔

اور میں ویگن پر سوار ہوکر آدھے گھنٹے کے بعد گھر جا پہنچا۔ صاحبہ دروازے ہی پر کھڑی تھی۔ جیسے وہ میرا ہی انتظار کررہی ہو۔ ''جناب کہاں غائب ہوگئے تھے۔ پورا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دن نظر نہیں آئے ہو۔ میں نے سوچا شاید چپکے سے شہر واپس چلے گئے۔'' میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، ایک عجیب سی چمک اس کی آنکھوں میں رقصاں تھی۔

''میں ویسے ہی ذرا گھومنے پھرنے بنجوسہ کی طرف چلا گیا تھا۔''

''کیسی رہی بنجوسے کی سیر؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھی رہی۔'' میں نے کہا۔

''آپ اکیلے ہی کیوں چلے گئے مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔''

آپ چلتیں میرے ساتھ۔''

''کیوں نہیں، پھر بھی میں آپ کے ساتھ ہی تھی۔''

''کیا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ارے بابا میرا مطلب ہے کہ میں یہاں تھی مگر میرا دل وہیں پر بھٹکتا پھر رہا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ہم یہاں کے باسی ہیں ہم گھر ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ ہمارا دل ہر جگہ پر ہوتا ہے میں اس وقت یہاں آپ کے پاس کھڑی ہوں مگر میرا دل معلوم نہیں کہاں کہاں سیر کرتا پھر رہا ہے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ بت یہاں کھڑا ہے اور روح کہیں اور بھٹک رہی ہے۔'' یہ بات کہہ کر وہ عجیب سے انداز میں ہنسنے لگی۔

''ارے آپ ڈریں نہیں میں بھی انسان ہوں، ویسے ہی مذاق سے آپ کو ڈرا رہی تھی۔''

میں اس کی باتوں کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا اور اس کو دروازے پر ہی کھڑا چھوڑ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ ابھی شام ہونے کو کافی وقت تھا اور پھر میں نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا مختصر سا سامان تھا ایک ہی بیگ میں آ گیا۔

ابھی میں نے اپنے میزبانوں کو واپسی سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا جیسے ہی وحید خان فارغ ہوگا میں اس کو بتا دوں گا کہ میں جا رہا ہوں۔ سامان پیک کر کے میں ٹانگیں لمبی کر کے صوفے پر بیٹھ گیا مجھے رہ رہ کر اس جنت نظیر علاقے کو الوداع کہنے کا دکھ ہو رہا تھا۔ کل سے وہی گرمی کی شدت ہوگی ٹریفک کا شور ہوگا اور پھر وہی مسائل ہوں گے، میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ وحید خان اندر آ گیا۔ ''ہیلو جینٹلمین آج کل نظر نہیں آتے ہو؟'' وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ پھر اچانک اس کی نظر میرے بیگ پر پڑی۔ ''واپسی کا ارادہ ہے کیا؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی سر۔'' میں نے جواب دیا۔

''کچھ دن اور رہ لیتے ہم دونوں یہاں ایک طویل عرصے سے مقیم ہیں تمہارے آنے سے رونق آ گئی تھی، اپنے اپنے سے لگے ہو جب کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے؟'' پھر کچھ دیر توقف کے بعد وہ دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''کب تک ہو؟''

''بس دو گھنٹے بعد چلا جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آج تو آپ کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے گھر میں رونق تو ہوگئی ہے۔''

''ہاں میرا بھائی اور بھابھی ہیں۔ آج شام کو چلے جائیں گے، تم آج کھانا کھا کر جانا مسٹر.....''

''خاقان'' میں نے اپنا نام بتایا ویسے مجھے یاد ہے میں نے یہاں آتے ہی آپ کو نام بتایا تھا۔'' ''او کے جی میں آج شام کا کھانا کھا کر جاؤں گا۔ اسی طرح آپ کے بھائی سے ملاقات ہو جائے گی ملوایا نہیں ہے آپ نے ان سے۔''

''کھانے پر مل لینا۔ آج ہم لوگ ایک خاص ڈش بنا رہے ہیں اور اپنے اباؤ اجداد کی روایت کے مطابق زمین پر بیٹھ کر کھائیں گے، یہ ڈش بہت سے افراد ایک ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔''

''ضرور!'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر وحید خان چلا گیا اور میں اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیہ ٹٹولنے لگا۔

آج صبح کو اچھی دھوپ نکلی تھی۔ مگر اب جو میں نے کھڑکی کھول کے دیکھا تو چاروں طرف کالی گھٹا

چھائی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے قریب ہی سیب کا درخت تھا۔ جس پر سبز رنگ کے سیب اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ قریب ہی جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی شاخ پر ایک پہاڑی پرندہ اپنی زبان میں کچھ بول رہا تھا۔ شاید وہ اپنے ساتھی کو پکار رہا تھا۔

دو بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی پھر صاحبہ کی آواز سنائی دی۔ ''ساتھ والے کمرے میں آ جائیں کھانا تیار ہے۔''

میں نے سلیپر میں پاؤں ڈالے اور اپنے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں پہلے ہی سے چھ سات افراد موجود تھے۔ جو ایک دسترخوان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی سلام کر کے ایک خالی جگہ بیٹھ گیا۔ میری نظریں ان کے چہروں کا طواف کرنے لگیں جن کو آج سے پہلے میں نے کبھی اس گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب خاموش تھے پھر صاحبہ اندر داخل ہوئی اور ایک بڑی سی ٹرے دسترخوان پر رکھ دی، میں نے ٹرے کو دیکھا پھر میری نظریں دسترخوان پر جیسے جم گئیں مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

مجھے یاد آیا کہ اس قسم کا دسترخوان میرے گھر میں بھی موجود تھا۔ جو میری بیوی انجم اپنے جہیز میں لائی تھی، اس دسترخوان اور میرے سامنے بچھے ہوئے دسترخوان میں ذرا بھر بھی فرق نہیں تھا۔ یہ بازار میں بکنے والا عام دسترخوان نہیں تھا اس پر ہاتھ سے باقاعدہ گل کاریاں کی ہوئی تھیں، انجم جو دسترخوان لائی تھی، اس کو انجم کی ایک خالہ نے مصر سے بھجوایا تھا۔ اس دسترخوان پر بھی فراعین مصر کے دور کی جھلک تھی اور میرے سامنے والے دسترخوان پر بھی صاحبہ نے کھانا لگا دیا پھر اس نے تمام لوگوں کو کھانا کھانے کی ہدایت کی اور پھر وہ سب لوگ کھانا کھانے لگے میں ڈونگے سے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا اور کھانا شروع کر دیا۔

کھانے کے دوران رکھا ہوا بڑا چمچ میرا ہاتھ لگنے سے دسترخوان پر گر گیا اور سالن کا نشان اس پر ثبت ہو گیا، میں نے چمچ واپس رکھا اور پھر اس نشان کو صاف کرنے لگا مگر مصالحہ زدہ گھی کا نشان صاف نہ ہو سکا۔

کچھ دیر بعد لوگ باری باری اٹھنے لگے اور تعداد کم ہوتی گئی، اگلے پانچ منٹ میں وہاں کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد صاحبہ اندر داخل ہوئی اور دسترخوان پر برتن سمیٹنے لگی پھر برتن رکھنے کے بعد کمرے میں آئی اور دسترخوان اٹھا کر اس کو تہہ کیا اور باہر چلی گئی۔ میں اب کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا۔

موبائل فون کی گھڑی دن کے تین بجا رہی تھی، مجھے یاد آیا کہ راولاکوٹ سے آخری گاڑی چار بجے نکلتی ہے، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکلا، باہر خاموشی تھی، میں اپنے کمرے میں آیا، بیگ اٹھا کر کاندھے پر رکھا اور باہر نکلا۔ سارے گھر میں سناٹا تھا، میں نے کچن میں جھانکا کوئی نہ تھا، باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گھر میں دو ہی تو کمرے تھے صحن میں جا بجا پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے ایک طویل عرصے سے صفائی نہ ہوئی ہو، پھر میں نے وحید خان کا نام اور صاحبہ کا نام لے کر پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا، خوف کی ایک لہر سی میرے سراپے میں دوڑ گئی میں نے جلدی جلدی وہاں سے نکلنے میں عافیت جانی، اور گھر سے باہر آ گیا۔ میں دھڑکتے دل سے آگے بڑھنے لگا اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ مکان کا نام نشان تک نہیں تھا۔ دور دور تک سرسبز و شاداب چٹیل میدان نظر آ رہا تھا۔

جس گھر میں، میں ایک ہفتہ جیتے جاگتے گوشت پوست کے انسانوں کے ساتھ رہا تھا۔ ان سے باتیں کی تھیں ان کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھایا تھا۔ اب نہ مکان تھا نہ وہ مکین تھے۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ میں کس طرح اس اللہ کی غیبی مخلوق میں محفوظ رہا اور مجھے ذرا بھر بھی شبہ تک نہ ہوا کہ یہ کوئی اور ہی دوسری مخلوق ہے اور میں بہ حفاظت واپس لوٹ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔

گھر سے سڑک کا فاصلہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں تیز تیز قدموں میں سے چلتا ہو سڑک پر آیا دور سے

www.paksociety.com

مجھے گاڑی، آتی ہوئی دکھائی دی، یہ تین بجے والی بس تھی جو راولپنڈی جارہی تھی۔ میں نے ہاتھ دیا گاڑی رکی اور میں سوار ہوگیا، شام چھ بجے جب راولپنڈی پہنچا تو موسم میں اچھی خاصی حدت تھی۔ ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی کر اپنے شہر جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا، ٹکٹ میں نے لیا لیا تھا۔ گاڑی نے سات بجے نکلنا تھا۔ پھر اللہ اللہ کر کے سات بجے گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور مسافر باری باری اس میں سوار ہونے لگے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد گاڑی لاری اڈے سے نکلی تو کالے کالے بادل آسمان پر چھا گئے اور موسم کی حدت میں کمی آگئی۔ رات بارہ بجے میں اپنے دروازے کی بیل بجا رہا تھا۔ میں اپنے آنے کی اطلاع پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس لئے دو منٹ کے اندر دروازہ کھل گیا اندر جاتے ہی میں نے بیگ ایک طرف رکھا، راولاکوٹ کا وہ دسترخوان میرے ذہن میں چپکا ہوا تھا۔

انجم چائے بنا کر لائی تو میں نے ایک عجیب سا سوال کر دیا۔ ''انجم تم اپنے جہیز میں ایک نادر قسم کا دستر خوان لے کر آئی تھی؟''

انجم نے حیرت سے مجھے دیکھا جیسے اس کو میری دماغی حالت پر شک ہوا ہو وہ بولی۔ ''راولاکوٹ سے آتے ہی میرا حال پوچھا نہ بچوں کا، نہ اپنے بارے میں بتایا نہ سفر کے بارے میں یہ دستر خوان اچانک بیچ میں کہاں سے آگیا۔ وہ میں نے پیٹی میں رکھ دیا تھا۔ اللہ بخشے میری مرحوم خالہ کو ان کا بھیجا ہوا تحفہ تھا۔ مگر خیر تو ہے نا یہ تمہیں آتے ہی اس 18 سال پرانے دستر خوان کا خیال کیونکر آگیا۔''

میں نے ساری بات بتادی، انجم بھی قدرے حیران ہوئی، پھر وہ مجھے اسٹور میں لے گئی، جہاں ایک پیٹی پڑی ہوئی تھی، جس میں ایک بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔

''اسے کھولو'' میں نے انجم سے کہا۔

''انجم چابیاں لے آئی اور پیٹی کھولی اس میں چھ سات اٹیچی کیس رکھے ہوئے تھے۔ انجم نے تین اٹیچی کیس اٹھائے نیچے سے ایک بیگ نکالا اور اس کو کھولا۔

اس میں پرانے سوئیٹر رکھے ہوئے تھے۔ انجم نے سوئیٹر کے نیچے سے ایک شاپر نکالا۔ اور پھر ہاتھ ڈال کر دستر خوان نکال لیا، دستر خوان تہہ شدہ تھا۔ میں نے اضطرابی انداز میں دستر خوان اس کے ہاتھ سے لے کر کھول دیا، اسے کھولتے ہی مجھ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، دستر خوان بالکل صاف تھا۔

مگر اس کے ایک کونے میں گرے ہوئے سالن کا تازہ داغ مجھے حیرت کے سمندر میں غوطے دے رہے تھا۔ ''یہ داغ کیسے لگ گیا ہم نے تو اسے کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔''

انجم حیرت سے بولی۔

''اور میرے ذہن کی اسکرین پر وہ سات افراد چھا گئے تھے، جو پراسرار شخص خاموشی سے کھانا کھا کر چلے گئے تھے۔ اور ساتھ ہی میرے سامنے وحید خان اور صاحبہ کے سراپے گھوم گئے جو کھانا کھانے کے بعد پراسرار طور پر جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ پھر وہ مکان جس میں، میں سات دن رہا تھا۔ وہ بھی پراسرار طور پر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں گزشتہ دنوں کی ایک ریل سی چل رہی تھی۔ میں تو بہت مدت کے بعد کشمیر گیا تھا۔

دل میں ارادہ تھا کہ میں اپنے گاؤں ہلاں بھی ضرور جاؤں گا۔ مگر چھٹی کم ہونے کی وجہ سے میں گاؤں نہ جاسکا۔ دوسرا اس پراسرار وادی میں ایسا الجھ گیا تھا کہ چھٹی ہی ختم ہوگئی تھی، اور پھر دل بھی ایسا ٹوٹ گیا تھا کہ وہاں سے نکلنے ہی میں عافیت جانی اور سیدھا گھر آکر دم لیا اور اپنے گاؤں جانے کی حسرت دل ہی دل میں دب کر رہ گئی۔

میں آج بھی اس واقعہ کے متعلق سوچتا ہوں، تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ زندگی میں انسان کے ساتھ کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں اور انسان کو تب معلوم ہوتا ہے جب سب کچھ گزر جاتا ہے اور پھر انسان بکا بکا رہ جاتا ہے۔

طلسم کی رات

عامر زمان عامر-بورے والا

بزرگ تحمل سے اپنی جگہ کھڑے رہے، پھر انھوں نے اپنے ہاتھ میں موجود چھڑی کو ہوا میں اچھال دیا، چھڑی اچانک کئی حصوں میں بٹ گئی اور پھر فضا میں موجود بلاؤں کے سر تن سے گاجر مولی کی طرح جدا ہونے لگے۔

جسم وجاں کو تھراتی ہوئی رگوں میں خون منجمد کرتی لرزیدہ لرزیدہ حیرت انگیز کہانی

ڈاکٹر چغتائی کے کلینک کے باہر خلق خدا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا۔ اس کا سر چکرانے لگا آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے مایوسی کی لہر بن کر تیرنے لگے، اندر باہر مریضوں کا تانتا بندھا ہوا تھا تل دھرنے کو جگہ نہ تھی وہ تکونی بکھرے ہوئے چھپر کے ساتھ والی دیوار کے سامنے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کر کے خود بھی چھاؤں میں ادھڑی ہوئی گارے کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا بہت سارے بوڑھے مرد وخواتین اپنی باری کے انتظار میں سیمنٹ سے بنائے ہوئے نیم پختہ تھڑے پر بیٹھے بیٹھے بیزاری سے اونگھ رہے تھے، سامنے کے رخ ویران سی مارکیٹ میں اکا دکا دکاندار اپنی اشیاء سجائے گاہکوں کے انتظار میں نظریں جمائے پہلو بدل بدل کے بازار سے آتے جاتے راہ گیر کو پر امید نظروں سے تک رہے تھے، جو بھی کسی دکان کا رخ کرتا

WWW.PAKURDUPOINT.NET

دکاندار کی باچھیں ایک دم کھل اٹھتی جو راہ گیر دکان کو دیکھے بغیر گزر جاتا دکاندار کی حسرت بھری نظریں حد نگاہ تک اس کا تعاقب کرتی، وہ کچھ دیر مارکیٹ کے ویران منظر سے دل بہلاتا رہا۔ ''اف خدایا بڈھا چغتائی آخر کیا کررہا ہے۔ میں نے تو سوچا تھا ایک آدھ گھنٹے تک سارے مریض نمٹالے گا مگر تھڑے پر تو مریضوں کی تعداد پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ ڈاکٹر ہے یا خطیب اندر دو گھنٹے سے سادہ لوح دیہاتیوں سے نجانے کون سے خطاب کررہا ہوگا ایک مستند قابل سرجن بھی ایک مریض دیکھنے میں اتنا وقت نہیں لگاتا جتنا یہ چغتائی۔''

اس کا پیمانہ صبر سے لبریز ہوا تو وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔

''لگتا ہے صبر سے تو میٹھا پھل نہیں ملنے والا، ایسے کھڑے کھڑے تو دال نہیں گلنے والی کچھ کچھ تو کرنا پڑے گا۔'' غصے سے لال پیلا ہوتے اس نے تیزی سے سر جھٹکا پھر کچھ سوچ کے وہ جلدی سے موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔ ہنٹر نما پلاسٹک کی لچک دار رسی سے اپنا میڈیسن والا بیگ کھول کے اندر کی طرف بڑھنے لگا۔ دو چار قدم چل کے پھر کچھ سوچ کے ٹھٹھک کے رک گیا پتلون کی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کے واپس بیگ موٹر سائیکل کی پشت پر رکھ کے اس پر کچھ لکھنے لگا۔

''سنیے ...... ڈاکٹر صاحب کب تک فارغ ہوجائیں گے۔ مجھے چغتائی صاحب سے ملنا تھا۔'' برآمدے سے ملحقہ حجرے نما کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے نرمی سے مخاطب کیا۔

''جی آپ باہر بیٹھیں ایک گھنٹے تک امید ہے ڈاکٹر صاحب فارغ ہوجائیں گے میرے پاس بس پندرہ بیس ہی پرچیاں باقی ہیں۔ آپ آرام سے بیٹھیں میں ڈاکٹر کے فارغ ہوتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں۔''

اس نے معصومیت بھری ادا سے ایک نظر پرچی بنانے والے ڈسپنسر کو اور دوسری نظر سے تھڑے پر بیٹھے لوگوں کے جم غفیر کو دیکھا باہر پہلے سے بڑھ کر بڑی لائن لگی ہوئی تھی اس نے دل ہی دل میں سوچا جس رفتار سے ڈاکٹر مریض دیکھ رہا تھا ایک ہفتے تک تو ڈاکٹر سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔

''بھائی صاحب برائے مہربانی ایک کام تو کردیجیے یہ کارڈ تو اندر ڈاکٹر صاحب تک پہنچادیجیے۔''

اس نے کارڈ لے کے پرچیوں والے رجسٹر کے نیچے دبالیا وہ برا سا منہ بنا کے پھر باہر آ کے الٹی گنتی سے مریض گننے لگا۔

موٹر سائیکل پر نظر پڑتے ہی اسے خیال آیا کہ دھوپ میں کھڑی کھٹارہ بن جائے گی اسے دھوپ سے ہٹا کے تھوڑا آگے کر کے سائے میں کھڑا کر کے رحم طلب نظروں سے اندر جھانکا کارڈ جوں کا توں رجسٹر کے نیچے ہی اس کا منہ چڑا رہا تھا اسے دیکھ کے ڈسپنسر نے اتنی غیرت کھائی، اسے ٹھہرنے کا اشارہ کر کے کارڈ اٹھا کے اندر چلا گیا تین چار مریضوں داخل واخراج کے بعد ڈسپنسر نے دروازے میں سے سر نکال کے اسے مخاطب کیا۔ ''نام۔''

ایک لمحہ کے لئے اسے ڈاکٹر کی کج ادائی اور اس کے گنوار اسسٹنٹ کی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔

''او بھائی میرے کارڈ کو پلٹو گے تو میرا نام اور میری کمپنی کا نام درج ہے۔''

''جی بہتر دو منٹ صبر کریں میں ڈاکٹر صاحب کو بتا کے ابھی آیا۔''

''اف میرے خدایا کن جاہلوں بناری ٹھگوں سے واسطہ پڑ گیا ہے واجبات وصول ہوجائیں میرے باپ کی بھی توبہ جو آئندہ کبھی بھول کے بھی اس اجاڑ علاقے کا رخ کروں۔'' وہ بے بسی سے پروانے دینے والے جاہل ڈسپنسر کے سامنے کاؤنٹر کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

''شہریار صاحب ڈاکٹر نے پانچ بجے کے بعد آنے کا کہا ہے۔''

لیکن پانچ بجے تک تو مجھے بہت دیر ہوجائے گی بہت دور سے آیا ہوں۔ ''ڈاکٹر صاحب کو کہو کچھ رحم کریں میں کوئی نیا میڈیسن کا آرڈر لینے نہیں آیا پچھلا

حساب بے باق کرنے آیا ہوں، ڈاکٹر صاحب کے کان میں جا کے دوبارہ پھونک مارو میرے پیسے دیں میں چلتا بنوں۔''

شہریار نے قدرے کرخت لہجے میں مدعا بیان کیا۔

''شہریار صاحب ڈاکٹر صاحب کا پیغام میں نے آپ کو سنا دیا اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

اس نے صاف گوئی سے جواب دیا شہریار نے دوبارہ بات کرنا چاہی مگر وہ سنی ان سنی کر کے ڈھیٹ بن کے دوبارہ اپنی مسند پر بیٹھ کے پروانے لکھنے لگ گیا۔

''اگلا مریض...... کون ہے بھئی جلدی آؤٹ۔''

وہ شہر سے دور افتادہ مضافاتی قصبہ تھا۔ پورے علاقے میں اکلوتا دیہی ہیلتھ مرکز عرصہ دراز سے ویرانی کا منظر پیش کررہا تھا۔ ایک مدت سے سرکاری فائلوں اور اسپتال کے رجسٹروں میں سب اچھا کی رپورٹ چلی آرہی تھی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی صحت جیسی بنیادی سہولت سے محروم مکین مسیحا کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے وہ مسیحا برسوں سے نہ صرف ٹھاٹھ سے شہر میں اپنے ذاتی پرائیویٹ کلینک چلا رہے تھے بلکہ سرکاری خزانے سے برابر تنخواہیں بھی بٹور رہے تھے۔ مگر اہلیان قصبہ نے ان کی شکل تک نہیں دیکھی تھی ایسے نامساعد حالات میں ڈاکٹر چغتائی ہی ان کا سرجن، جنرل فزیشن، چائلڈ اسپیشلسٹ، کارڈلوجسٹ سب کچھ وہی تھا لندن پلٹ ڈاکٹر چغتائی اندھوں میں کانہ راجہ تھا جو گزشتہ نصف دہائی سے قصبے کے مکینوں کو ڈاکٹر کے روپ میں قصائی کی طرح ان کی کھالیں اتار کے لوٹ رہا تھا۔ شہریار پچھلے ایک سال سے ڈاکٹر چغتائی کو ملٹی نیشن میڈیسن کمپنی کی ادویات دے رہا تھا اس نے میڈیکل کے چھ سالہ تجربہ میں ڈاکٹر چغتائی جیسا بے رحم، ڈھیٹ اور پیسے کا پجاری نہیں دیکھا تھا حالانکہ ڈاکٹر جیسے مقدس پیشے سے وابستہ افراد نرم دل، خوش اخلاق اور لین دین کے بڑے کھرے ہوتے ہیں مگر ڈاکٹر چغتائی ایسا تھا کہ مریض کے پاس پیسے کم پڑنے پر ہاتھ سے پرچی تک چھین لینا مریض سے دوا کی بوتل لے لینا اس کا وطیرہ تھا مگر دینے والے معاملے میں اس کے سر میں پانی پڑ جاتا۔ ذلیل وخوار ہو کے بھی اسی کے پاس آنا قصبے کے لوگوں کی مجبوری تھی۔

شہر دور ہونے کے باعث اور گردونواح میں ہیلتھ کی سہولت نہ ہونے کے باعث ڈاکٹر چغتائی کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا شہریار کی خطیر رقم پھنس جانے کے باعث اس کے بار بار چکر کاٹنے پر مجبور تھا ہیڈ آفس سے اسے لاسٹ وارننگ دی گئی تھی کہ اس ماہ ریکوری میں کوتاہی ہوئی تو وہ اپنے لئے کسی لوکل فارما کا سوچ رکھے ایریا منیجر سے جی ایم تک انتہائی سخت الفاظ میں ہدایت دی گئی۔ شہریار صاحب آپ کا سابقہ ریکارڈ دیکھتے ہوئے آپ کو آخری موقع دیا جارہا ہے رواں ماہ مطلوبہ ہدف کی عدم تکمیل کی صورت میں آپ کو مجبوراً کمپنی سے فارغ کردیا جائے گا آپ کا ایریا کسی دوسرے میڈیکل ریپ کو سونپ دیا جائے گا اس لئے شہریار ٹھان چکا تھا کہ آج وہ ڈاکٹر سے دو دو ہاتھ کر کے ہی جائے گا ریکوری نہ ہوئی تو اپنی میڈیسن اٹھا کے لے جائے گا۔

شہریار بھوک پیاس سے نڈھال غصہ کی آگ میں جل بھن رہا تھا، آس پاس کے بوریت بھرے منظر سے نظریں چرانے اور وقت گزارنے کے لئے اس نے چوک والے بازار کا رخ کیا۔ وہ انتہائی سستے ترین ڈھابہ نما چھپر کا بدبودار گوشہ تھا چھپر کی ایک طرف کھجور کے بان سے بنی بڑی سی چارپائی رکھی تھی جس کے دو پائے لکڑی کے سہارے اور دو پائے پرانی اینٹوں کے سہارے کھڑے تھے دوسری طرف کچھ ٹوٹی پھوٹی پلاسٹک کی کرسیاں پڑی تھیں جن کا رنگ میل کی موٹی تہہ تلے دب چکا تھا۔ دھول مٹی سے اٹے ہوئے برتن، کیڑے مکوڑے، لال بیگ سمیت اندرونی حصے میں بے شمار چیزیں بکھری پڑی تھیں چھت اور دیواروں پر مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے برتنوں سمیت اندر موجود ہر شے پر دھواں اپنا رنگ چڑھا چکا تھا۔ ماحول میں عجیب سے بوریت رچی بسی تھی۔ مٹی کے چولہے پر رکھی ہوئی کالی کلوٹی کیتلی جس

میں دن بھر کی ابلتی ہوئی پتی اور اس کی چائے میں رچا بسا دھوئیں کا کڑواذائقہ، غلاظت کا احساس، تھڑے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ادھیڑ عمر مالک کے میلے کچیلے لباس سے اٹھنے والی مہک یہ سب کچھ ایسا تاثر پیش کررہے تھے جو پرتعفن ماحول کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔ پیاس سے اس کا حلق خشک ہونے لگا اس نے ادھیڑ عمر باریش شخص سے پانی مانگا وہ ایک ہاتھ سے کیتلی میں چینی ڈال رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گھٹا گھٹ تسبیح کے دانے پھیر رہا تھا نجانے کچھ پڑھ بھی رہا تھا یا ایسے منہ ہلا ہلا کے معمول کی کارروائی ڈال رہا تھا وہ منہ سے کچھ نہ بولا دور پڑے پانی کے مٹکے کی طرف اشارہ کیا شہریار نے پیاس بجھانے کے لئے مٹی کے پیالے کو مٹکے سے بھر کے جونہی منہ کے قریب کیا مٹکے پر چڑیوں کے فاضل مادے سے کھینچی تصویریں دیکھ کے پیالا وہیں رکھ دیا۔

"چاچا پینے کے لئے صاف پانی نہیں ہے کیا میرا مطلب تھا صاف ستھرے برتن میں۔"

"بابو جی اسی مٹکے میں ہے سارا پنڈ اسی سے پیتا ہے۔ آپ کا دل نہیں مانتا تو وہ سامنے نلکا ہے وہاں سے پی لو۔"

اس نے پہلے سرتاپا لباس کا جائزہ لیا پھر نلکے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پانی پی کے پرسکون ہو کے بیٹھ گیا پھٹے پرانے پیوند لگے ملیشیا شلوار قمیض پہنے لڑکے نے چائے کی پیالی سامنے رکھتے ہوئے ایسے گھورا جیسے وہ کسی اور جہاں کی مخلوق ہو وہ چائے کے نام پر کھولتا ہوا گرم میٹھا پانی پی کے اٹھا تو اس نے اسی لڑکے کو آواز دی جو چائے لے کے آیا تھا۔

"پیسے۔" اس نے پتلون کی پشت سے پرس نکال کے پوچھا۔

"پیسے۔" پیسے غلے پر (یعنی کاؤنٹر پر) وہ پھر ادھیڑ عمر شخص کے مقابل آن کھڑا ہوا وہ دوسری کیتلی چولہے پر چڑھا چکا تھا اس کے اوپر والے ہونٹ کا بائیں حصہ نسوار کے جتم سے ابھرا ہوا تھا اس نے نسوار تھوک غلاظت میں مزید اضافہ کردیا آلودہ انگلی کی غلاظت کو نیچے بچھی بوری کے ایک کونے سے مسلتے ہوئے پیسے لے کے ٹھک سے غلہ بند کردیا۔ شام کے سائے پوری طرح پھیل چکے تھے اس نے سوچا شام ہوگئی کام بھی نمٹے کا نہیں ہوا اتنا لمبا سفر سنسان راستہ جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے نکلنا چاہئے۔ واپسی کے لئے مزید دیر کرنا اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات ہوگی مگر وہ پیسے لئے بغیر واپس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا پوری دہاڑی وہ ایک ہی ڈاکٹر کے انتظار میں برباد کرچکا تھا وہ شدید غصے کی حالت میں کمپاؤنڈر کے کمرے کی طرف مڑا اب اس نے روکا تو وہ کمپاؤنڈر کو کچا چبا جائے گا مگر اس کی نوبت ہی پیش نہ آئی وہ شہریار کو اپنی طرف آتا دیکھ کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آیئے شہریار صاحب میں آپ کا ہی منتظر تھا یہ لیجیے آپ کے پیسے گن لیجیے پورے ہیں ہزار ہیں ڈاکٹر صاحب نے آرڈر کے لئے آپ کو اندر بلایا تھا پتہ نہیں آپ کہاں رہ گئے تھے پیسے لو اور میڈیسن کا آرڈر اب اگلے چکر پر یا فون کرکے پوچھ لینا تمہارا انتظار کرکے ڈاکٹر صاحب تو اٹھ گئے ہیں۔"

"اس نے پیسے گنے بالکل پورے پیسے دیکھ کے اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی اس نے جلدی سے پیسے بیگ میں رکھے یہ سوچتے ہوئے موٹر سائیکل کی طرف بڑھنے لگا آرڈر گیا بھاڑ میں پہلے خدا خدا کر پچھلے پیسے نکلے ہیں! اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر واپس آنے کے لئے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرکے لائٹ آن کرلی اندھیرا اجالے پر پوری طرح غالب آچکا تھا راستہ انتہائی خطرناک اور دشوار گزار تھا۔

قصبے کے شمال مشرق سے پکی سڑک گردونواح کے کچھ دیہات سے گزر کر آگے جا کر کے بڑی سڑک سے ملتی تھی دوسرا راستہ گاؤں کی تیسری نکڑ سے پگڈنڈی کی صورت میں کھیتوں کے بیچوں بیچ پکی سڑک سے ملتا تھا جو آگے چل کے مین روڈ پر چڑھتی تھی اس نے اسی شارٹ کٹ کا انتخاب کیا یہ سڑک سے زیادہ پرخطر اور اس کے لئے نیا تھا وہ پہلے ہی تاخیر کا شکار تھا وہ شمال مشرق کا لمبا چکر کاٹنے کی بجائے اسی تنگ راستے پر ہولیا

ناہموار تنگ سی ڈیڑھ اینٹ کی پگڈنڈی پر موٹر سائیکل چلانا کسی شعبدے سے کم نہ تھا، حدنظر تک گھٹا ٹوپ اندھیرے کی دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے کھیتوں کو عبور کرتے ہوئے وہ تیز رفتاری سے تاریکی اور گہرے سکوت کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ڈر اس کی نس نس میں سمارہا تھا۔

پون گھنٹے کے سفر میں وہ کتنے گاؤں پیچھے چھوڑ آیا تھا ریت کی تہہ آتے ہی موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی پڑ گئی وہ پھسلتے پھسلتے بچا اب دور دور تک کسی آبادی یا بندے بشر کا نام ونشان تک نہ تھا ریت میں ٹائر دھنس جاتے تو کبھی رفتار اور گرفت کا توازن بگڑنے لگتا زچ ہو کے اسے موٹر سائیکل سے اتر کے ریت کا صحرا عبور کرنا پڑا ریتلے راستے پر موٹر سائیکل رینگ رہی تھی وہ دھیرے دھیرے ساتھ ساتھ پیدل چل رہا تھا۔

وہ ایک دم ٹھٹھک کے ٹھہر گیا۔ ہیڈ لائٹ کی دھیمی روشنی میں چند قدم کے فاصلے پر ایک کالا ناگ پھن پھیلائے راستہ روکے بیٹھا تھا اس کی خوف ناک پھنکار اور ڈر سے اس کے پسینے چھوٹ گئے شدید خوف اور گھبراہٹ سے اس کا جسم تھرتھر کانپنے لگا۔ وقتی طور پر اس کے پاس مقابلے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی وہ مسلسل دہشت سے بھرپور راستے پر تنہا بیٹھا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے موت اور اس کے نزدیک چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا ہو۔

ہنوز اپنی جگہ کھڑے کھڑے خطرناک سانپ سے امید لگانا کہ وہ خود بخود راستے سے ہٹ جائے گا، موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اس نے اتنا بڑا خوف ناک ناگ اب تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا وہ آنکھیں پھاڑے لگاتار اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا "یہ تو راستے سے ٹلنے والا نہیں اس سے پہلے کہ ناگ آگے بڑھ کے ایک ہی پل میں نگل لے مجھے واپس پلٹ کر ہی جان بچانا چاہئے۔" ناگ زہر کے نشے میں مست پوری قوت سے جھومتا کھڑا ہوگیا۔

بوکھلاہٹ سے اس نے پیچھے مڑنے کے لئے موٹر سائیکل کو گھمایا مگر عجلت میں موٹر سائیکل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے گر پڑی، موٹر سائیکل بند ہونے سے ہر طرف اندھیرے کی سیاہ چادر تن گئی دہشت وخوف کی ایک اور لہر اس کے تن بدن میں سرایت کرگئی اس کے چہار سو سپاٹ سناٹا اور دشت تنہائی سے اٹا ہوا ریت کا صحرا تھا اس نے پوری قوت سے بھاگنے کے لئے قدم اٹھائے مگر ریت کے فرش سے جکڑے ہوئے بھاری قدم اٹھ نہ پائے کسی انجانی قوت نے اسے پکڑ رکھا تھا خوف کی شدت اعصاب پر پوری طرح طاری ہو کے لحہ بہ لحہ دہشت کے احساس میں اضافہ کرنے لگی اس کے اوسان خطا ہونے لگے اس نے بڑی مشکل سے قوت مدافعت جمع کرکے تھوڑی سی ہمت کرکے موٹر سائیکل اوپر اٹھایا پاؤں سے کوئی ٹھوس چیز ٹکرانے سے زوردار آواز نکلی جس کی شدت سے ویرانے کی وحشت بھی ڈر گئی اس نے جلدی سے پاؤں اوپر اٹھا کے دیکھا اس کی جان میں جان آئی اس کا پاؤں پائیدان سے ٹکرایا تھا موٹر سائیکل کی لائٹ سے اندھیرے کی چادر ہٹ گئی شہریار کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا نہ دہشت ناک، نہ جسم وجاں کو لرزا دینے والی پھنکار کچھ بھی نہیں تھا، ہچکولے کھاتا، ڈگمگاتا ریت کے صحرا میں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ سامنے نظریں سڑک پر جمائے بڑی احتیاط اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا مگر اس کا دل اب بھی انجانے خوف سے سہما ہوا تھا اس منظر کو ذہن سے جھٹکنے کے لئے اس نے بہت جتن کئے مگر اس کا دل ودماغ بدستور اسی خوف ووحشت میں اٹکا ہوا تھا۔ کسی حد تک امید کی ایک کرن جاگ چکی تھی وہ میدانی علاقے کی آخری آبادی سے چند میل کے فاصلے پر تھا اس کے بعد مین روڈ سے اس کا گھر تین منٹ کی مسافت پر تھا۔

بارش اور کثیر آمد ورفاقت سے پکی سڑک میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے وہ کبھی سڑک کے ایک کنارے کبھی دوسرے تو کبھی درمیانی رفتار میں توازن برقرار رکھے آگے بڑھ رہا تھا سڑک کے دونوں جانب

طویل قدامت پرانے درختوں کے جھنڈ پراسراریت میں لحہ بہ لحہ اضافہ کررہے تھے درمیان میں گڑھا دیکھ کے اس نے ہائیک مستعدی سے بائیں کنارے کی طرف موڑی تڑاخ کی زوردار آواز سے اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے گردن گھما کے اس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔

درخت کی کئی بڑی ٹہنیاں گاجر کی طرح کٹ کے زمین پر گرنے سے پرندے پھڑ پھڑ کر اڑنے لگے اسے ایک بار پھر خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس ہورہی تھی۔ یہ آج میرے ساتھ کیا ہورہا ہے ہر قدم پر خوف کے پہرے، درخت گرنے کی تڑاخ دار آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اس نے رفتار فل کردی اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کے پر ہوتے اور وہ اڑ کے گھر پہنچ جائیں مگر اسے کیا خبر تھی ایک نئی مصیبت اس کی منتظر تھی ہوا کے دوش پر اسے عجیب سا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ رفتار سے اڑ رہا ہے۔

اس نے دائیں بائیں نظر گھمائی اس کا وہم درد کے وجود سے لپٹا تھا اور کچھ بھی نہیں تھا موڑ پر جلد بازی میں زندگی آخری موڑ پر آتے آتے بال بال بچی اس کے کندھے ڈر کے بوجھ سے اندر دھنسے جارہے تھے اسے احساس کی حد تک گمان ہونے لگا کوئی بھاری قوت اس کے کندھوں پر سوار ہے اس کے خیال میں وہم کی تصویر تیار ہوچکی تو چھٹکارے کے لئے اس نے پوری طاقت سے کندھے جھٹکے۔ ''کون سی بلا چمٹ گئی ہے یا پھر ڈر کی وجہ سے مجھے وہم ہورہا ہے۔'' ان سوالوں کا جواب اس کے پاس نہ تھا خوف سے اس کا دل بیٹھا جارہا تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر دماغ نے خود ہی دل کے خدشے کی تصدیق واضح کردی، کندھے ہلکے پھلکے ہوئے تو پشت پر کسی شے کا وجود شعور کے احساس سے ٹکرانے لگا۔

اس نے بائیں ہاتھ سے پشت پر بندھے بیگ کو ٹٹولا اس کے ہاتھ سے نرم ریشمی بال الجھ رہے تھے اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو خوبرو نوجوان لڑکی دلہن کے روپ میں اس کے پیچھے بیٹھی تھی اندھیرے کے باوجود اس کی آنکھیں موتی کی طرح چمک رہی تھیں۔

اسے دیکھ کر شہریار کا کلیجہ منہ کو آنے لگا اسے ہوش آیا تو وہ ایک کٹیا میں گرد آلود کمبل پر لیٹا تھا سامنے ایک عمر رسیدہ بوڑھا شخص بیٹھا تھا وہ کون تھا کہاں تھا وہ کٹیا میں کیسے پہنچا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''باباجی کون ہیں آپ میں یہاں کیسے پہنچا؟'' اس نے حیرانگی سے کٹیا میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

''بیٹا گھبراؤ نہیں میں سائیں فضل ہوں، منہ اندھیرے میں درگاہ سے حاضری کے بعد لوٹ رہا تھا کہ بوہڑ کے نیچے تم بے ہوش اور زخمی حالت میں پڑے ملے میں تجھے اٹھا کے یہاں لے آیا، پتر خدا کا شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا اتنی رات کو کہاں سے لوٹ رہے تھے کیسے گر کر بے ہوش ہوگئے۔

''پتر خیر مناؤ کہ طلسمی رات کے حادثے کا شکار نہیں ہوئے۔ رات کی پراسرار تاریکی نے کتنے حادثات کو جنم دیا رات کے اندھیرے میں یہاں طلسم کا راج ہوتا ہے۔ یہ آسیب زدہ علاقہ ہے جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کا گڑھ ہے شام کے اندھیرے پھیلتے ہی ویرانے کا سکوت خوف ناک شیطانی آوازوں سے ٹوٹ جاتا ہے ماحول طلسماتی آوازوں کی ہیبت سے گونج اٹھتا ہے۔

خوش نصیب ہو تمہاری کوئی ہڈی پسلی نہیں چور ہوئی کسی چڑیل نے تمہاری گردن نہیں مروڑی، چلے جاؤ، اس شیطانی بیلے سے اور کبھی بھول کے بھی دوبارہ شام کے بعد یہاں قدم مت رکھنا، بارعب شخص نے سمجھا کے اس کے کندھے تھپتھپائے اور اسے اپنے پیچھے چلنے کے لئے کہا۔

شہریار منہ سے کچھ نہ بولا ہکا بکا ہو کے چپ چاپ بزرگ کے قدموں کی تقلید کرنے لگا۔

''یہ تمہاری موٹر سائیکل کھڑی ہے اٹھاؤ

اور جلدی سے اپنے گھر جاؤ، دیکھ لو تمہارا سامان ہر چیز پوری ہے۔''

اس نے موٹر سائیکل باہر نکالنے سے پہلے اندر کھڑے کھڑے بیگ کھول کے میڈیسن کی تہہ میں ایک نظر نوٹوں کی گڈی دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ ''باباجی آپ کا احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا آپ نے میری جان بچائی اجازت.....''

پتر مٹی کے پتلے زندگی موت دینے پر قادر نہیں یہ اختیار تو مٹھی بھر خاک میں روح پھونکنے والی ذات کو حاصل ہے خدا بڑا مہربان ہے انسان تو انسان کے لئے بخش وسیلا ہے۔

بزرگ نے خانقاہ سے لال رنگ کا دھاگہ اتار کے دائیں بازو میں باندھ دیا۔ ''خدانگہبان پتر۔''

''خدا حافظ۔'' اس کے دیکھتے ہی وہ بزرگ اپنی کٹیا کی طرف جاتے ہوئے جھاڑیوں کی اوٹ میں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

گزشتہ رات سے ماں بھوکی پیاسی دروازے پر نظر جمائے انتظار کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی شہریار کو سامنے دیکھ کر ایک دم اس کی ممتا کو قرار آ گیا۔ صحن کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اس کے ہر قدم پر صدقے واری جارہی تھی اس نے آگے بڑھ کے سینے سے لگا کے کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ ''کہاں تھا میرا چاند کہاں سے آرہا ہے میرے لال کا چہرہ تھکا تھکا اور آنکھیں بجھی بجھی کیوں ہیں، ماں بکھرے بال، اداس چہرہ دیکھ کے فکرمند ہوگئی۔''

لاکھ کوشش کے باوجود اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے وہ گلے لگ کے پھوٹ کے رونے لگا ماں نے ممتا بھرے سینے سے لگا کے اپنی پناہ میں چھپالیا، گڑیا نے آواز سنی تو وہ بھاگ کر باہر آ گئی۔ جذباتی ہو کے بھائی اور ماں سے لپٹ گئی۔

''چل بیٹا پہلے ہاتھ منہ دھو کے کپڑے تبدیل کرلے پھر آرام سے بتانا کیا ہوا، دیکھ کیا حالت بنا رکھی ہے۔''

''اللہ بھلا کرے اس بھلے مانس آدمی کا جس نے تمہاری مدد کی خدا کا شکر ہے، میرا پتر سلامت ہے۔'' تو پتر فکر نہ کر میں آج ہی تجھ کو مولوی امام بخش کے پاس لے چلتی ہوں بڑے پہنچے ہوئے عامل ہیں، جن بھوت جادو ٹونے کے مانے ہوئے ماہر ہیں شکر کرو جو بھی مصیبت تھی تمہارے سر سے ٹلی، تجھے ہزار دفعہ سمجھایا ہے چھوڑ دے یہ موٹی نوکری اتنی اتنی رات گئے گھر لوٹ کے آتا ہے، پتہ ہے جان سولی پر لٹکی رہتی ہے ہماری بس آج کے بعد تم کبھی نوکری پر نہیں جانا یہ کیسی نوکری ہوئی منہ اندھیرے گھر سے بے گھر ہوجاؤ اور ستاروں کی چھاؤں میں واپس لوٹ کے آؤ کیا فائدہ ایسی نوکری کا، جس میں پل پل جان خطرے میں اٹکی رہے۔ تو اگر گھر کے ڈھور ڈنگر ہی سنبھال لے تو آرام سے گزارہ ہوگا۔''

مولوی امام بخش مسجد سے ملحقہ برآمدے میں تخت نشین تھے ان کے سامنے دو خواتین ایک مرد دوزانوں ہو کے ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے وہ زیر لب کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ شہریار بھی ایک طرف اسی حالت میں مودب انداز سے بیٹھ گیا۔

''پی بی بی کیا مسئلہ ہے؟'' آخری عورت اٹھ چکی تو مولوی صاحب نے متانت سے سوال کیا۔

''مولوی جی شہریار میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس پر آسیب کا سایہ ہے آپ کے پاس بڑی امید سے آئی ہوں اس شیطانی آسیبی قوت سے چھٹکارہ چاہئے۔''

''ہونہہ آگے آجاؤ نوجوان ..... یہاں بیٹھو میرے سامنے..... اور میری طرف میری آنکھوں میں دیکھو۔''

وہ سہمے ہوئے انداز میں مولوی کی بند آنکھیں، کھلنے کا منتظر تھا۔ ''اپنے ناخنوں کو غور سے دیکھو اور بتاؤ مجھے یہ وہی لڑکی ہے جو طلسمی رات تمہاری موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی۔''

شہریار کے دونوں انگوٹھوں میں اس طلسمی لڑکی کا نقش ابھر رہا تھا اسے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں ڈر کے ڈورے تیرنے لگے۔

''نوجوان گھبراؤ نہیں تم امام بخش کے سامنے

www.paksociety.com

بیٹھے ہو، بس اتنا بتاؤ کہ یہ لڑکی وہی ہے جو کل رات تم کو ملی تھی۔"

"ہاں...... ہاں...... یہ وہی ہے۔" وہ بڑی مشکل سے ہاں کہہ پایا۔

"اس لڑکے پر آسیب کا بہت گہرا اثر ہوا ہے، طلسم کی رات جن بھوت چڑیلوں پر جنون سوار ہوتا ہے اسی رات یہ ایک چڑیل کے جنون کا شکار ہوا ہے اسے تین روز متواتر میرے پاس لانا ہوگا اس کے ذہن پر ڈر اور آسیب بری طرح حاوی ہے بہتر ہوگا جب تک ذہنی کیفیت پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتی اسے گھر سے باہر مت جانے دیں زیادہ سوال جواب کر کے تنگ کرنے سے بھی پرہیز کیا جائے یہ تعویز ہے سفید رنگ کے صاف ستھرے ململ کے کپڑے میں باندھ کے گلے میں لٹکا دیں ایک کالے رنگ کا مرغا اس کے سر سے وار کے اپنی جو (حدود) سے دور کسی ویرانے میں چھوڑ دیں کل پھر اسی وقت دوبارہ لانا۔

گھر آ کے اس کی حالت عجیب سی ہونے لگی جسے دیکھ کے اس کے چہرے سے خوف آنے لگتا پورا جسم تھرتھراہٹ سے کانپ اٹھتا تھا کوئی قریب آتا تو وہ زار وقطار رونے لگتا پھر روتے روتے ہنسی کا دورہ بے ہوشی میں تبدیل ہو جاتا۔

کمپنی سے کچھ دوست اس کا پتہ کرنے آئے اس نے خوف ناک چیخوں سے پورے گھر کو سر پر اٹھالیا کوئی قریب آنے کی کوشش کرتا تو طبیعت میں ناگواریت کا کھنچاؤ اور بھی بڑھنے لگتا اس کیفیت سے ایک بات تو طے ہوگئی کہ وہ تنہائی چاہتا ہے کمپنی کے دوست کچھ پیسے اور صحت یابی کی تسلی دیتے اور بغیر ملے ہی لوٹ گئے۔

دوسرے تیسرے روز کی بجائے سات روز گزر گئے مگر اس کی حالت ویسی ہی رہی بند کمرے کی تنہائی میں چند لمحوں کی خاموشی طاری ہوتی پھر وہی حال۔

مولوی امام بخش نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کے دیکھ لیا وہ اس کے سامنے خاموشی کا بت بنا بیٹھا رہتا نہ ہنستا نہ روتا کوئی حرکت نہ مزاحمت۔

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے شہریار نے پکی چپ سادھ لی بس خالی نظروں سے گھورتا رہتا کھانا پینا چھوٹ جانے سے وہ ہڈیوں کا پنجر بن کے رہ گیا مہینے میں کوئی ایک آدھ دورے کی کیفیت طاری ہوتی باقی دن خاموشی کی نذر ہو جاتے آسیب پراسرار خاموشی میں تبدیل ہو کے رہ گیا کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی یہ تعویز اور عمل ناکام ہوگیا۔

مولوی امام بخش کے مشورے سے اس کی والدہ نے علاقے بھر کے عاملوں اور خانقاہوں کے چکر کاٹے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی جوان بیٹی کا بوجھ، اکلوتے بیٹے کا دکھ، گھر کے ڈھور ڈنگر بھوک پیاس سے مرے جا رہے تھے گھر میں فاقوں کی نوبت آن پڑی کوئی کام نہ کاج ایک مصیبت ٹلتی تو دوسری شروع پریشانی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی ان پر کڑے امتحان کے دن تھے۔

شہریار اکلوتا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ گھر کا واحد کفیل بھی تھا ماں کی شدید مخالفت کے باوجود اس نے میڈیسن کمپنی میں ملازمت اختیار کی تھی۔

☆......☆......☆

"شہریار پتر تم نے کچھ بتایا نہیں آج پھر تمہاری ماسی آئی تھی میں اسے کیا جواب دوں۔"

"ماسی...... کون ماسی......؟ اماں۔" اس نے کھانے کے بعد خشک کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے الٹا سوال داغا۔

"ہائیں انجان بڑا بنتا ہے ماسی، فاطمہ کی ماں مطلب تمہاری ہونے والی ساس۔"

"اماں میں کیا کروں ماسی تو روز ہی ہمارے گھر آتی ہے پر مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"اماں ویسے تو اس کے دل میں اندر ہی اندر لڈو پھوٹ رہے ہیں ایسے میں انجان بننے کا ڈرامہ کر کے اپنے آپ کو بنا رہا ہے اس ذکر سے خوشی اسے بھی ہوتی ہے دیکھا نہیں کیسے جواب دینے کی بجائے مزے لے لے کر بات کو طول دے رہا ہے۔ گڑیا نے بن بلائے مہمان کی طرح اچانک انٹری مار کے ماحول کو مزید خوشگوار بنا دیا۔

"تو چپ کر تجھ سے کسی نے تیری رائے پوچھی ہے۔" شہریار کے جواب سے پہلے ہی ماں نے گڑیا کو خاموش کر دیا۔

"اور شہریار تو ادھر آ تاں تیرے کان کھینچ کے ابھی ساری شیطانی نکالتی ہوں تم نے کیا ڈرامہ بنایا ہوا ہے بھئی ہر بار تو بات کو گھما پھرا کے ٹال کیوں جاتا ہے کیا برائی ہے فاطمہ میں سونی ہے سگھڑ ہے پورا گھر اس نے سنبھالا ہوا ہے پوری پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی ہے۔ ناظرہ بھی کر رکھا ہے پورے محلے کے بچے سپارہ پڑھنے آتے ہیں سب سے اہم تمہاری ماسی کی بیٹی ہے گھر کی بچی ہے دیکھی بھالی ہے بے عیب ہے ارے اچھے نصیب بھاگ والوں کو ملتے ہیں مقدر روز روز گھر نہیں آتا ہے تیری ماسی نے کسی اور کے ساتھ بیاہ دی تو ہاتھ ملتا رہ جائے گا...... ماں نے شکایتوں کے ساتھ نصیحتوں کے بھی دفتر کھول دیئے ماحول کی سنجیدگی دیکھ کے وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"اماں تم تو سنجیدہ ہوگئی مجھے آپ کی پسند پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے ایسی کوئی بات نہیں جو تم سمجھ رہی ہو مگر ذرا سوچو میں گڑیا کا بھائی ہی نہیں باپ کے فرائض بھی میرے حصے میں آتے ہیں ایک ہی وقت میں کوئی دو رشتوں سے کیسے مکر سکتا ہے۔ بہن کے ہاتھ پیلے کرنے سے پہلے میں اپنے سر سہرے سجاتا اچھا لگوں گا بھائی میری طرف سے تو ہاں ہی نہیں بلکہ قبول بھی ہے۔" اس نے ماں کو پیار سے وضاحت دی۔

"بالکل غلط پہلے ہمارے گھر میں ایک پیاری سی بھابھی دلہن بن کے آئے گی پھر کسی گھر سے کسی دلہن کی ڈولی اٹھے گی ورنہ پورے محلے میں شادی پر پابندی لگا دیں گی اماں جی۔" کیوں اماں جی۔

"گڑیا تم......" "نہیں شہریار اسے مت ڈانٹو...... ماں نے اسے بولنے سے پہلے ڈانٹ دیا۔

باتوں سے خوشبو آئے

☆ جو شخص آپ سے محبت کرتا ہے وہ آپ پر ضرور تنقید کرے گا۔

☆ کامل ایمان کی تین خصلتیں ہیں عقل، علم اور حلم۔

☆ جہالت تمہارا سب سے قابل نفرت دشمن ہے۔

☆ زبانوں کو شکوہ سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہوتی ہے۔

☆ یہ نہ دیکھ کہ بات کس نے کی ہے بلکہ یہ دیکھ کہ بات کیسی کی ہے۔

☆ بخیل ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔

☆ محنت نہ کرنا محتاجی کا باعث ہے۔

☆ جھوٹ تمام گناہوں کی ماں ہے۔

☆ بے حسی آدھی موت ہے۔

☆ آدمی کو اپنی اولاد کو ادب سکھلا دینا بھی ایک صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

(پرنس بابر علی رند بلوچ - بھولے دی جھوک ساہیوال)

گڑیا ٹھیک کہتی ہے گڑیا کون سی بوڑھی ہو رہی ہے کل کی بچی ہے اور تجھے پتہ ہے فاطمہ کے رشتے کے لئے تمہاری ماسی کے سسرال والے کتنا دباؤ ڈال رہے ہیں وہ مجبور ہے زیادہ دیر تک ہماری آس میں اپنی بیٹی کو گھر نہیں بٹھا سکتی تجھے پتہ ہے وہ تو تمہاری نانی مرحومہ کو دیا ہوا قول نبھا رہی ہے جس نے پیدا ہوتے ہی فاطمہ کو تمہارے نام سے جوڑ دیا تھا آج فیصلہ ہو کے رہے گا اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو صاف صاف بتا دو۔" ماں نے دوٹوک الفاظ میں جواب مانگا۔

"ٹھیک ہے ماں جو تیری مرضی مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" شہریار نے سعادت مندی سے ہار مانتے ہوئے سر جھکا کے کہا۔

WWW.URDUBOOKS.NET

"پتر تو گڑیا کی فکر نہ کر تیری اماں ابھی بیٹھی ہے ناں، خدا میری لاڈلی کے نصیب اچھے کرے۔"

☆.....☆.....☆

"شہریار..... ارے تجھے آواز دے رہی ہوں کدھر جارہے ہو۔" بازار میں اپنا نام سن کے وہ ایک دم چونک گیا۔

"یہ تو ماسی ہے۔" وہ الٹے قدموں جلدی سے مڑ گیا۔

"جی ماسی۔"

"کدھر جارہے ہو؟"

"ماسی گھر جارہا ہوں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"پتر میں ذرا کام سے شبانہ کے گھر جارہی تھی یہ میری دوا تو ہمارے گھر دیتے جانا مجھے دوہرا چکر پڑ جائے گا۔"

ماسی نے دوا والا شاپر اسے تھما دیا۔ "ماسی کوئی بات نہیں آپ جاؤ میں یہ گھر دیتا جاؤں گا۔"

"جگ جگ جیو پتر..... چلتی ہوں۔" وہ دعائیں دیتے ہوئے گلی کی نکڑ میں مڑ گئی۔

"کوئی گھر پر ہے....." اس نے حویلی کے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے آواز لگائی۔

فاطمہ نے آواز پہچانتے ہی جلدی سے دوپٹہ درست کیا۔ "گھر والے تو تمہارے دل میں بستے ہیں تم یہاں ڈھونڈ رہے ہو۔" اس نے دل میں سوچا ضرور مگر دل کی بات زبان پر لانے سے شرما گئی۔

"آجاؤ دروازہ تو کھلا ہے۔" اس نے دروازے کا دوسرا پٹ بھی کھول کے ایک طرف ہو کے نظریں جھکا لیں۔

"فاطمہ دروازہ کیوں کھول رہی ہو میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا بازار میں ماسی ملی تھی اس نے دوا دی ہے کہ گھر میں دے دینا۔"

"اچھا لاؤ دو۔" اس نے موڑ بناتے ہوئے اپنی طرف والا پٹ بند کر کے اوٹ میں کھڑی ہو کے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"او ہو مہندی۔ ارے کس خوشی میں مہندی لگائی ہے ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ کس کے نام کی مہندی لگی ہے تمہارے ہاتھوں پر۔"

فاطمہ شرم سے خود میں سمٹ کر رہ گئی اس نے گھبرا کے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"فاطمہ یہ کیا کر رہی ہو گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسے سلوک کرتے ہیں اندر نہیں بلاؤ گی مجھے۔"

اس نے تنگ کرنے کے لئے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہائے اللہ مجھے نہیں پتہ کیوں ستا رہے ہو، دوا ماں کی دوا۔ ورنہ میں اندر جارہی ہوں۔"

شہریار نے شاپر ہوا میں لہرایا، اس نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے شاپر پیچھے کر لیا وہ زچ ہو کے پاؤں پٹختی ہوئی اندر جانے لگی۔

"اندر کہاں بھاگی جارہی ہو یہ لو دوا، میری بات تو سنو..... رک جاؤ ورنہ میں جارہا ہوں۔"

اندر کی طرف اٹھتے ہوئے قدم ساکت ہو گئے۔ "پہلے یہ بتاؤ باقی گھر والے کہاں گئے ہیں۔"

"مجھے کیا پتہ۔"

"اچھا خالو کب گھر آتے ہیں۔"

"مجھے کیا پتہ۔"

اس نے ہر بات کا جواب نفی میں دیا۔ اور پھر شہریار گھر میں چلا گیا۔

یہ میری ماسی کا گھر ہے یہاں آنے اور بیٹھنے کے لئے مجھے تمہاری اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تو پھر بھاگو یہاں سے تمہاری ماسی گھر پر نہیں ہے جب وہ گھر پر ہو تب آنا چلو جاؤ۔ کرارہ جواب سن کے شہریار ہنسا تو اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے۔

"فاطمہ پتہ ہے آج اماں نے پھر تمہارے اور میرے رشتے کی بات کی تھی کہ اس بارے میری رائے کیا ہے؟"

"اچھا پھر تم نے کیا جواب دیا۔"

"میں نے کیا جواب دینا ہے اتنی خوبصورت دلہن مل رہی ہو تو کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ اماں اور ماسی خود ہی معاملہ طے کر لیں مگر اماں بضد تھی آج فیصلہ ہو کے رہے گا۔"

"پھر....."

خوشی سے اس کے شربتی رخسار اور بھی لال پڑ گئے اس نے تجسس سے بھرپور لیف اندوز ہوتے ہوئے بے قراری سے کہا۔

"اچھا چھوڑو، باتوں باتوں میں تم سے چائے پانی کا پوچھنا ہی بھول گئی۔ پانی پیو گے یا چائے..... میں تمہارے لئے گھر والی چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

"نہیں اس وقت میں جلدی میں ہوں چائے تمہارے ہاتھوں کی ضرور پیوں گا مگر کسی اور وقت شام کو کنویں کے پاس تمہارا انتظار کروں گا آؤ گی ناں۔"

"کیوں میں کیوں آؤں کنویں کے پاس وجہ۔" وہ بولی۔

"پہلے بتاؤ آؤ گی ناں، بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"

"تو ابھی بتا دو، وہ ضروری بات اب کون سا کوئی تیسرا سن رہا ہے۔"

"نہیں کنوئیں کے پاس تمہیں آنا پڑے گا، میں انتظار کروں گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے تاکید سے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گی مگر شام کو پانی بھرنے اماں گئی تو پھر ناراض مت ہونا پہلے بتا دیتی ہوں۔"

"ہائے اللہ میں تو بھول ہی گئی ایک منٹ رکنا میں ابھی آئی۔" اس کا ایک قدم دروازے کے اندر اور دوسرا باہر تھا۔

"اب اچانک اسے کیا یاد آ گیا اس نے آواز پر قدم روک کے پیچھے مڑ کے سوچا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کپڑے کی پوٹلی کو انگوٹھے اور انگلیوں کی مدد سے ٹٹولا۔

"گھر جا کے خود ہی دیکھ لینا اب جاؤ مجھے کام کرنے دو اتنے سارے کام پڑے ہیں، خدا حافظ۔" فاطمہ نے جواب سنے بغیر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"پگلی۔" بند دروازے کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا دیا۔

شام میں کنویں کے پاس بڑی شدت سے وہ فاطمہ کا منتظر کھڑا تھا وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا اس کی نظریں گاؤں کی طرف سے آنے والے راستے پر بچھی ہوئی تھیں دور سے لڑکیوں کا ایک ٹولا اٹکھیلیاں کرتا ہوا کنویں کی طرف بڑھ رہا تھا وہ پلک جھپکے بغیر غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"یہ اپنے ساتھ لڑکیوں کی فوج کس لئے لا رہی ہے پانی بھرنے آرہی ہے کہ پانی پہ جنگ کرنے آرہی ہے۔ کون کون ہے۔ یہ چل کیسے رہی ہے فاطمہ تو ایسے مٹک مٹک کے نہیں چلتی..... وہ من ہی من میں اٹھنے والے سوالوں کے خود ہی جواب لگا رہا تھا۔ تمام لڑکیاں اسے صاف دکھائی دے رہی تھیں مگر ان میں فاطمہ نہیں تھی وہ دانت پیستے ہوئے اوٹ میں نیچے بیٹھ گیا۔ خاموشی ہوئی تو اس نے گھٹنوں پر اکڑوں حالت میں دونوں ہاتھ رکھ کے سر اٹھا کے احتیاط سے دیکھا سب لڑکیاں پانی بھر کے جا چکی تھیں۔

"کہاں رہ گئی ایسے کیسے ہو سکتا ہے وہ وعدہ خلافی کیسے کر سکتی ہے وہ اندر ہی اندر سوچوں کے تانے بانے بن رہا تھا اسے ہلکے دھندلکے میں کنویں کی جانب ایک ہیولا سا آتا دکھائی دیا.....

"یہ تو پکی فاطمہ ہو گی۔" دل نے تصدیق کر کے دماغ میں ابھرتے خدشات کو زائل کر دیا۔

وہ سایہ جیسے جیسے کنوئیں کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں امید کی کرن بڑھتی جارہی تھی۔ وہ بے قراری سے اوٹ سے نکل کے کنویں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ "آنے دو اسے ذرا میں کب سے انتظار کر رہا ہوں اور یہ مہارانی نخرے کرتی ہوئی اب آرہی ہے۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں تصور کے عالم میں

www.paksociety.com

پھر اوٹ میں جا کے بیٹھ گیا۔

وہ پانی بھر کے انہی قدموں پر واپس لوٹنے لگی تو اس نے اٹھ کے دیکھا۔

''یہ تو ماسی ہے شکر ہے بچ گیا آواز نہیں دی ورنہ آج تو مارا جاتا۔'' اس کے تمام جذبوں پر پانی پڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

گڑیا اور ماں اپنے کمرے میں سو رہی تھیں اور وہ غصے کی آگ میں جل بھن رہا تھا نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ بے زاری سے کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اٹھ کے باہر نکل گیا پورا گاؤں گہری تاریکی میں خاموشی کی چادر اوڑھے پرسکون سو رہا تھا اس کے بوجھل قدموں کی چاپ سے ہلکی سی ارتعاش پیدا ہو رہی تھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم بے اختیار فاطمہ کے گھر کی طرف بڑھنے لگے، وہ گم صم خیالوں میں مگن آگے بڑھ رہا تھا اس کی گلی میں قدم رکھتے ہی ایک ساتھ بہت سارے کتوں کے بھونکنے کی آواز نے اس کے سارے خیالات منتشر کر ڈالے وہ جلدی سے انہی قدموں پر واپس پلٹ آیا کمرے کی سپاٹ تنہائی اور محبوب کے تصور سے لپٹے خلوت بھرے لمحات بھی اسے محبت کی میٹھی لوری سنانے میں ناکام رہے وہ اسی طرح بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا خیر جیسے تیسے رات گزر گئی۔

صبح کا اجالا پھیلا اس نے ناشتہ کیا اور کام پر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

''اماں ..... اماں.....'' اس کی آواز اندر ہی اندر کہیں ڈوب رہی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں کمرے سے گھبراتے ہوئے باہر نکلی اس کا پریشانی سے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس حلق میں اٹکا ہوا تھا۔

''گڑیا..... کیا ہوا کیوں زور زور سے چلا رہی ہو کچھ تو بتاؤ ہوا کیا ہے۔''

چولہے کے پاس بیٹھی ماں نے آخری روٹی توے پر ڈالی اور گڑیا کا شور سن کر ہڑبڑا کر اٹھ کے گڑیا کی طرف بھاگی۔

''خدا خیر کرے کیا ہوا، دودھ دینے بھائی کے پاس تجھے بھیجا تھا واپس کیوں آ گئی۔''

''غضب ہو گیا اماں میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔'' گڑیا نے کرب کے ڈوب کے رونا شروع کر دیا۔

''کیوں رو رہی ہے کیا ہوا۔'' اس نے پہلے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر شہریار کے کمرے کی طرف دیکھا۔

''ماں وہ بھیا..... بھیا اپنے کمرے میں بستر پر نہیں ہیں، پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔''

''شہریار اپنے بستر پر نہیں ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

ماں فکرمندی سے کمرے کی طرف بھاگی دروازہ کھول کے دیکھا لالٹین اسی طرح دھیمی جل رہی تھی بستر خالی پڑا ہوا تھا مگر شہریار اپنے بستر پر موجود نہیں تھا، وہ خالی کمرہ دیکھ کے سکتے میں آ گئی۔ ''یا اللہ پہلا امتحان کم تھا جو نئی آزمائش میں ڈال دیا کہاں جا سکتا ہے وہ تو کافی دنوں سے بستر سے اٹھ نہیں پایا یوں اچانک بغیر بتائے اٹھ کے کہاں جا سکتا ہے۔ ہو نہ ہو سکتا ہے جسم میں چلنے کی تھوڑی بہت ہمت پیدا ہو گئی ہو ذہنی کیفیت میں بھی کچھ بہتری آ گئی ہو، مگر رات کے اس وقت اٹھ کے آخر گیا تو کہاں گیا۔'' ذہن میں اس خیال کے جنم لیتے ہی وہ پریشان ہو گئی۔

''ہائے میرا بچہ۔'' شدت غم سے ان کے گھر کی ویرانی ماں بیٹی کے رنجیدہ بینوں میں ڈوب گئی۔

بین اور رونے دھونے کی آواز سن کے پاس پڑوس والوں کے کان چوکنے ہو گئے۔ اور کئی لوگ ان کے گھر کی طرف دوڑے۔

''ہائے ہائے نی بے چارہ شہریار جس پر چڑیل کا سایہ تھا اسے وہ چڑیل کھا گئی بے چارہ کافی دنوں سے بے حس و حرکت بستر پر پڑا تھا آج جان کی بازی ہار گیا۔ ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی۔'' کئی آوازیں ابھریں۔

''شہریار اٹھو میں تمہیں لینے آیا ہوں آج پھر

طلسم کی رات ہے اور تمہاری نجات کی رات ہے، چلو میرے ساتھ، آنکھیں کھولو۔''

شہریار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا کہ یہ تو وہی بزرگ ہیں جو اس رات اٹھا کے مجھے کٹیا میں لے گئے تھے، اس نے بولنے کے لئے لب کھولنا چاہا مگر وہ بول نہ ہو سکا جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کے لب سی دیئے ہوں۔

بزرگ نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا، ان کے پیچھے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکلا گاؤں کی حدود سے نکلتے ہی آسمان نے گرج دار آواز سے جیسے چیخنا شروع کر دیا۔ وہ منظر شہریار کے حواس پر حاوی تھا کہ خوف ناک چہروں والی بے شمار بلاؤں نے ان پر ایک ساتھ دھاوا بول دیا بزرگ نے کافی موٹا دھاگہ مضبوطی سے اس کی کلائی پر باندھ دیا اور بولے کچھ بھی ہو جائے اسے کلائی سے الگ نہ کرنا یہ بلائیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، تم حوصلے سے میرے پیچھے چلتے رہنا۔''

بکھرے بال، لمبے خوف ناک دانتوں سے بہتا ہوا تازہ خون اور ہاتھوں میں تیز دھار تلواریں لہرا رہی تھیں، انہوں نے بزرگ کو غضب ناک آواز میں للکارا۔ ''اپنی جان کی سلامتی چاہتا ہے تو اسے ہمارے حوالے کر دے، ورنہ تجھے بھی آج کوئی طاقت نہیں بچا پائے گی۔'' سب نے تلواریں ہوا میں لہراتے ہوئے حملہ کیا۔

وہ بزرگ تحمل سے اپنی جگہ کھڑے زیر لب قرآنی آیات پڑھتے رہے، پھر انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود چھڑی ہوا میں اچھال دی، وہ چھڑی کئی حصوں میں بٹ گئی اور پھر تو ان بلاؤں کی گردنیں مولی گاجر کی طرح کٹ کے زمین پر گرنے لگی۔

خوش گوار ہوا کے جھونکے فضا کو معطر کرنے لگے، شہریار اپنی آنکھ سے ہر منظر دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا، بزرگ کی ہر بات سمجھ رہا تھا مگر اس کا وجود کسی سحر میں جکڑا ہوا تھا وہ مزاحمت یا ردعمل سے قاصر تھا۔ جیسے اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان بندھی ہوئی ہو۔

خوب صورت پھول ہر طرف لہلہا رہے تھے نو آموز کلیاں نازک شاخوں پر مستی سے جھوم رہی تھیں خوشبو کا احساس اور ہواؤں کا شور بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے وہی خوبصورت لڑکی دلہن کے روپ میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوئی چمکتی آنکھیں کمر تک لٹکتے گھنے بال جن سے کئی اقسام کی خوشبوؤں کی مہک ایک ساتھ اٹھ رہی تھی اس کے فلک شگاف قہقہے سے موتیوں کی طرح دانت چمک رہے تھے وہ بانہیں کھولے شہریار کی منتظر کھڑی تھی۔

شہریار نے آنکھ بھر کے بزرگ کو دیکھا پھر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا، جیسے ہی لڑکی نے شہریار کو چھونے کے لئے ہاتھ آگے بڑھائے تو اس کا چمک دار لباس سفید لباس میں تبدیل ہو گیا، دھوئیں کے سفید بادل زمین پر اتر آئے، پھر وہ لڑکی پیچھے مڑ کے دھوئیں کے بادلوں میں گم ہونے لگی کہ اتنے میں زوردار دھماکے سے زمین لرز گئی اس کا لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہو گیا، اس کا سارا وجود دیکھتے ہی دیکھتے سفید رنگ کے دھوئیں میں تبدیل ہو کر جو چند لمحوں بعد فضاء میں تحلیل ہو گیا۔

شہریار کو ہوش آیا تو گاؤں کے داخلی راستے پر کھڑا تھا۔ ''بابا جی آپ.....'' اس نے بے یقینی سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''شہریار نور کی پہلی کرن پھوٹ چکی ہے، طلسم کی رات کا سحر رات کی تاریکی میں دفن ہو چکا ہے، جاؤ اپنے گھر سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' بزرگ نے مسکرا کے کہا۔

شہریار نے پہلی کرن پھوٹتے ہی گھر کا دروازہ کھولا تو آگے فاطمہ کھڑی تھی اماں، ماسی گڑیا جلدی سے آؤ شہریار کو زندہ سلامت اپنے پاؤں پر چلتے دیکھ کر کسی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا سورج نکلنے تک گاؤں والے ہجوم کی صورت ان کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے مگر اس بار سوگ کے لئے نہیں بلکہ مبارکباد کے لئے۔

موذی بدروح

محمد خالد شاہان- صادق آباد

اجاڑ، ویران اور بھائیں بھائیں کرتا قبرستان میں ایک خوبرو حسینہ گورکن کے سامنے گئی تو نوجوان گورکن کا دل بلیوں اچھلنے لگا، کیونکہ حسینہ نے کہا میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور پھر.....

خیر و شر کی عجیب و غریب دل فریفتہ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دے گی

سسکتی ہوئی آسیبی رات کا سناٹا جا بجا پھیلے ٹنڈ منڈ پیڑوں کی شاخوں سے ہوائیں ٹکراتیں تو یوں لگتا جیسے پورا قبرستان سانس لے رہا ہو، ایک ناقابل بیان نحوست ان پیڑوں پر طاری تھی۔

یہ قبرستان جھنگ کا سب سے پرانا قبرستان تھا۔ اور قبرستان کے بالکل وسط میں ایک جھونپڑی کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لالٹین کی یرقان زدہ روشنی ان دونوں افراد کے لرزیدہ سایوں کو شکستہ دیوار پر متحرک کئے ہوئے تھی۔ ان میں ایک نوجوان ارشد اور دوسرا اس کا دوست احمد تھا۔ وہ بوسیدہ فرش پر بیٹھے ایک بڑے تھیلے کے اندر انسانی ہڈیوں کے پنجر ڈال رہا تھا۔ پھر ارشد نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک انسانی کھوپڑی تھیلے کے اندر ڈالی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر جب تک اس نے اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگائی تب تک اس کا دوست احمد بھی اپنا کام ختم کر کے تھیلے کے سرے کو رسی کی مدد سے باندھ چکا تھا۔ جھونپڑی کے اندر ایک ناقابل برداشت بو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ دونوں دوست اس بدبو سے بے نیاز تھے۔

ارشد نے نصف بیڑی پینے کے بعد احمد کی طرف بڑھائی اور بولا۔ ''اس بار تو صرف ایک تھیلا بھر سکا ہے۔ اب اس موئے دانی کی جھاڑ تو ہی سننا۔''

احمد نے جواباً بیڑی کا دھواں فضا میں اگلا اور بولا۔ ''تو ہم کیا کریں۔ جتنی ہڈیاں جمع ہو سکیں ہم نے کر دیں۔ اب ہم اپنی ہڈیاں تو اس تھیلے میں بھرنے سے رہے۔''

احمد کی بات سن کر ارشد کو غصہ آ گیا۔ ''اپنے فضول کاموں سے فرصت ملے تو ہڈیاں جمع ہوں ناں۔''

ابھی یہ باتیں ہی کر رہے تھے۔ ٹھیک اسی لمحے جھونپڑی کے باہر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور ٹاٹ کے جھولتے پردے کا نچلا سرا ذرا سا سرکا اور ایک موٹا جنگلی بلا جیسا جانور کا خوفناک چہرہ نمودار ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کریہہ صورت جانور کو دیکھ کر خوف سے سمٹ جاتا۔ مگر احمد نے اسے دیکھتے ہی بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پچکار کر اس بدہیبت جانور کو اندر بلا لیا۔ وہ بھی شاید اس انداز سے مانوس تھا۔ لہٰذا فوراً ہی اندر آ گیا۔ یہ جانور لگ بھگ ساڑھے چار فٹ لمبا تھا۔ جو احمد کے بازو سے اپنا سر رگڑتے ہوئے وسط میں رکھے انسانی ہڈیوں سے بھرے تھیلے کو بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ احمد بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں ہے۔ اس تھیلے میں اس کا سارا گوشت تو پہلے ہی نوچ کر چٹ کر چکا ہے۔ اس کی بات شاید جانور نے سمجھ لی تھی۔ اب

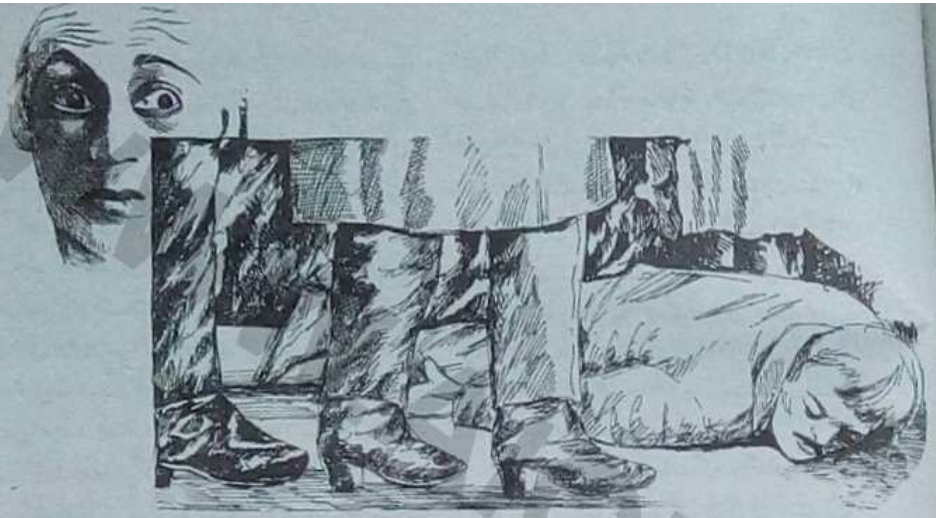

وہ جس پراسرار انداز میں وارد ہوا تھا۔ اسی طرح ایک انگڑائی لیتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس کے نکلتے ہی ارشد بولا۔ ''ساری زندگی میں تو نے ایک یہی ڈھنگ کا کام کیا ہے کہ اس مردہ خور کو سدھار لیا ہے۔''

''ہاں ارشد۔ ورنہ ہم جس قسم کا کام ہم کرتے ہیں اس کے بغیر تو بڑی مشکل ہو جاتی ہمیں۔'' احمد نے ارشد کی تائید کی۔

''مگر اس کی ایک بات خراب ہے۔'' ارشد بولا۔ ''جب یہ زیادہ بھوکا ہوتا ہے تو کم بخت جڑ سے مردہ نکال کر گوشت کے ساتھ اس کی ہڈیاں بھی چبا ڈالتا ہے۔'' احمد نے ارشد کی بات پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ پھر تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر انہیں کسی مخصوص انداز میں کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز پر دونوں ہی چونکے تھے۔ ''آ گیا وہ موناداتی۔'' ارشد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر اس نے بیٹھے بیٹھے بلند آواز میں اسے پکارا۔

''آ جاؤ چوہدری جی۔ اپنا مال لے جاؤ اندر آ کر۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور ایک موٹا سا شخص اندر داخل ہوا۔ جس نے خاکی رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پتلون پہن رکھی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنا رومال ناک پر رکھ لیا تھا۔ شاید اندر پھیلی ہوئی ناگوار بو نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔ وہ خاصا عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن اس کی نظر تھیلے پر پڑی تو وہ بولا۔ ''یہ کیا صرف ایک؟''

''ہاں چوہدری آج تو ایک ہی لے جاؤ۔ اگلی بار تین دے دیں گے۔'' اس بار احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر جب اس نے زمین سے وہ ہڈیوں بھرا تھیلا اٹھا کر اپنی جیب میں سے چند بڑے نوٹ نکالتے ہوئے احمد کی طرف بڑھائے تو وہ خاصے شکایتی لہجے میں دونوں سے بولا۔ ''پچھلی بار تم نے بہت ہی پرانا مال دیا تھا۔ بالکل خستہ ہڈیاں تھیں۔ نکالتے نکالتے بھربھرا کر ٹوٹ گئی تھیں۔''

اس کی بات سن کر ارشد جیسے جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ اس بار مال تازہ ہے۔ شکایت نہیں ملے گی۔'' تھوڑی دیر بعد دانی ناگواری سے اپنا سر جھٹکا اور جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی دونوں نے بھی سونے کی ٹھانی اور وہی میلی سی بوسیدہ چادر بچھا کر لیٹ گئے۔

ارشد کا یہ بہت پرانا پیشہ تھا۔ قبر کھودنا، لیکن پچھلے کچھ

عرصے سے اس نے اپنا یہ پیشہ داغدار کر ڈالا تھا۔ اس لئے کہ اب اس کام سے اس کا گزر بسر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طویل مرض سے لڑتی سسکتی آخر زندگی ہار بیٹھی۔ نا سمجھ تھا۔ اس کے علاج کے لئے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ اور جب اس کو خود اپنی بیوی کی قبر کھودنا پڑی تو اس کے ہاتھ زندگی میں پہلی بار قبر کھودتے وقت کپکپا رہے تھے۔ لیکن جیسے تیسے اس نے اپنی بیوی کی لاش کو دفنایا۔ پھر انہی دنوں جب اس نے اپنے پیشہ کو خیر باد کہنے کا ارادہ کیا تو ایک رات کو موتا دائی اس کے پاس آیا اور اسے ایک پراسرار اور گھناؤنے کام کی ترغیب دیتے ہوئے بولا۔ ''بہت سارو پیہ بھی ملے گا۔'' یہی نہیں بلکہ اسے کام سے پہلے ہی خاصی رقم پیشگی بھی تھمادی تھی۔ اور ارشد نے اپنے ساتھ اپنے بہترین دوست احمد کو بھی ساتھ ملالیا اور وہ بھی نقد رقم پر راضی ہو گیا۔

بس پھر کیا تھا، ارشد نے ایک بار پھر پھاوڑا اور کدال سنبھال لیا تھا۔ لیکن اب وہ مردے دفنانے کے ساتھ ساتھ گھناؤنا کام بھی کرنے لگا تھا۔ وہ رات کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں قبریں کھودتا اور مردوں کی ہڈیاں نکال کر جمع کرنے لگا۔ ٹھیک سات دن بعد وہ دائی آ کر اس سے انسانی ہڈیاں لے جاتا اور ایک خاصی رقم ان دونوں کی جھولی میں ڈال جاتا تھا۔ ارشد پہلے تو یہ سوچ کر اس گھناؤنے کام کی ابتدا کی تھی کہ کچھ رقم جمع کرنے کے بعد وہ یہ دھندا چھوڑ دے گا۔ مگر اب اسے اس کام کی عادت پڑ گئی تھی۔ اور وہ اسے ترک نہ کر سکا۔ بلکہ اب اس نے رفتہ رفتہ کام میں اور تیزی کر دی۔ ایک بار احمد نے موٹے دائی سے یونہی پوچھ لیا تھا کہ وہ ان انسانی ہڈیوں کا کرتا کیا ہے۔ تو جواباً اس نے گھور کر اپنی کرخت لہجے میں کہا تھا۔ ''اپنے کام سے کام رکھو۔'' تاہم پھر اس نے مکروہ ہنسی کے سے انداز میں سرسری بتا بھی دیا تھا کہ ''وہ ان ہڈیوں کو ڈاکٹری پڑھانے والے کالجوں کو فروخت کرتا ہے۔''

اب مال حاصل کرنے کا زیادہ تر انحصار دفن ہونے والے مردوں پر تھا۔ ان کا سارا گوشت ادھیڑنے میں انہیں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ مسئلہ بھی اس ہیبت ناک جانور نے حل کر ڈالا تھا۔ احمد نے جانے کس طرح اسے سیدھا لیا تھا۔ اب جیسے ہی کوئی نئی لاش دفن ہوتی یہ دونوں دوست آدھی رات کے وقت قبر میں پہنچ جاتے۔ وہ جانور بھی ساتھ ہوتا ان کے ہمراہ چیتے کی طرح انگڑائی لیتا ہوا خراماں خراماں چلا آتا اور بڑی صفائی سے قبر کے اندر گھستا اور اپنی تھوتھنی میں مردے کے پاؤں کے انگوٹھے کو دبوچ کر اسے پورے کا پورا باہر نکال لاتا اور جلدی جلدی سارا گوشت چٹ کر جاتا۔ پھر اس کے بعد دونوں دوست ہڈیوں کے اس پنجر کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

یہ درمیانے موسم کی رات تھی۔ ارشد اور احمد دم بہ خود سے بیٹھے پرہول سناٹے میں بیڑی پی رہے تھے کہ اچانک جھونپڑی کے باہر کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں۔ پھر ساتھ ہی کسی نے زور سے پکارا۔ ''ارے بھئی کوئی ہے اندر۔ قبر کھدوانی ہے میت آئی ہے۔''

یہ آواز سن کر دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر ارشد کھانستا ہوا باہر نکلا تو چند لوگوں کو باہر کھڑے پایا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں لالٹین تھیں۔

''کدھر قبر کھدوانی ہے؟'' ارشد نے اپنے لہجے میں بیزاری سموتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھئی ہمیں کیا پتہ۔ جگہ تو تم ہی بتاؤ گے ناں۔'' ایک شخص نے جواباً کہا۔

تو ارشد سر ہلاتا ہوا دوبارہ جھونپڑی میں آیا اور احمد سے بولا۔ ''چل اٹھ لاش آئی ہے۔ اٹھا پھاوڑا۔'' اس کے لہجے میں دبی دبی مسرت تھی اس کے بعد ارشد نے ایک بدنما بانس پر جھولتی ہوئی لالٹین اٹھائی اور باہر آ کر ایک شخص سے بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ ادھر کونے میں ایک جگہ خالی ہے۔'' مذکورہ شخص نے اس کی بات سن کر پھر اپنے ساتھ کھڑے کچھ لوگوں کو میت لانے کا کہا۔ جو انہوں نے قریب ہی رکھی تھی۔ پھر یہ سب لوگ ارشد کے عقب میں چل پڑے۔

پھر مطلوبہ جگہ پہنچ کر یہ رک گئے۔ احمد بھی ان سے آن ملا تھا۔ چند قبروں کے بیچ میں وہ کھڑے ہو گئے۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر غم ناک خاموشی طاری تھی۔ دونوں دوست مل کر قبر کھودنے میں مصروف تھے۔

جب لاش کو لحد میں اتارا جانے لگا تو وہاں چند غم زدہ لوگ بے اختیار رو پڑے۔ لاش کو قبر میں اتارنے کے بعد سب نے مل کر اس پر مٹی ڈالی اور پھر فاتحہ پڑھ کر لوٹ گئے۔

ارشد اور احمد بھی اپنا سامان سمیٹ کر جھونپڑی میں آ گئے۔ دونوں نے تیز پتی کی چائے بنائی اور پی۔ پھر بیڑی سلگا کر دم بہ خود سے بیٹھ گئے۔ وہ شاید اپنی تھکان اتار کر خود کو نئے کام کے لئے دوبارہ چاق و چوبند کر رہے تھے۔

چند لمحوں بعد ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور وہ منحوس شکل والا جانور جھومتا ہوا اندر آ کر دونوں دوستوں کو گھورنے لگا۔ تب ارشد احمد سے بولا۔ ''چل اٹھ اپنا کام کریں۔ پہلے دن کام نمٹانا آسان ہوتا ہے۔''

احمد نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے تھیلا سنبھالتے اٹھ کھڑا ہوا۔ ارشد نے ختم ہوتی ہوئی بیڑی کے جلدی جلدی دو تین کش بھرے اور ٹوٹا پاؤں تلے مسل کر باہر آ گیا۔ احمد بھی لالٹین اٹھائے ساتھ ہو لیا۔

اس جانور کی چندی چندی آنکھوں میں عجیب پراسراری چمک ابھری۔ اور وہ بھی جنگلی بلے کی طرح انگڑائی لے کر چل دیا۔ ذرا دیر بعد ہی یہ سب اسی تازہ قبر کے پاس موجود تھے۔ جانور نے سب سے پہلے اپنا کام سر انجام دیا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ لاش کو انگوٹھے سے اپنے پاؤں میں دبائے قبر سے باہر کھینچ لایا۔ ارشد اور احمد نے جلدی جلدی لاش کا کفن کھولا۔ وہ لاش کسی عورت کی تھی۔ اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ احمد کی جیسے ہی عورت کے چہرے پر نظر پڑی اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ چہرہ ہی ایسا تھا۔ انتہائی حسین اور خوب صورت، ذرا ہاتھ لگے تو میلا ہو جائے۔ ایسا حسین چہرہ اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ ذرا دیر تک بڑی محویت سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا۔ ''کاش کہ یہ زندہ ہوتی۔'' پھر اسے اس کی موت کا بے حد دکھ ہونے لگا۔

ایسے کیا دیکھ رہا ہے، کیا شادی کرے گا اس سے اتار اس کا کفن۔'' معاً اس کی سماعت سے ارشد کی آواز ٹکرائی اور وہ ذرا چونکا۔ اور اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لاش کا کفن اتار دیا۔ ایسے میں احمد کے ہاتھ جب اس عورت کی لاش سے ٹکرائے تو اس کا وجود گرم محسوس ہوا۔

آج سے پہلے کبھی کسی لاش کے وجود میں ایسی گرمی کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس نے جب بھی کسی لاش کو چھوا تھا۔ وہ برف کی طرح سرد اور کڑک ہوتی تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور ارشد سے بولا۔ ''دوست یہ..... یہ زندہ ہے۔''

اس کی بات سن کر ارشد، احمد کو گھور کر قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو..... ہٹ میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ارشد نے لاش کے سینے پر ہاتھ رکھا پھر کان لگائے۔ دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی مگر وہاں اسے سانس محسوس نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے لاش کی ایک آنکھ کھول کر پتلی میں جھانکا اور کھڑا ہو گیا۔ ''پاگل ہو گیا ہے تو، یہ مردہ ہے۔''

مگر احمد نے بھی اپنی تسلی کرنا ضروری سمجھا۔ اب اسے بھی لاش میں زندگی کی ذرا بھی رمق محسوس نہ ہوئی۔ رات دبے پاؤں گزر رہی تھی اور آسمان پر پورا چاند بھی جوبن پر تھا۔ احمد بھی اب سیدھا کھڑا ہنوز محویت کے عالم میں لاش کو تکے جا رہا تھا۔

پھر جیسے ہی اس جانور نے لاش پر جھپٹنا چاہا۔ احمد نے اسے ایک زور کی لات رسید کر دی۔ وہ جانور بلبلاتا ہوا دور جا پڑا۔ قریب کھڑا ارشد، احمد کی اس عجیب جرأت پر چونک سا گیا اور احمد سے درشت لہجے میں بولا۔ ''ارے کیا کرتا ہے۔ کیوں جانور کو مارتا ہے۔ نوچنے دے اس کو گوشت۔''

''نہیں ارشد، میں اس لاش کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ اس بار حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں ارشد، بس میرا جی نہیں چاہ

رہا۔ ایسی خوب صورت عورت کی لاش کی بے حرمتی کرنے کو۔ میں اسے دوبارہ کفن میں لپیٹ کر قبر میں اتار دوں گا۔" احمد نے کہا۔

تو ارشد جھجک کر بولا۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا تو اس لاش پر عاشق ہو گیا ہے۔"

"تو کچھ بھی سمجھ لے ارشد۔ مگر میں اس لاش کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" احمد نے اٹل لہجے میں کہا۔ وہ اب عجیب انداز میں ہانپنے لگا تھا۔

ارشد کو احمد کے پاگل ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر اسے احمد کے چہرے کے ذرا قریب کیا تو وہاں اسے عجیب دیوانگی کے تاثرات نظر آئے۔ ایک لمحے کو اس کا دوست ارشد بھی اپنے دوست احمد کی اس کیفیت پر ڈر سا گیا۔ تاہم وہ چپ ہو گیا اور وہ جانور احمد کی لات کھا کر ایک طرف کو دبک گیا تھا اور احمد کی طرف غصے سے دیکھ رہا تھا۔

احمد نے لاش کو دوبارہ قبر میں اتار دیا۔ اس کے بعد اس نے قریب بیٹھے جانور کو پکڑا اور ارشد کے ساتھ واپس جھونپڑی میں آ گیا۔ سب سے پہلے اس نے جانور کو ایک رسی میں باندھ کر رکھ دیا۔ ارشد بڑے غور سے اور خاموشی سے احمد کی حرکات دیکھے جا رہا تھا۔ احمد چپ تھا۔ اس کے بعد وہ سونے کے لئے زمین پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود احمد کی نظروں سے ایک ثانیے کے لئے بھی اس عورت کی لاش کا خوب صورت چہرہ محو نہیں ہوا تھا۔ رات دبے پاؤں گزر رہی تھی اور جانے کس پہر احمد کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سبب وہ دلدوز چیخ تھی۔ جس نے احمد کو جگا دیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہو۔ چیخ قبرستان کے مشرقی حصے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے دوبارہ وہی لرزہ خیز چیخ جس نے آخر اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا اس نے پہلے اطراف کا جائزہ لیا تو بری طرح چونک پڑا۔

وہاں نہ ارشد تھا اور نہ ہی وہ جانور۔ جسے اس نے ایک جگہ باندھ دیا تھا۔ دونوں کو غائب پا کر احمد ذرا ٹھٹھکا اور پھر جھونپڑی سے نکل کر دیوانہ وار چیخ کی طرف بھاگا۔

وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ کو ٹھٹھکا۔ اس کے قدم مشینی انداز میں ساکت ہو گئے۔ مگر اس کا پورا وجود سر تا پا کپکپا رہا تھا۔ چہرے پر دہشت سمٹ آئی تھی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ سامنے ایک ہولناک منظر موجود تھا۔ وہ منظر ہی ایسا تھا کسی بھی ذی ہوش کے ہوش گم کر دینے والا، اس عورت کی قبر ادھڑی پڑی تھی۔ اور اس قبر سے اس حسین عورت کی لاش نکالی جا چکی تھی۔ جو پاس ہی بے سدھ انداز میں چاروں شانے چت مگر صحیح سالم پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر زیادہ کریہہ انگیز اور دل ہلا دینے والا منظر ایک اور تھا۔ اس لاش کے ذرا پرے احمد کا پالتو جانور مٹی میں پڑے بے جان جسم کو بری طرح نوچ رہا تھا۔ اور وہ بے جان لاشہ کوئی اور نہیں اس کے دوست ارشد کا تھا۔

احمد کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا پالتو جانور اس کے دوست کی ایسی حالت بھی کر سکتا ہے۔

احمد اس منظر سے خوفزدہ ہو کر واپس دوڑا۔ اور آخر اپنی جھونپڑی میں آ کر دم لیا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی غرض سے لمبے لمبے سانس لینے لگا کہ اچانک باہر آسمان پر بادل کی خوفناک گڑگڑاہٹ گونجی۔ اور آن کی آن میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ٹاٹ کا پردہ تیز ہواؤں کے ساتھ ٹوٹ کر اندر بوسیدہ فرش پر آ پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ احمد کو بری طرح ایک انجانے خوف نے جکڑ لیا تھا۔

اپنے دوست کی موت اور اس کی لاش کو جانور کی خوراک بننے کا دکھ بھی جانے کدھر دب گیا تھا۔ اپنے دوست کے عبرتناک انجام کے بارے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اب بجلی بھی کڑکنے لگی تھی۔

اور ساتھ بدروحوں کی طرح چیختی چلاتی ہواؤں نے جانے کیوں اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔ وہ کسی انجانے اور ناقابل یقین بیان خوف کے زیر اثر کپکپا رہا تھا۔

لالٹین کب کی بجھ چکی تھی۔ البتہ چمکنے والی بجلی کی تیز

روشنی میں جھونپڑی کے کھلے چوکھٹے کا روشن سایہ بڑا پراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ معاً پھر کیا ہوا۔ احمد کی سہمی ہوئی خوفزدہ نگاہوں نے جھونپڑی کے دروازے پر کسی کا سایہ دیکھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ذرا آگے کھسک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ تو جیسے بت بن گیا۔ جھونپڑی کے دروازے پر اس حسین عورت کی لاش کھڑی تھی۔ کفن میں لپٹی زندہ لاش...... آنکھیں اس کی بند تھیں۔ مگر اس کے باریک گلابی ہونٹ پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

احمد کا تو جیسے دل رک گیا۔ سانس بھی اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھیں۔ آنکھیں مارے دہشت کے اس قدر پھیل گئی تھیں جیسے ابھی حلقوں سے باہر ابل پڑیں گی۔

دفعتاً بجلی کا زوردار کڑکا ہوا اور لاش نے یکدم اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ادھر احمد اس دہشت ناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گرتا چلا گیا۔

طوفان بادوباراں کے بعد قبرستان میں سناٹے اور ہو کا عالم کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اطراف کی قبروں پر ٹنڈ منڈ پیڑوں کی سوکھی شاخوں سے بارش کا پانی قطروں کی صورت میں ٹپک رہا تھا۔ رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔

چاندنی میں ایک سایہ قبرستان کے شکستہ گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ یہ جھکی جھکی کمر والا ایک باریش بزرگ تھا۔ جس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ اس بوڑھے کے چہرے پر قدرے تشویش اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ اس کی سفید گھنی بھنوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں متلاشی انداز میں ادھر ادھر گھور رہی تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں لاٹھی نما عصا تھا، جسے وہ قبرستان کی گیلی مٹی پر ٹیکتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ پھر وہ ایک کھلی ہوئی کیچڑ زدہ قبر پر پہنچ کر رک گیا۔ اور بڑے غور سے قبر کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اسی حسین عورت کی قبر تھی۔

جس کے قریب ہی ایک انسانی پنجر بھی پڑا تھا۔ یہ احمد کے بدنصیب دوست ارشد کی لاش تھی۔ جس کا سارا گوشت جانور کھا گیا تھا۔ اب جانور بھی مردہ حالت میں تھا۔

اس حسین عورت کی لاش غائب تھی۔ اس بوڑھے کی آنکھوں میں اب تشویش کے سائے مزید گہرے ہو گئے تھے۔ پھر اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز ابھری۔ "یہ بہت برا ہوا۔ روزی کو کس نے قبر سے نکالا۔ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یا اللہ حق کی خیر فرما۔ باطل کو رسوا کر۔"

اس کے بعد وہ بزرگ لاٹھی ٹیکتا ہوا غیر معمولی تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ پھر وہ احمد کی جھونپڑی کے پاس آ کر رک گیا۔ اس کے بعد جب وہ جھونپڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے زمین پر ایک انتہائی حسین عورت بیٹھی احمد کا سر اپنی گود میں لئے اسے ہوش میں لانے کے جتن کر رہی تھی۔ جب اس بزرگ پر اس عورت کی نگاہ پڑی تو وہ بری طرح چونک گئی۔ "روزی یہ شخص معصوم ہے۔ چھوڑ دے اسے اور چلی جا یہاں سے۔" بزرگ نے درشت لہجے میں اس عورت کو مخاطب کر کے کہا۔

روزی یہ وہی عورت تھی جسے دیکھ کر احمد بے ہوش ہو گیا تھا۔ بزرگ کی بات پر روزی کے سرخ و سفید اور حسین چہرے پر برہمی پھر یکلخت معنی خیز تاثرات ابھرے۔ اور پھر اس نے آہستگی کے ساتھ پہلے اپنی گود سے احمد کا سر زمین پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے جسم پر کفن کے بجائے زرق برق لباس نظر آ رہا تا۔ وہ بزرگ کو گھورتی ہوئی بولی۔ "تم ہار گئے ہو شاہ جی۔ بہتر یہی ہے کہ تم خاموشی کے ساتھ چلے جاؤ تمہارا اور ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

"شیطان عورت، میں اس معصوم انسان کو تم لوگوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ دفع ہو جا یہاں سے۔" بزرگ نے پرجلال لہجے میں کہا۔ پھر دفعتاً ہی بزرگ کو اپنے عقب میں ایک قہقہہ سنائی دیا۔ وہ جلدی سے اپنے عقب میں گھوما تو چونک گیا۔ جھونپڑی کے دروازے پر ایک دراز قد اور سیاہ رو شخص موجود تھا۔ اس نے گیرو رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے سیاہ ماتھے پر تلک تھا۔ اس کی گول گول قدرے ابلتی ہوئی

www.aiourdubooks.net

آنکھوں میں شیطانی چمک اور کالے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ قہقہہ اس نے ہی لگایا تھا۔ اس نے کھرکھراتے لہجے میں بزرگ سے کہا۔ ''شاہ جی اپنی شکست تسلیم کرلو۔ تمہاری لاکھ کوشش کے باوجود روزی کو اب آتما شکتی مل چکی ہے۔ اب اس کا کچھ بھی نہیں بگڑ سکتا۔''

''شیطان کی رسی خدا دراز ضرور کرتا ہے۔ پر چھوڑتا نہیں ہے۔ تم لوگوں کا انجام بھی اب قریب ہی ہے۔'' شاہ جی نے پجاری کو گھورتے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنا عصاء سنبھالتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

بزرگ کے جاتے ہی پجاری اور روزی نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ان کے چہروں پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ تب وہ پجاری روزی سے بولا۔ ''تمہاری نئی زندگی ملنے کی مبارک باد دیتا ہوں۔ اب تمہارا کام آسان ہوجائے گا۔''

''ہاں کرشن پجاری یہ سب تمہاری کوشش کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے مجھ جیسی ایک عام عورت سے بڑا بھلا کیا ہے۔ اب میں اپنے دشمنوں سے اچھی طرح سے بدلا لے سکوں گی۔'' روزی نے پجاری سے کہا۔ مگر اس کے انداز سے آتش انتقام کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''نہیں روزی اس میں تمہاری کوشش بھی شامل تھی۔'' پجاری نے کھردری آواز میں کہا۔ ''لیکن روزی تمہیں پھر بھی اس بزرگ شاہ جی سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ وہ اب بھی تمہیں باندھنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے اس قبرستان کے گرد ایک حصار کھینچ دیا ہے اور تم حصار توڑ کر یہاں سے نہیں نکل سکتی۔ تم اس لڑکے سے نہایت چالاکی سے کام لینا اور براہ راست شاہ جی سے ٹکرانے کے بجائے، آگے رکھنا احمد کو۔''

پجاری کی بات سن کر روزی کے حسین چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ ایک نگاہ بے ہوش پڑے احمد کی طرف دیکھ کر پجاری سے بولی۔ ''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں اسے اپنی حسین زلفوں کے جال میں اس طرح جکڑ لوں گی کہ یہ خود شاہ جی کے خون کا پیاسا ہوجائے گا۔ تم ابھی جاؤ۔ کہیں اس کو ہم پر شک نہ ہوجائے۔ میں اسے ہوش میں لانے کے بعد کام پر لگاؤں گی۔'' روزی کی بات سن کر پجاری اپنے کالے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتا ہوا چلا گیا۔

احمد کی آنکھ کھلی تو صبح نمودار ہوچکی تھی۔ وہ اپنے سامنے ایک حسین عورت کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ اس حسین عورت کو پہچان گیا تھا۔ پہلے تو اسے اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھ کر خوف زدہ ہوا۔ مگر پھر ایک خیال کے تحت اس کا دل خوشی سے پاگل ہوگیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس خوب صورت عورت کی آنکھوں میں آنسو اترے ہوئے ہیں اور اس کے دلکش چہرے پر دکھ کے تاثرات پھیلے ہوئے ہیں۔ اب وہ عورت سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ احمد اسے روتا دیکھ کر بے چین سا ہوگیا اور فوراً اٹھ کر اس کی جانب بڑھا اور بولا۔

''ت..... تم کون ہو اور کیوں رو رہی ہو؟'' روزی نے اپنی نم ناک پلکیں اٹھا کر احمد کی طرف دیکھا اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''میرا نام روزی ہے۔ میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ کیا تم میری مدد نہیں کرسکتے؟''

اس کی بات سن کر احمد کا دل بے اختیار ہوگیا اور وہ اپنا کپکپاتا ہوا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔''

سچ روزی نے یک دم خوش ہوکر کہا اور احمد کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لے لیا۔ ایک حسین و جمیل عورت کا ساتھ احمد کو شاداں کئے دے رہا تھا۔ روزی اپنے چہرے پر غمناکی طاری کرتے ہوئے بتانے لگی۔ ''میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں اور مجھ سے دھوکے سے ایک عاصم نامی شخص نے شادی کرلی تھی اور جب اس کا دل مجھ سے بھر گیا تو اس نے مجھے اپنی دانست میں مار دیا تھا مگر میں بچ گئی۔ مجھے مردہ سمجھ کر اس نے یہاں زندہ گاڑ دیا لیکن.....'' اتنا کہہ کر وہ دوبارہ سسکنے لگی۔

احمد کا دل بھر آیا اور وہ ملائمت سے بولا۔ ''ٹھیک

ہے میں تمہاری مدد کروں گا..... ؟''

عاصم کا ایک بزرگ جاسوس میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس نے مجھے یہاں زندہ سلامت دیکھ لیا ہے۔ اب وہ عاصم کو ساری بات بتادے گا اور پھر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ بزرگ جادو کا ماہر ہے۔''

''تم مت گھبراؤ، میں ہوں نا، میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی قربان کردوں گا۔'' احمد نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

اور روزی کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں اور وہ احمد کے اور قریب ہوگئی۔ احمد اس کی گھنی زلفوں کے ہوشربا مہک سے بے حال ہونے لگا۔ ''کیا تم مجھ سے شادی کرو گے احمد، مجھے ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم جیسے بہادر نوجوان کی بیوی بن کر میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

اس کی بات سن کر احمد پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ خواب و خیال میں بھی ایسی حسین عورت کو حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ ''ہاں میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

روزی کے ہونٹوں پر جواباً مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھر آئی۔ مگر پھر وہ اپنے لہجے میں تشویش لاتے ہوئے بولی۔ ''مگر مجھے اس بزرگ سے ڈر لگتا ہے۔ اس نے مجھ پر عمل کرکے اس قبرستان کی چار دیواری میں قید کردیا ہے۔ ظاہر ہے۔ ہماری شادی اس قبرستان میں تو نہیں ہوسکتی ناں۔ یہ کام تو یہاں سے نکلنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔'' روزی نے نہایت مکارانہ انداز میں کہا۔

اور احمد کی غصے کے مارے سانس پھولنے لگی۔

احمد جوشیلے لہجے میں اپنا سینہ تان کر بولا۔ ''روزی تم فکر نہ کرو میں ہوں ناں۔ میں اس بزرگ سے اچھی طرح نمٹ لوں گا۔'' اس کی بات سن کر روزی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر ذرا دیر بعد احمد قدرے شرماتے ہوئے انداز میں بولا۔ کیا واقعی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' احمد کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ اس جیسی حسین و جمیل عورت اس کی بیوی بننے کو تیار تھی۔

احمد کی بات پر روزی نے خاص ادا کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور احمد نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں خمار آلود پیار دیکھ کر اپنی نظریں نیچے جھکالیں۔ تو روزی ہنس کر بولی۔ ''احمد میری بات کا یقین کرو۔ میرا بس چلے تو میں ابھی تمہارے ساتھ جا کر شادی کرلوں۔ مگر جب تک وہ بزرگ ختم نہیں ہوجاتا۔ ہماری شادی نہیں ہوسکتی۔''

ٹھیک ہے، تم بے فکر رہو، اسے آنے دو، میں اس سے نمٹ لوں گا اچھی طرح۔'' احمد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ درحقیقت وہ اب بڑی سنجیدگی کے ساتھ شاہ جی سے نمٹنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ احمد کا دل بے چین ہوا جارہا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے روزی سے کہا۔ ''روزی ہوسکتا ہے کہ اس بزرگ نے تمہیں ایسے ہی ڈرایا ہو۔''

''آؤ، میرے ساتھ ہم ابھی یہاں سے نکل چلتے ہیں۔'' روزی نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔ ایک ٹائنے اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگئی۔ احمد اور روزی دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قبرستان کے شکستہ گیٹ پر پہنچ کر رک گئے۔ احمد نے چونک کر روزی کی طرف دیکھا۔ روزی کے حسین چہرے پر عجیب سا خوف اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ رک کر خوفزدہ نظروں سے نیچے زمین کی طرف تکنے لگی۔

''کیا ہوا روزی آؤ۔ ڈرو نہیں، میں ہوں ناں ساتھ۔'' احمد نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

روزی نے ڈرتے ڈرتے ایک قدم گیٹ سے باہر نکالا تو اگلے ہی لمحے وہ تیز چیخ کے ساتھ اچھل کر پیچھے کی جانب یوں جا پڑی جیسے اس کو کسی نے زور سے دھکا دیا ہو۔

احمد بھی ایک لمحے کو پریشان سا ہوگیا۔ روزی کو یوں گرتے دیکھ کر وہ بھی کافی حد تک خوفزدہ ہوگیا تھا۔ مگر ایک خوب صورت عورت کے سامنے وہ اپنا خوف ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی اس عورت کے سامنے جو اس سے شادی

www.paksociety.com

پر تیار تھی۔ لہٰذا وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بجلی کی سرعت کے ساتھ زمین پر گری روزی کی طرف لپکا۔ پھر اس نے روزی کو سنبھالنے کے دوران دیکھا کہ اس کا ایک پاؤں ایڑی کی طرف سے جھلس کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ روزی کے گورے پاؤں کی یہ حالت دیکھ کر پہلی بار احمد کے دل و دماغ میں اس شاہ جی کے خلاف نفرت کا الاؤ سلگا۔

''دیکھ لیا نا تم نے اس بزرگ نے کس طرح اپنے عمل کے ذریعے میرا یہاں سے نکلنا بند کردی ہے۔ اگر میں نے پھر دوبارہ اس قبرستان سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو جل کر راکھ ہوجاؤں گی۔'' روزی نے روہانسی آواز میں کہا۔

اور احمد کو یہ کیونکر منظور ہوتا کہ اس حسین عورت کا یہ حشر ہو۔ لہٰذا اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور دل ہی دل میں اس بزرگ کو ٹھکانے لگانے کے عملی منصوبے پر غور کرنے لگا۔ ''میں اسے اب ہلاک کر کے ہی دم لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔'' احمد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اور روزی کو سہارا دیتے ہوئے واپس جھونپڑی میں لے آیا۔ اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''روزی ایک بات تو بتاؤ، کیا مجھ جیسا ایک عام آدمی اس بزرگ کو ہلاک کر سکے گا؟''

''بالکل تم یہ کام کر سکتے ہو بلکہ تم اس کو ہلاک کرنے کی سکت رکھتے ہو۔'' اس کی بات پر روزی فوراً بولی۔

''یہ ضروری ہے احمد کیونکہ اس شاہ جی کے مرنے کے بعد ہم دونوں شادی کر سکتے ہیں۔''

احمد اب سنجیدگی سے شاہ جی کو قتل کرنے کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔

دوسرے دن احمد اور روزی آپس میں میٹھی باتوں میں مشغول تھے۔ روزی اب اسے پوری طرح شاہ جی کے قتل پر آمادہ کر چکی تھی۔ پھر روزی سرسراتے لہجے میں احمد سے بولی۔ ''احمد کوئی اس طرف آرہا ہے۔ شاید وہی شاہ جی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جھونپڑی سے باہر آگئی اور احمد بھی باہر نکل آیا۔

سامنے شاہ جی موجود تھے۔ جو قہر آلود نظروں سے روزی کو گھورے جارہے تھے۔ پھر مکار روزی نے دھیرے سے پاس کھڑے احمد سے سرگوشی کی۔ ''احمد ہوشیار ہوجاؤ۔''

یہ سننے کی دیر تھی کہ احمد غصے سے پھنکتا ہوا جھونپڑی کے اندر آگیا اور اس نے اپنی کدال اٹھائی۔ اسے اچانک باہر سے روزی کی گڑگڑانے کی آواز آئی۔ وہ شاید شاہ جی سے مخاطب تھی۔ ''میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں اب احمد کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔'' احمد روزی کی گریہ وزاری پر کڑھنے لگا اور ساتھ ہی اس کا غصہ بھی سوا ہونے لگا۔ اس وقت اسے باہر سے شاہ جی کی قہر آلود آواز سنائی دی۔ وہ روزی سے کہہ رہے تھے۔ ''اپنی گندی زبان کو لگام دے۔ تو ایک شیطانی روح ہے اور جہنم تیرا مقدر ہے۔''

تب احمد نے بنا سوچے سمجھے اپنی کدال اٹھائی اور آن کی آن میں وہ شاہ جی کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ شاہ جی کچھ سمجھتے۔ احمد نے دونوں ہاتھوں سے کدال پوری قوت سے شاہ جی کے سر پر دے ماری۔ کدال کے وار سے شاہ جی کی کھوپڑی چیخ گئی۔ اور جب وہ تیورا کر زمین پر گرے تو بے اختیار ان کے لبوں سے ''اللہ اکبر'' نکلا وہ مر چکے تھے۔ شاہ جی کی زبان سے اللہ اکبر سن کر احمد بری طرح لرز گیا۔ اس کا غصہ اب ہوا ہونے لگا۔ کدال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس پر ہیبت ناک کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ مگر اس کے عقب میں کھڑی روزی کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔

وہ بولی۔ ''جلدی کرو شاہ جی کی لاش کو کھود کر دفنادو۔''

احمد روزی کی بات سن کر چونکا۔ پھر الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔ ''روزی تم تو کہتی تھیں کہ شاہ جی کالے جادو کا ماہر تھا۔ مگر مرتے وقت انہوں نے اللہ اکبر کیوں کہا تھا؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے روزی کو یک دم پریشان کر ڈالا تھا۔ تاہم وہ احمد کی جانب نشیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''احمد تم واقعی بہت سیدھے انسان ہو۔

یہ بھی اس شاہ جی کی ایک چال تھی۔ تمہارا ذہن بھٹکانے اور مجھ سے بدلہ لینے کے لئے، تم بھول گئے، مجھے بھی ایک ایسے ہی آدمی نے لوٹا تھا اور جب مجھے اس کی اصلیت کا پتہ چلا تو اس نے شاہ جی کی مدد سے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔'' روزی نے کہا۔

روزی اپنے لہجے میں دنیا جہان کی شیرینی سمیٹتے ہوئے دوبارہ بولی۔ ''احمد اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں تو ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں اس دھوکے باز عاصم کے گھر لئے چلتی ہوں۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ مجھے دیکھ کر اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟'' روزی کی بات سن کر ایکا ایکی احمد کو احساس ہوا کہ اس نے یہ بات کہہ کر شاید روزی کا دل دکھایا تھا۔

اور اس پر شبہ کیا تھا۔ لہٰذا وہ روزی کا دل رکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''مجھے تم پر اور تمہاری محبت پر پورا یقین ہے اب تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔'' روزی کی آنکھیں اس بات پر یکدم چمک اٹھیں۔

☆.....☆.....☆

''بدھائی ہو روزی..... تمہاری راہ کا سب سے بڑا کانٹا شاہ جی بھی نکل گیا۔ اب تم اپنے دشمنوں سے جی کھول کر انتقام لے سکتی ہو۔'' کرشن پجاری نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ اور جواباً روزی کے دلکش ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ اس وقت رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں چارپائی پر پڑا احمد خراٹے لے رہا تھا۔ اور روزی دروازے کے پاس پجاری کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ بولی۔ ''ہاں کرشن اب عاصم اور اس کی چہکتی بیوی صوفیہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکتے۔ میں تو سب سے پہلے اس کے بچے دلشاد کو ماروں گی اور ان دونوں کی نظروں کے سامنے، پھر میں ان دونوں کو سسکا سسکا کر ماروں گی۔'' یہ کہتے ہوئے روزی کا حسین چہرہ بھیانک ہوتا چلا گیا۔

پجاری اس کی شکل تبدیل ہوتے دیکھ کر بولا۔ ''اچھا اب تم اس احمق احمد سے جان چھڑالو۔ اس سے ہم نے جو کام لینا تھا وہ لے لیا۔ اب اس کا کانٹا صاف کردو۔''

''نہیں کرشن ابھی مجھے اس سے اور کام بھی لینے ہیں۔ شہر جانے کے لئے مجھے اس کے سہارے کی ضرورت ہے۔'' روزی نے کہا۔ اور پھر ذرا دیر بعد کرشن اثبات میں سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

احمد کے اطراف میں گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اسے اپنا وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر معاً اسے دھند میں ایک نورانی چہرہ نظر آیا۔ جسے دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ یہ نورانی چہرہ شاہ جی کا تھا اور باریش چہرے پر بلا کا سکون چھایا ہوا تھا۔ پھر ان کے ہونٹ متحرک ہوئے وہ احمد سے مخاطب تھے۔ ''بیٹے میں نے تمہیں اپنا خون معاف کیا اور اللہ تعالیٰ بھی تم پر رحم فرمائے۔'' شاہ جی کے الفاظ سے احمد کے دل میں اب خوف کے بجائے ایک درد سا سمٹ آیا۔ پچھتاوے کا درد، پھر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ یہ احساس اور آنسو ندامت کے تھے۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں واضح طور پر ارتعاش تھا۔ ''بابا مجھے معاف کردیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔ میں نے ایک عورت کی خاطر آپ کی جان لی۔''

''میری بات غور سے سنو۔'' دفعتاً شاہ جی نے احمد کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بھی وقت ہے۔ ہوشیار ہوجاؤ۔ وہ چالاک عورت درحقیقت ایک دھتکاری ہوئی بدروح ہے۔ تمہیں بڑی چالاکی کے ساتھ اس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ورنہ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مل کر سب سے پہلے عاصم، اس کی بیوی صوفیہ اور اس کے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ مگر اس کے انتقام کی آگ پھر بھی سرد نہ ہوگی۔ اور پھر وہ نئے نویلے شادی شدہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو اپنے نہ ختم ہونے والے انتقام کا نشانہ بناتی رہے گی۔ مگر تم ایسا نہیں ہونے دینا۔ اس نیک کام میں تمہاری بخشش ہے۔'' شاہ جی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔

تو احمد جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''بابا میں ایسا ہی کروں

گا۔ اس عورت کو ختم کر کے ہی رہوں گا۔ لیکن بابا کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ روزی ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ آخر ہے کون، وہ اپنا انتقام لینے کے لئے کیوں بے چین ہے؟''

''ہاں تمہیں یہ بتانا ضروری ہے تاکہ تم اس کی حقیقت جان لو۔ لیکن سب سے پہلے یہ جان لو کہ وہ عاصم کی بیوی تھی۔ پھر اس کی اپنے شوہر کے ساتھ نہیں۔ اس میں بھی زیادہ قصور خود روزی کا تھا۔ وہ ایک آزاد خیال عورت تھی جبکہ عاصم بہت شریف تھا۔ اس کی فرنیچر کی بہت بڑی دکان ہے۔ بہرحال اس نے روزی کے کرتوتوں سے تنگ آ کر اسے طلاق دے دی اور صوفیہ سے دوسری شادی کر لی۔ روزی غم و غصہ سے پاگل ہو گئی۔ پھر نجانے کس طرح اس نے کرشن پجاری سے راہ رسم بنا لئے۔ کرشن پجاری ایک شیطان صفت انسان ہے۔ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ اس نے روزی کو آتما طاقت دلانے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آتما طاقت حاصل کرنے سے پہلے ایک شرط پوری کرنا ہوگی۔ یعنی روزی کو خود اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا ہوگا تاکہ وہ دوبارہ ایک نیا جنم لے سکے۔'' اور روزی نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

پھر کرشن نے روزی کے مردہ جسم پر عمل کیا۔ لیکن میں اس کی راہ میں آ گیا۔ مگر تمہاری نادانی کی وجہ سے روزی دوبارہ زندہ ہو گئی۔ جس کی سزا تمہارے دوست ارشد نے بھی بھگت لی اور بعد میں روزی نے بڑی چالاکی سے تمہیں بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور میرا ابھی خاتمہ کر ڈالا۔ مگر اب تم ہوشیار رہنا۔ روزی اب کسی بھی وقت تمہیں ہلاک کر سکتی ہے۔'' شاہ جی نے اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

احمد یہ ساری کہانی سن کر بڑا حیران و پریشان ہوا وہ بولا۔ ''بابا میں اب روزی کا کس طرح مقابلہ کروں گا۔ کیونکہ وہ روح ہے۔''

احمد کی بات سن کر شاہ جی نے کہا۔ ''اس کے لئے اب تمہیں بھی چالاکی اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا؟ تم ایسا کرنا کہ قبرستان کے باہر فلاں جگہ میری کٹیا ہے وہاں تمہیں ایک تعویذ ملے گا تم سب سے پہلے اسے اپنے دائیں بازو پر باندھ لینا۔ اس کے بعد کسی طرح عاصم کے گھر جانا اور اسے روزی سے خبردار کرنے کی کوشش کرنا۔ پھر اس قبرستان کے باہر ایک گڑھا کھودنا اور روزی کو اس کے اندر دھکیل کر اسے آگ لگا دینا، اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے بھسم ہو جائے گی۔'' اس کے بعد شاہ جی کا وجود غائب ہو گیا۔

احمد نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھولیں تو اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر پھر ذہن میں ذرا زور دینے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے اور شاہ جی سے خواب میں ملا تھا۔ پہلے تو اسے اپنے خواب کا یقین نہ آیا۔ پھر دھیرے دھیرے اسے یقین ہونے لگا کہ اس کا خواب بالکل سچا ہے۔ تب اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ شاہ جی کی بات پر ضرور عمل کرے گا۔ اسے اب اپنے کئے پر پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ اس نے بے گناہ شاہ جی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ لیکن اب وہ اپنے اس بھیانک جرم کا ازالہ روزی کو ہلاک کر کے کرنا چاہتا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو روزی اس کے قریب ہی تھی۔ احمد نے اس کو ذرا بھی شک نہ ہونے دیا کہ اس کے ساتھ اس طرح پیش آیا ہے۔ جیسے وہ اس کا دیوانہ ہو۔ اس کے بعد احمد..... چالاکی کے ساتھ قبرستان سے باہر نکل آیا اور اکیلا شاہ جی کی بتائی ہوئی کٹیا کی طرف چل دیا۔ کٹیا میں پہنچ کر اس نے وہ تعویذ ڈھونڈا اور اسے فوراً اپنے دائیں بازو میں باندھ کر اوپر قمیض پہن لی۔ اب اس نے اسی وقت شہر جا کر عاصم سے ملنے کا ارادہ کیا اور سیدھا شہر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

شاہ جی نے خواب میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ مطلوبہ جگہ پہنچ کر بس سے اترا۔ عاصم کا گھر احمد ڈھونڈنے لگا۔ اس دوران اچانک اسے شک گزرا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ ایک لمبا اور موٹا کالا شخص تھا۔ کئی بار اس شخص کو اس نے اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا۔

یہ کرشن پجاری تھا۔ مگر احمد اسے نہیں پہچانتا تھا۔ اس لئے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دیا۔ اور آخر تھوڑی دیر بعد عاصم دروازے پر کھڑا کال بیل بجا رہا تھا۔

دروازہ ملازم نے کھولا تھا۔ سر سے پاؤں تک احمد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''میں عاصم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' احمد نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں میں ان کا انتظار کر لوں گا۔ دراصل مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''اس وقت صرف ان کی بیوی گھر پر موجود ہیں۔ تم پھر کسی وقت آنا۔'' ملازم نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

اور واپس مڑنے لگا تو احمد نے کہا۔ ''مجھے ان کی بیوی سے ملوا دو۔'' اس کی بات سن کر ملازم نے ایک بار پھر رک کر احمد کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر بولا۔ ''ارے بھائی تمہیں صاحب سے بات کرنی ہے ان کے آنے کا انتظار کرو۔ اب یہاں سے جاؤ۔''

احمد کو اس کے انداز پر غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو مجھے جو تمہارے صاحب سے ضروری بات کرنی ہے۔ وہی بات ان کی بیوی سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ بعد کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔''

ابھی احمد نے اتنا ہی کہا تھا کہ اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ ''حیدر کون ہے باہر؟''

''بی بی جی کوئی اجنبی سا آدمی ہے کہتا ہے کہ مجھے صاحب سے بہت ضروری کام ہے۔ مجھے تو کوئی بھکاری دکھائی دیتا ہے۔'' ملازم نے احمد کو دیکھتے ہوئے کہا تو احمد کا ایک بار پھر خون کھولنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ احمد اس ملازم کو آڑے ہاتھ لیتا۔ اندر سے وہی نسوانی آواز ابھری۔ اس نے حیدر کو سرزنش کی۔ ''بری بات حیدر ایسا نہیں کہتے۔ ہٹو میں دیکھتی ہوں۔'' اور تب حیدر کے عقب سے دبلی پتلی خوب صورت عورت دکھائی دی اور اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا جو کہ بہت ہی پیارا تھا۔

احمد نے اسے سلام کیا پھر بولا۔ ''مجھے آپ کے شوہر عاصم صاحب سے بات کرنی ہے بہت ضروری ہے، کیا آپ ان کی بیوی ہیں؟''

''ہاں میں ان کی بیوی ہوں، کہو کیا بات کرنی ہے۔''

احمد اندازہ لگا چکا تھا کہ یہی عورت صوفیہ ہے۔ جس سے عاصم نے دوسری شادی کی تھی، وہ صوفیہ کی بات سن کر تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کس طرح سے بات شروع کرے اور وہ بھی دروازے پر موجود کھڑے کھڑے تاہم اس بات کا اندازہ لگاتے ہوئے صوفیہ نے احمد کو اندر بلا لیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

احمد ملازم کے ساتھ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا۔ عاصم کا گھر کافی بڑا اور خوب صورت تھا۔ احمد ایک صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ہی صوفیہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے اب ایک پھول دار چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ ایک صوفے پر براجمان ہو گئی اور اور احمد کی طرف دیکھنے لگی۔

احمد نے گلا صاف کیا پھر بولا۔ ''میرا نام احمد ہے، میں دراصل آپ لوگوں کو ہوشیار کرنے آیا ہوں، کوئی آپ لوگوں کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ اور وہ۔ وہ۔'' احمد نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاس کھڑا حیدر اسے گھورتے ہوئے صوفیہ سے بولا۔ ''بی بی جی مجھے تو یہ کوئی بہروپیا لگتا ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ ہی اس کو اندر بلا لیا۔''

''تم خاموش رہو حیدر۔'' صوفیہ نے ایک بار پھر حیدر کو جھڑکا۔

وہ خلاف توقع ایک بہادر اور نڈر خاتون تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر احمد کی بات سے پریشانی سی نظر آنے لگی تھی۔ تاہم اس نے پوچھا۔ ''کھل کر بات کرو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ اور تم ہمیں کس سے اور کیوں خبردار کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے۔'' صوفیہ کے منہ سے سوالات کی یلغار نے احمد کو ایک لمحے کے لئے بدحواس کر دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ ذرا سنبھلا اور پھر تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد آخر اس نے ساری کہانی صوفیہ کے گوش

www.paksociety.com

گزار کردی۔ حسب توقع وہاں موجود حیدر کو اس کہانی پر ذرا یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن صوفیہ کے چہرے پر یکدم خوف اور پریشانی کے تاثرات ابھر آئے۔

حیدر پھر احمد کے بارے میں کچھ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمت نہ کرسکا۔

بہرحال صوفیہ کے چہرے سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس نے احمد کی کہانی کو جھٹلایا نہیں ہے اور کافی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔

اچانک گھر کی بیل گنگنا اٹھی۔ ''لو صاحب بھی آگئے۔ اچھا ہی ہوا۔'' حیدر معنی خیز لہجے میں بولا اور دروازے کی طرف لپکا۔

تھوڑی دیر بعد ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس خوبرو شخص اندر داخل ہوا۔ تو وہ احمد کو ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے اسے کھا جائے گا۔ احمد کو اندازہ ہوگیا کہ حیدر نے ہی اس کے کان بھرے ہوں گے۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا لینے آئے ہو۔'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس دوران صوفیہ اور احمد بھی کھڑے ہوچکے تھے۔ احمد بے چارہ عاصم کے اس رویے پر بوکھلا سا گیا تھا۔ ''مم میں وہ.....'' اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ عاصم کرخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''اے مسٹر میں تم جیسے چکوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

عاصم کی بات سن کر صوفیہ نے اپنے شوہر سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر عاصم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بھی چپ رہنے کو کہا۔ احمد کا کام پورا ہوچکا تھا۔ اور وہ وہاں سے نکل آیا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے عاصم کی بیوی کو صورت حال سے خبردار کردیا تھا۔ اور وہ یقیناً بعد میں آرام سے اپنے شوہر کو بھی قائل کرلے گی۔''

☆.....☆.....☆

''روزی میں نے خود اپنی آنکھوں سے احمد کو عاصم کے گھر جاتے دیکھا ہے۔'' کرشن پجاری نے سامنے کھڑی روزی سے کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی کا عنصر غالب تھا۔ ''سمجھ میں بھی نہیں آرہا۔ آخر احمد یوں اچانک عاصم کے گھر کیوں جا پہنچا۔''

''اسے تو اس کا گھر بھی معلوم نہ تھا۔'' روزی نے بھی پریشان ہوکر کہا۔

اس کی بات سن کر کرشن نے قدرے توقف کے بعد پرخیال انداز میں کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ احمد کو کسی نے بہکایا ہے۔''

''لیکن کرشن کیا تم اس بات کا کھوج نہیں لگا سکتے کہ احمد، عاصم کے پاس کیا لینے گیا تھا۔''

''اس میں اب کیا شک رہ جاتا ہے سیدھی سی بات ہے۔ کہ وہ عاصم کے گھر والوں کو تم سے خبردار ہی کرنے گیا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ پہلے چالاکی سے احمد سے پوچھنے کی کوشش کرو کہ وہ آج سارا دن کہاں غائب رہا ہے۔ اگر وہ جھوٹ بولے تو سمجھ جانا کہ وہ تمہاری اصل حقیقت سے واقف ہوچکا ہے۔ تب پھر اس کے ساتھ سختی سے نمٹ لیں گے۔ بعد میں وہ خود ہی اگل دے گا۔'' کرشن نے روزی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اور جواباً روزی پرخیال انداز میں اپنے سر کو ہلانے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شعلے رقصاں ہونے لگے تھے۔ اس کے چہرے سے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ آج احمد کا حساب بے باک کردے گی۔

اس دوران احمد بھی آن پہنچا۔ اپنی جھونپڑی میں ایک پجاری کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ ''تم کہاں گئے تھے؟'' روزی نے احمد کو گھورتے ہوئے کہا تو احمد نے غور سے روزی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے آج روزی کچھ بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لہجے پر وہ متحیر بھی ہوا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ کہیں روزی کو اس پر کسی قسم کا شک تو نہیں ہوگیا۔ لیکن اب احمد کو بھی اس کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

اس لئے وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے بولا۔ ''ایسے ہی ذرا شہر گیا تھا۔ گھومنے کو جی چاہا تھا آج۔''

''تم شہر گھومنے گئے تھے یا عاصم کے گھر۔'' روزی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو احمد کا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے اندازہ ہونے لگا کہ اب کسی

بھی وقت کچھ ہونے والا ہے۔ وہ اپنے بھیانک روپ میں اسے خوفزدہ بھی کرسکتی ہے۔ مگر احمد نے بھی دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ وہ ذرا نہیں ڈرے گا۔ اسے تسلی تھی کہ اس کے پاس شاہ جی کا دیا ہوا بازو بند تعویذ تھا۔

وہ بھی جواباً غصیلے لہجے میں روزی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو اور کس لہجے میں مجھ سے بات کررہی ہو۔ میں بھلا عاصم کے پاس کیا کرنے جاؤں گا۔''

اس کی بات سن کر روزی نے معنی خیز انداز میں قریب کھڑے کرشن پجاری کے چہرے کی طرف دیکھا اور جواباً کرشن نے بھی اس کی جانب تکتے ہوئے دھیرے سے اپنا سر معنی خیز انداز میں ہلایا اور پھر اگلے ہی لمحے احمد نے اپنی زندگی کا بھیانک ترین منظر دیکھا۔ روزی کا حسین چہرہ ایک دم مسخ ہوکر سیاہ پڑ گیا۔

ایک لمحے کو احمد کا دل روزی کی بدلی ہوئی ڈراؤنی شکل وصورت پر دہل کر رہ گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے دل ہی دل میں اللہ کے نام کا ورد کرنا شروع کردیا۔ اسی اثنا میں قریب کھڑے کرشن نے اپنا ترشول والا ہاتھ بلند کیا اور روزی کا سر اس کے کندھے پر گھومنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے حلق سے کریہہ انداز کے قہقہے خارج ہونے لگے۔ اس دہشت ناک منظر سے احمد ایک بار پھر دہل گیا۔ اگلے ہی لمحے روزی کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ وہ احمد کی جانب شعلہ بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم عاصم کے پاس اسے ہوشیار کرنے گئے تھے میں سب جانتی ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو۔''

اس کی بات سن کر احمد کو بھی جیسے ایک دم جوش آگیا۔ اللہ کے نام کا ورد اور شاہ جی کے کہے ہوئے الفاظ نے احمد کو کافی حوصلہ دیا تھا اور اسے بے خوف سا بنا دیا تھا۔ لہٰذا وہ بے خوفی کے ساتھ روزی کے ڈراؤنے چہرے کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔ ''ہاں میں تمہاری اصل حقیقت سے واقف ہوچکا ہوں۔ تم نے میرے ہاتھوں ایک اللہ والے بزرگ شاہ جی کا ناحق خون کروایا، میں اب تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

احمد کی بات سن کر جیسے روزی غصے سے بپھر گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنا منہ کھولا اور اس کی دو شاخہ زبان لپلپاتی ہوئی باہر نکلی اور کسی خوفناک سانپ کی طرح احمد کے چہرے کے سامنے تھرکنے لگی۔ وہ کسی بھی وقت احمد کو ڈس سکتی تھی۔

لیکن احمد نے اسی وقت اللہ کا نام لیا۔ اور اپنا تعویذ والا ہاتھ روزی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے روزی کی زبان کو یوں جھٹکا لگا جیسے اس کی گردن کسی غیبی گرفت میں آگئی ہو۔ پھر وہ سانپ نما زبان روزی کے منہ سے نکلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ روزی بھی جھٹکا کھا کر چیختی ہوئی زمین بوس ہوگئی۔ اسی اثنا میں قریب کھڑا کرشن ترشول لہراتا جارحانہ انداز میں احمد کی طرف بڑھا تو احمد نے اللہ کا نام لے کر کرشن کے ہاتھ سے ترشول کھینچ لیا اور پھر نہ جانے احمد کے وجود میں اتنی طاقت کیسے آگئی کہ اس نے اگلے ہی لمحے وہ آہنی ترشول کرشن کے منکے کی طرح ابھرے ہوئے پیٹ میں پیوست کردیا۔ کرشن کے حلق سے بیل کی سی آواز ابھری اور وہ زمین بوس ہوکر تڑپنے لگا اور ذرا دیر بعد ہی ساکت ہوگیا۔

روزی بری طرح چیخ رہی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سانپ نما موٹی زبان کو تھامے کسی غیبی گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

ادھر احمد پر جیسے خون سوار تھا۔ وہ روزی کی طرف لپکا مگر اگلے ہی لمحے ایک گونجدار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اور اس نے روزی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔

''خبردار اس چنڈال سے دور رہو۔ اسے ہاتھ مت لگانا۔'' احمد اس آواز کو سن کر کھڑا رہا۔ اور خاموشی سے روزی کی شکل کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر اگلے ہی لمحے جیسے اس کی سانپ نما زبان کو کسی نے درمیان سے کاٹ ڈالا۔ روزی کے حلق سے دل خراش چیخ ابھری۔ اور ادھ کٹی خون آلود زبان جب اس نے واپس اپنے منہ کے اندر کھینچی تو اس کا سیاہ چہرہ اور کالے ہونٹ خوف سے سرخ ہوکر مزید ڈراؤنا بنا رہے تھے۔ اس کے

www.paksociety.com

بعد روزی چیختی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

کرشن کو ختم کرنے کے بعد احمد کو قدرے ٹھنڈک سی پہنچی تھی۔ مگر ابھی وہ روزی کو اپنے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسے اپنا وہ خواب یاد آنے لگا جس میں شاہ جی نے اسے نصیحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ روزی جیسی شیطانی روح کا کس طرح خاتمہ ہوگا۔ اس کے لئے اسے ایک سلگتا ہوا گڑھا کھودنا ہوگا۔ جس کے اندر روزی کو دھکیلنا تھا۔ لیکن احمد جانتا تھا کہ اس مشقت طلب کام میں دو تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے گڑھا بنانے کا ارادہ کیا۔ اور پھر قبرستان کے باہر کوئی مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی شروع کردی۔

اس روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ تقریباً نصف کام کر چکا تھا۔ جب وہ تھکا ہارا شام گئے اپنی جھونپڑی میں لوٹا تو لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔ لیکن پھر اچانک رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تو کوئی بڑی شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ احمد نے چونک کر لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ وہ شاہ جی تھے۔ اور بڑی پیاری نظروں سے اس کی جانب تکے جا رہے تھے۔ احمد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

شاہ جی کو زندہ سلامت دیکھ کر پہلے تو احمد چونکا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے سے خوشی پھوٹنے لگی۔

"شاہ جی آپ زندہ ہیں؟"

تمہیں ایک بات سے خبردار کرنے آیا ہوں وہ یہ کہ تم اپنے بازو سے یہ تعویذ اتار دو۔ میں تمہیں دوسرا تعویذ دے دوں گا۔"

شاہ جی کی بات سن کر احمد کو اچنبھا سا ہونے لگا۔ تاہم وہ الجھ کر شاہ جی سے بولا۔ "یہ تعویذ آپ ہی نے تو دیا تھا۔ اب آپ ہی اسے اتروانے کا کہہ رہے ہیں۔" احمد کی بات پر شاہ جی کے چہرے پر کچھ اضطراب آمیز تاثرات ابھرے اور تب احمد نے غور سے شاہ جی کے چہرے کا جائزہ لیا اور نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے فوراً اپنے بازو پر بندھے ہوئے تعویذ پر ہاتھ رکھ کر اللہ کا نام لیا۔ پھر اگلے ہی لمحے ایک عجیب واقعہ ہوا۔

شاہ جی کے حلق سے اچانک ایک غیر انسانی چیخ بلند ہوئی اور وہ احمد کے قریب سے اس طرح دور ہو کر پرے جا گرے، جیسے کسی نے انہیں پکڑ کر اچھال دیا ہو، اس کے بعد احمد نے ایک اور حیرت ناک منظر دیکھا۔ آناً فاناً شاہ جی کی ہیت بدلنے لگی اور اگلے ہی لمحے اب وہاں مکار روزی کھڑی تھی۔ پھر اچانک نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

احمد نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ اس مکار کی چال میں نہ آیا۔ اسے اچھی طرح سے اس بات کا اندازہ تھا کہ جب تک شاہ جی کا یہ تعویذ اور اللہ پاک کی رحمت اس کے ساتھ ہے تو بدروح روزی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

احمد اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اب اسے روزی کی تلاش تھی۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور یہ سوچ کر اسے بری طرح پچھتاوا سا ہونے لگا کہ وہ شاہ جی کی ہدایت کے مطابق عاصم اور اس کے خاندان کو روزی کی بدروح سے خبردار کرنے گیا تھا اس کو دوبارہ ان لوگوں کی بہرصورت خبر گیری کرنی چاہئے تھی۔ کیونکہ عاصم نے احمد کو دھوکہ باز سمجھ کر دھتکار دیا تھا۔ یقیناً وہ روزی کے شیطانی جال میں پھنس سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی احمد کا دل بے قرار ہوگیا اور اس کی نظروں کے سامنے عاصم کی معصوم بیوی صوفیہ اور اس کا ننھا گول مٹول سا پیارا سا بچہ گھوم گیا۔ بس پھر کیا تھا احمد نے اسی وقت بس پکڑی اور شہر آ گیا۔

شدید گرمیوں کا موسم تھا۔ احمد نے جیسے ہی بس سے اتر کر عاصم کے گھر کی طرف رخ کیا۔

ادھر روزی نے عاصم، اس کی بیوی اور بچے کا جینا حرام کر دیا تھا، کچھ ہی لمحے رہ گئے تھے کہ وہ ان تینوں کو ہلاک کر دیتی کہ اچانک احمد عاصم کے گھر پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اور گھر کے اندر سے تینوں کے چیخنے اور گڑگڑانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ احمد بے دھڑک گھر کے اندر چلا گیا۔ روزی نے قہقہہ لگاتے ہوئے عاصم کی گردن دبوچ لی تو عاصم کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ پھر احمد نے وقت ضائع کئے بغیر اللہ اکبر کا

نعرہ لگایا اور اپنا ہاتھ روزی کی طرف بڑھایا تو روزی نے چیختے ہوئے عاصم کی گردن چھوڑ دی اور فوراً ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہوگئی۔

اس وقت عاصم، اس کی بیوی صوفیہ اور بچے کی حالت خوف کی وجہ سے بہت خراب تھی۔ عاصم نے احمد کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ "احمد میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم نے ہماری زندگی بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے، کاش! میں تمہاری بات پر پہلے ہی یقین کر لیتا تو آج یہ وقت دیکھنا نہ پڑتا۔"

یہ سن کر احمد بولا۔ "خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ اب ہمیں ہر صورت روزی کا خاتمہ کرنا ہے، اور اس صورت سے آپ لوگوں کی جان بچ سکتی ہے۔" اور پھر احمد نے شاہ صاحب کا بتایا ہوا مکمل منصوبہ عاصم کے گوش گزار کر دیا۔ "یعنی روزی کی موت کا راز آگ میں جل کر بھسم ہونے میں ہے۔"

عاصم کو بھی تسلی ہوئی وہ دونوں منصوبہ کے تحت قبرستان پہنچ گئے، اور اب دونوں قبروں کے درمیان بنی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پھر قبرستان کے شکستہ گیٹ پر احمد خود ٹھہر گیا۔ اور عاصم کو آگے روانہ کر دیا۔ اسے روانہ کرتے ہی احمد کا دل نجانے کیوں انجانے خدشے کے تحت دھڑکنے لگا۔ اسے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ عاصم اس وقت چارے کی سی حیثیت رکھتا تھا۔

دفعتاً احمد کو ایک تیز اور غیر انسانی چیخ سنائی دی۔ اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ پھر اس نے چیخ کی سمت دوڑ لگا دی۔ اور تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

کیا دیکھتا ہے کہ ڈراؤنی صورت میں روزی نے عاصم کی گردن دبوچ رکھی تھی اور اپنے لمبے اور نوکیلے دانت عاصم کی گردن میں گاڑنے کے لئے اپنا منہ آگے بڑھا رہی تھی۔ بے چارہ عاصم، خوف و دہشت سے بری طرح کپکپا رہا تھا۔

اس وقت احمد نے اللہ کا نام لے کر اپنے بازو پر بندھے تعویذ پر ہاتھ رکھا۔ اور روزی پر چھلانگ لگا دی۔ احمد کے روزی سے ٹکرانے کی دیر تھی کہ روزی کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے ایک کریہہ چیخ کے ساتھ عاصم کی گردن کو چھوڑ دیا۔

ٹھیک اسی وقت احمد اس کو مخاطب کر کے زور سے چلایا۔ "گڑھے کی طرف بھاگو....." عاصم روزی کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی گڑھے کی طرف دوڑ پڑا اور پھر روزی اپنے شکار کو فرار ہوتا دیکھ کر اس کے تعاقب میں دوڑی اور پھر احمد روزی کے عقب میں ہولیا۔ وہ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ عاصم کمال ہوشیاری کے ساتھ روزی کو گڑھے میں دھکیل دے۔ اور پھر یہی ہوا۔

جیسے ہی عاصم کو اندازہ ہوا کہ وہ گڑھے کے قریب پہنچ گیا ہے تو اس نے اس کے اوپر چھلانگ لگا دی۔

ادھر بے تحاشہ دوڑتی اور قہقہہ لگاتی ہوئی روزی کا پاؤں گڑھے کے اوپر آیا تو اگلے ہی لمحے اسے یوں لگا جیسے اس کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ گڑھے کے اندر جا گری تھی۔ اس کے عقب میں آتے احمد نے آناً فاناً قریب رکھے پیٹرول کا کین گڑھے میں خشک جھاڑیوں اور روزی کے اوپر انڈیل دیا اور پھرتی سے لائٹر جلا کر گڑھے میں ڈال دیا۔ تو آناً فاناً خشک جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی اور روزی کی دردناک چیخوں سے پورا علاقہ گونجنے لگا۔ آگ تیزی کے ساتھ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ شعلے تھے کہ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

عاصم اور احمد دم بخود بھڑکتے ہوئے شعلوں پر نگاہ گاڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ روزی کی چیخیں آنی بند ہوگئیں اور فضا میں ایک عجیب چراندسی پھیل گئی۔ پھر اس کے بعد آگ ٹھنڈی پڑنے لگی۔ روزی جل کر بھسم ہو چکی تھی۔ احمد نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ اب مطمئن تھا کیونکہ اس نے عاصم، اس کی بیوی اور بچے کو ایک موذی بدروح سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا دلا دیا تھا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

راہ وفا میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
حسین چہرے رشک غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
غم عمر بھر کے لئے یوں بھی دے جاتے ہیں لوگ
شمع کے ساتھ آج بھی جلتے پروانے ہیں
(محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد)

لوگوں سے چھپالیں گے جو احوال ہے جی کا
اپنے سے کسی بات میں دھوکا نہ کریں گے
لکھیں گے اسی ٹھاٹ سے نظمیں کبھی غزلیں
ہاں آج سے لوگوں کو دکھایا نہ کریں گے
(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

اداس دل ہو تو ہر شے اداس ہوتی ہے
اگرچہ لاکھ کھلے ہوں گلاب آنکھوں میں
(شان۔ ٹنڈو آدم)

ترتیب ستم کا بھی سلیقہ تھا اسے
پہلے پاگل کیا اور پھر پاگل کہہ کر چھوڑ دیا
آتو گئے ہو زندگی میں مگر اتنا خیال رکھنا
اے دوست ہم جان تو دیتے ہیں مگر جانے نہیں دیتے
(صبا اسلم۔ گوجرانوالہ)

غفلت کی نیند سوئے اس دل کو جگادے مولا!
رستہ، بھٹکے ہوئے اس دل کو دکھادے مولا!
تجھ کو تجھ سے مانگوں، بس یہی طلب ہو میری
طلب بھی ایسی جو کہ اس دل کو مچادے مولا!
(اویس نور گڈانی۔ میرپور ماتھیلو سندھ)

جو عشق کی گلی میں پاؤں رکھ لیتا ہے
محبت کا مزا وہ دیکھ لیتا ہے
تڑپتے ہوئے گزرتی ہے ہر رات
زندگی کا ہر سکھ وہ گردی رکھ لیتا ہے
(وثیقہ زمرد۔ سمندری)

میری کتابیں میری زندگی کی رہنما ٹھہری پیناخ
ورنہ لوگوں نے بھٹکانے میں کسر نہ چھوڑی
ہم کررہے تھے کوشش سبھی کو ملانے کی!!
ذرا سا دھاگہ کیا کھینچا سب موتی بکھر گئے
(پیناخ۔ کھڈیاں خاص)

اس نے توڑا وہ تعلق جو میری ذات سے تھا
اس کو رنج نہ جانے میری کس بات سے تھا
لاتعلق رہا لوگوں کی طرح وہ بھی مجھ سے
جو اچھی طرح واقف میرے حالات سے تھا
(رابعہ امانت علی۔ لاہور)

تمہیں دیکھے نہ دیکھے یہ عادت ہے شب کو
تمہارے خواب کی سونے سے پہلے آرزو کرنا
(عبدالحلیم بھٹی اینڈ محسن۔ کوٹھا کلاں)

مجھے نہیں چاہئے اس کے بعد کوئی پہچان اے لوگو
میرے لئے یہی کافی ہے کہ امت محمدیہ سے ہے نسبت میری
(حافظ چند امقصود۔ لدھا سنگ موکل)

ہم بھرے شہروں میں تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کرلیتے ہیں پیدا آشیاں
(حافظ چند امقصود۔ لدھا سنگ موکل)

مدت سے تھی کسی کے ملنے کی آرزو
خواہش دیدار میں سب کچھ گنوادیا
کسی نے دی خبر کہ وہ آئیں گے رات کو
اتنا کیا اجالا کہ گھر تک جلادیا
(انتخاب: سبحان۔ کراچی)

تیری پلکوں کے آنسوؤں سے عقیدت مجھے بھی ہے
تیری طرح زندگی سے محبت مجھے بھی ہے
تو اگر نازک ہے تو میں بھی نہیں پتھر
تنہائی میں رو دینے کی عادت مجھے بھی ہے
(انتخاب: عمران۔ کراچی)

دھندے کرکے لوگ بھلا کیوں دیتے ہیں
اب کے میں بھی ایسا کرکے دیکھوں گا
(انتخاب: محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

☆☆

یا الٰہی! نئے سال پر قبول میری یہ دعا کردے
اپنے وطن میں ہر سمت امن و محبت کا اجالا کردے
رنجشیں، نفرتیں، تعصبات ہوں ختم
اپنے کرم سے اس ملک میں وہ فضا کردے
باہم محبت سے رہیں خوشیاں بانٹیں
یا رب صفات ایسی نئے سال میں عطا کردے
دکھ درد میں ایک دوجے کا ساتھ ہو
وہ جذبہ، سلیقہ، قرینہ محبت عطا کردے
اترے نہ کوئی بلا اس کے آنگن میں
گلستان، گلستان اس وطن کو سدا کردے
دشمن و اغیار کرلیں تقلید ہماری
ہمارے اتنے اونچے اخلاق اے خدا کردے
نئے دنوں میں توفیق دے، عبادت کی
گزرے ہوئے دنوں کی معاف ہر خطا کردے
پرنس بابر کی بس یہی دعا قبول فرما
پوری دنیا کے مسلمانوں کو یکجا کردے
(پرنس بابر علی رند بلوچ۔ بھولے دی جھوک ساہیوال)

میں روپ نگر کی شہزادی تو اک آوارہ بنجارہ!
میں چاند کی کشتی میں رہتی تو پھرتا پھرے مارا مارا
تو میری خواہش رکھتا ہے، کیا سوچ کے تو نے ایسا کیا
میں نیل گگن کی وسعت ہوں، تو کچی زمیں کا نظارا
جب پاہی نہیں سکتے مجھ کو تو میری طرف کیوں بڑھتے ہو
اک بدلی ہوں آکاش کی میں تو ساحل دریا ہے بے چارا
میں تو خوشبو ہوں پھولوں کی اور مستی مست بہاروں کی
ترا دامن ہے کانٹوں سے لدا، تو تو ہے خزاں کا گہوارہ
ترے پاس سوائے دل کے کیا کچھ اور بھی ہے پاگل عاشق!
مرے طالب تو ہیں لاکھ یہاں، کیا جانوں تو گر من یارا
نہ جان کو اپنی روگ لگا، جا لوٹ کے اپنی بستی کو
میں تیری پیاری ہوں لیکن تو میرا نہیں ہے دلدارا
(فریدہ خانم۔ لاہور)

ہجر کی رات ہے، فرقت کی گھٹا چھائی ہے
جس طرف دیکھئے اک عالم تنہائی ہے
کس کے آنے سے ہے دنیائے محبت شاداں
کون محفل میں بعد جلوہ رعنائی ہے
اشک تھے تھمتے ہی نہیں اب تو میری آنکھوں میں
خوب یہ دل کے لگانے کی سزا پائی ہے
راز دل کس سے کہوں کوئی بھی ہمراز نہیں
دل کسی جلوۂ معصوم کا شیدائی ہے
وہ جو آئے ہوئے بیٹھے ہیں سر محفل شوق
دل پہ ارماں و مسرت کی گھٹا چھائی ہے
ہم تو ہر جور و ستم تیرا گوارا کرلیں!
پر یہ ہی خوف ہے اس میں تیری رسوائی ہے
عالم نزع میں اللہ رے دل کی حالت
دل کا ہر تار فقط تیرا تمنائی ہے
تیرگی ختم مسرت کی سحر!
پھر نئے سر سے گلستاں میں بہار آئی ہے
اک مدت ہوئی گزرے تھے تیرے کوچہ ناز سے
ہم نے یہ دولت آلام وہاں پائی ہے
(چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان)

سوزش دل کو کسی صورت سے آخر کم کیا
اشک ہائے خونچکاں سے اپنا دامن کم کیا
مادیت کی پرستش کی پے تزئین جسم
گیسوئے روحانیت کو رات دن برہم کیا
چاہئے تو تھا بنانا خطہ امن و سکوں
اہل عالم نے مگر عالم کا کیا عالم کیا
اجتماعی فائدوں کو دی نہ کوئی خزلت
صرف ذاتی منفعت دیکھی تو اس کا غم کیا
رکھا اپنی تک محدود بس اپنا خلوص

www.YourBooks.net

سورہ اخلاص پڑھ کر دوسروں پہ دم کیا
تھی مجرب یہ دوا جب ہوچکی تشخیص درد
ہم نے استعمال امرت کے بجائے سم کیا
چشم نم، دامن دریدہ لوگ مدعو کرلئے واجد
پوری تیاری سے اب ہم نے جشن غم کیا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی۔کراچی)

سو جاؤں تو تیرے خواب جگادیتے ہیں
اندھیرے میں ہم چراغ جلادیتے ہیں
کسی کو چاہا تھا ہم نے اپنا جان کے
داغ دل سے تیری جدائی کا مٹادیتے ہیں
پاکے بھی تجھ کو ہم حیراں ہوگئے آخر
لوگ قرض وفاؤں کا پھر سے چکادیتے ہیں
آسمان پہ روشن ہیں چاند ستارے بھی
لوگ غریب جان کے ہم کو دغا دیتے ہیں
یہاں کوئی بھی نہیں اپنا یہ دیکھا جاوید
سرد راتوں میں ہم تجھے دعا دیتے ہیں
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

جاتے ہوئے سال کے بوجھل لمحوں
ٹھہرو اے جاتے ہوئے سال کے بوجھل لمحوں
اپنی بخشی ہوئی سوغات بھی لیتے جاؤ
جارہے ہو تو یہ حالات بھی لیتے جاؤ
جن سے میں اور میرا سارا وطن گزرا ہے
روح گزری ہے کبھی اور کبھی تن گزرا ہے
اپنی تاریخ کے یہ کالے بھیانک اوراق درج ہیں
جن میں کسی پر کوئی افسانہ قہر
ہے کسی صفحے کا عنوان فقط زہر ہی زہر وقف ہے
کوئی ورق ذکر عداوت کے لئے
کوئی تلخی کے لئے اور کوئی نفرت کے لئے
پورے اک سال سے ہم بے بس و مجبور وملول
دیکھتے آئے ہیں دنیا کو تماشے کی طرح
دیر سے مہر بلب ہیں کسی لاشے کی طرح

ایک بے گوروکفن زندہ جنازے کی طرح
دفن ہیں اپنے ہی ماضی کے سیاہ خانے میں
اپنی تاریخ کے اوراق زبوں اوڑھے ہوئے
چہرے سے پاؤں تلک چادر خوں اوڑھے ہوئے
سربہ زانو ہے ورق کوئی، کوئی خاک بسر
منجمد ہوگئی ہے چیخ کسی صفحے پر
ہے کہیں ذکر خود اپنوں کی ستم کاری کا
جھوٹ کا ذکر کہیں ہے، کہیں غداری کا
یارب العزت! مجھ کو عطا کر، ایسا اجلا جذبہ
(ناصر علی۔بھولے دی جھوک، ساہیوال)

آج پھر ان کا دیدار کرنے کو جی چاہتا ہے
آج پھر ان سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے
رہتے تو وہ ہیں بہت دور ہم سے
آج پھر ان کے پاس جانے کو جی چاہتا ہے
کتنی شدت ہے چاہت کی پیاس میں
آج پھر پی کر مرجانے کو جی چاہتا ہے
مت پوچھ کتنی مشکل سے گزرتے ہیں دن اور رات
آج پھر ان کی بانہوں میں سوجانے کو جی چاہتا ہے
(صبا ایم اسلم۔گوجرانوالہ)

ختم ہوتے ہوتے پھر سے پیار ہورہا ہے
اچانک ہی اس شخص کو مجھ پہ اعتبار ہورہا ہے
وہ دن بھی تھے ان کے پاس وقت نہ تھا میرے لئے
یہ دن بھی ہیں کہ میرا انتظار ہورہا ہے
مل رہا ہے میری ہر بات کا الف سے جواب
انکار ختم ہوچکا اقرار ہورہا ہے
اک عرصہ رلایا ہم کو صبح و شام اس نے مگر
رلاتا ہے اب رقیبوں کو سمجھدار ہورہا ہے
میری نوازشوں کا اب جاکر اثر ہوا ہے
ہونٹ اس کے کھل گئے ہیں اظہار ہورہا ہے
جو شکوے تھے اک دوسرے سے بہت دور رہ گئے ہیں
زندگی گزر گئی ہے مگر ایسے نہیں ہوا تھا
جیسے کہ آج صائم کو خمار ہورہا ہے
(ظہور احمد صائم۔مانگا منڈی)

تجھے پانے کی نہ جانے مجھے حسرت کیوں ہے
زندگی میں مجھے تیرے لئے ہی ضرورت کیوں ہے
میرے ہمدم تیری ہی سے ہے میں زندہ ہوں
جانے اس بات پہ اتنی تمہیں حیرت کیوں ہے
میں تو مجرم بھی نہیں پھر بھی سزا کاٹی ہے
تجھ میں انجان سی میرے لئے نفرت کیوں ہے
میری آنکھوں میں سدا تم ہی بسے رہتے ہو
تیری آنکھوں میں کسی اور کی صورت کیوں ہے
میرا دل توڑ کر میرا ہنستے ہو جو بے باکی سے
زخم دینے کی تمہیں اتنی مہلت کیوں ہے
جانے کس دور سے گزری ہے، زندگی میری
ہار جانے کی نہ جانے مجھے عادت کیوں ہے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈو الہ یار)

اے کہہ دو! دل کو نہ ستائے میرے
سونے دے خوابوں میں نہ آئے میرے
میں کس طرح غم کو سمجھائے ہوئے ہوں
کبھی راز نہ لوگوں کو بتائے میرے
یاد ماضی غموں کو بھلانے دو مجھے
اب نہ کوئی محبت کے گیت سنائے مجھے
نہ جانے کس دیس میں جا بسے ہو
تھک گئی ہوں لوٹ آ، آشیاں میں میرے
ہجر میں جل رہی ہوں اکیلی بیناخ
کون ہے جو سینے سے لگے میرے
(بیناخ اے ڈی.....کھڈیاں خاص)

کتاب دل کی صفحوں پر لکھی تحریر تم ہی ہو
سنو جاناں مرے دل میں چھپی تصویر تم ہی ہو
تمہیں کیسے بھلاؤ جان من تم ہی بتاؤں
خدا ہی کی طرف سے جب مری تقدیر تم ہی ہو
مجھے تعبیر والوں نے یہ خوشخبری سنائی ہے
کہ میں اک خواب ہوں اس خواب کی تعبیر تم ہی ہو
مجھے تو فقط تم سے غرض ہے نا کہ اثاثے سے
اولیس تم ہی مرا سب کچھ، مری جاگیر تم ہی ہو
سنو جاناں مرے دل میں چھپی تصویر تم ہی ہو
کتاب دل کی صفحوں پر لکھی تحریر تم ہی ہو
(اویس نور گڈانی.....میر پور ماتھیلو، سندھ)

اس بے نام سے رشتے کو کوئی نام تو دے جاؤ
کرنے کو ہمیں کوئی اہم کام تو دے جاؤ
نکال دے جو ہمیں اس موت کی کشمکش سے
جاتے ہوئے کوئی ایسا جملہ کلام تو دے جاؤ
ہ بھول گئے ہیں اپنی وہ ساری شان و شوکت
اس بے شان سے پتلے کو کوئی شان تو دے جاؤ
دے دے جو ہمیں صلہ ہماری محبت کا
جاتے ہوئے ہمیں کوئی ایسا دام تو دے جاؤ
تیرے ہجر و فراق کے تصور سے ہی روح تن سے جدا ہوتی جارہی ہے
جو ہمیں بچالے شاہد، جاتے ہوئے زندگی کا کوئی ایسا پیغام تو دے جاؤ
(رابعہ امانت علی.....لاہور)

ہم جن سے امید وفا کرتے رہے
وہ ہمیں رسوا سر بازار کرتے رہے
ہم جن کی زندگی کے لئے دعا مانگتے رہے ہر وقت
وہ ہماری موت کی دعا صبح شام کرتے رہے
اب غم کے ماروں کا ساتھ دے بھی تو کون
ہم کو اپنے ہی دکھ بے حساب دیتے رہے
اب ہم دنیا والوں پر یقین کریں بھی تو کیسے رابعہ
دنیا والے تو ہم پر ظلموں کی انتہا کرتے رہے
(رابعہ عباس.....بستی نتے والی)

آج پھر نئے سال کی خوشیاں آگئیں
باتیں سبز رتوں کی طرح
شگوفوں، کونپلوں اور برگ نمو کی صورت
سرابھار رہی ہے
میں سوچنے لگا
پھر نیا سال آگیا
میرے ملک بھر میں، اغوا، دھماکے، ٹارگٹ کلنگ
اور دہشت گردی نے کتنے گھروں کی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خوشیاں اجاڑ دی ہیں
مائیں اپنے لختِ جگر
اور بہنیں اپنے بھائیوں کی
راہ تک رہی ہیں
میں نے سوچا اس بار
نئے سال کی آمد پر قبرستان جاؤں گا
تو کس کس کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گا
پھر کس کس کے گھر تعزیت کرنی ہے
ایک آنسو بے کل سا ہو کر
آنکھ کی پتلی سے پھسل کر میرے
گالوں پر آ گیا
آپ سب کو نیا سال مبارک ہو
(ساحل ابڑو-ڈیرہ اللہ یار بلوچستان)

کیا دو گے مجھے میری وفاؤں کا صلہ تم
ممکن ہو تو کرتے ہی رہو مجھ پہ جفا تم
کب جیتا ہے دنیا میں کوئی قلب شکستہ
للہ نہ یوں دو مجھے جینے کی دعا تم
کس منہ کریں تم سے جفاؤں کی شکایت
جب ہوتے ہو اظہار تمنا پہ خفا تم
تم ظلم بھی ڈھاتے ہو تم ہم کچھ نہیں کہتے
ہم پیار بھی کرتے ہیں تو ہوتے ہو خفا تم
دنیا میں ہوا کون شریک غم دنیا
غم تم نے دیا ہے تو کرو اس کی دوا تم
شعلہ ہو کہ بجلی ہو آندھی ہو کہ طوفان تم
بھولی ہوئی یادوں کی ہو بھولی سی صدا تم
جوہر وہ یہ سن کر کہیں مغرور ہو جائے
اس دل کے صنم خانے کی مالک ہو سدا تم
(کاشف سعید کاوش.....بنگرام)

راز جب سینے سے باہر ہو گیا اپنا
ریت پر بکھرے آنسو اٹھا سکتے نہیں
آدمی کیا گزرتے وقت کی تصویر ہے
جانے والے کو صدا دے کر بلا سکتے نہیں
شہر میں رہتے ہوئے ہمیں زمانہ ہو گیا
کون کہاں رہتا ہے کچھ بتا سکتے نہیں
(سنبل ماہین لطا.....سرگودھا)

کچھ درد ہونٹوں پر لائے نہیں جاتے
قصے اپنی رسوائی کے سنائے نہیں جاتے
تکتے رہتے ہیں گلی میں راہ اک شخص کا
اور وہ ہی کہ بھولے سے ادھر نہیں آتے
مجھے عشق کی زنجیر نے ایسا ہے باندھا
کہ اب تو ہاتھ اپنے چھڑائے نہیں جاتے
گھر گئے ہیں درد کے شعلوں میں اتنے
اب آگ کے یہ دریا بجھائے نہیں جاتے
چھوتا ہے جب کوئی سسکی نکل جاتی ہے
ضبط اتنا ہے کہ درد بتائے نہیں جاتے
راج کچھ ایسا کرو کہ وہ ہمارے ہو جائیں
حال دل اب کسی اور کو سنانے نہیں جاتے
(سید عبادت راج کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان)

چلو اس شہر میں چلتے ہیں
چلو تقدیر کو پھر سے آزماتے ہیں
ہواؤں پر لکھی سرگوشیوں کو آج سنتے ہیں
ساعت ان چھوئی سی آہٹوں کی زد میں ہے شاید
جبھی تو دھڑکنیں چپ ہیں
جبھی تو ساعتیں چپ ہیں
چلو اس شہر چلتے ہیں
جہاں پر وصل کو زنجیر سے باندھا نہیں جاتا
معافی کو جہاں تحریر سے باندھا نہیں جاتا
جہاں دل کو کسی جاگیر سے باندھا نہیں جاتا
جہاں پر چاندتاروں سے مزین رات ہوتی ہے
جہاں پر چاہتوں کی ہر برسات ہوتی ہے
جہاں دل کے سارے دشمنوں کی مات ہوتی ہے
چلو اس شہر چلتے ہیں
(انتخاب: قاسم رحمان.....ہری پور)

☆☆

ہر آہٹ پر دل ڈولا
کیا ہوگا اب اے مولا
ایک ہوا کا جھونکا تھا
دل کا جب بھی در کھولا
اس کی یاد ستاتی ہے
اس کو اشکوں میں تو لا
بارش تھی اور اوپر سے
تیرے ململ کا چولا
لوگ مخالف تھے میرے
لیکن وہ کچھ نہ بولا
دے کے دل اب جانا ہے
رانا کتنا ہے بھولا
(قدیر رانا-راولپنڈی)

چاہ کر بھی نہ دغا دی ہم نے
راہ دشمن کو دکھا دی ہم نے
ہم پہ الزام رقابت بے سود
دشمنوں تک کو دعا دی ہم نے
فخر صد فخر کیا فاقوں پر
مفلسی تجھ کو انا دی ہم نے
آئے گی فکر سخن میں وسعت
جا تیر فکر بڑھا دی ہم نے
جو دیا بار گراں تھا شب پر
روشنی اس کی گھٹا دی ہم نے
کس لئے ہم سے خفا ہے امتیاز
کیا تیری بات گرا دی ہم نے
(ایس امتیاز احمد-کراچی)

اداسی سی دل پر چھانے لگی ہے
مجھے یاد اس کی آنے لگی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ
بارش من بہلانے لگی ہے
دل پر یادوں کا بوجھ بڑھتا گیا
بھیگی جنوری کی شام رلانے لگی ہے
خیال میں دیکھا اس کا عکس
خماری ذہن پر چھانے لگی ہے
میرے لئے اس کی چاہت دیکھ کر
اداسی اب دور جانے لگی ہے
خواب ٹوٹا تو دیکھا راج میں نے
اداسی پھر لوٹ کے آنے لگی ہے
(سید عبادت راج-ڈیرہ اسماعیل خان)

وعدہ کرو تم ہم سے
ہم کو بھول تو نہیں جاؤ گے
دور جا کے تم ہم سے
بیتے لمحوں کو بھول تو نہیں جاؤ گے
وعدہ کرو تم ہم سے
وہ ہنستے مسکراتے چہرے
وہ اسکول ٹائم کی یادیں
ان لمحوں کو بدل تو نہیں جاؤ گے
وعدہ کرو تم ہم سے
ہم کو بھول تو نہیں جاؤ گے
(رابعہ عباس-بستی فتے والی)

ہم عاشقوں کی عاشقی کے
کتنے انوکھے ہوتے ہیں قصے
آنکھیں بند کرتے ہیں تو صرف
محبوب کے دیدار کے لئے
پھر تنہائیوں میں بیٹھ کر
خوب روتے ہیں
داغ دل کے پھر یوں
وہ دھوتے ہیں
بکھرے بال، سوجی آنکھیں اور حال برا
خود ہی سے بے خبر وہ ہوتے ہیں
(رابعہ امانت علی شاہد-لاہور)

☆☆

WWW.OURDUBOOKS.NET

شام کا جھٹپٹا پورے ماحول پر اندھیرے کی گہری چادر چڑھا رہا تھا۔

"آپ شاید میرے قلم نہ دینے کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ مگر یقین جانئے میں آپ سے ایسا برتاؤ کبھی نہ کرتا اگر میری مجبوری نہ ہوتی۔ آپ کا دل دیکھا اس کے لئے میں دوبارہ سوری بولتا ہوں۔" شلوار قمیض والے نے بہت نرم لہجے میں کہا۔ اور اسی لہجے کا اثر تھا کہ پینٹ شرٹ والا اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ جیسے یقین کر رہا ہو کہ واقعی اس نے سچ بولا ہے۔ تھوڑی دیر جائزہ لینے کے بعد وہ جیسے مطمئن ہوگیا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھاتے ہوئے مخاطب ہوا۔ "اوکے، میرا نام عقیل زاہد ہے اور آپ؟"

"مجھے گوہر علی کہتے ہیں۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ بھی نور پور جا رہے ہیں۔"

"جی! میں نے نور پور اتر کر آگے گرین ہل جانا ہے۔" عقیل زاہد اب پوری طرح گوہر علی کی طرف متوجہ تھا۔

بس کے بریک چرچرائے اور ایک جھٹکے کے ساتھ بس رک گئی۔ آدھی سواریاں پہلے ہی پچھلے اسٹاپ پر اتر چکی تھیں۔ باقی بچی کچی ان دونوں کے علاوہ یہاں پر اتر گئیں اب بس میں ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے علاوہ وہ دونوں رہ گئے تھے۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا اور بس پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔

"کیا کہا گرین ہل، ارے میں بھی تو وہیں جا رہا ہوں۔ کیا آپ بھی نوے کروڑ کے چکر میں....." اور پھر گوہر علی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ "تو کیا تم بھی؟ اوہ میرے خدا....." عقیل زاہد کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ "ہاں مجھے بھی ایک کوریئر ملا تھا۔ اسٹوری فیسٹیول کا۔ جس کو جیتنے والے کو نوے کروڑ روپے ملیں گے۔ میں تو سن کر کافی حیران ہوا تھا۔ مگر دل نے کہا۔ فارغ تو ہوں ہی اس مقابلے میں شرکت کرنی چاہئے۔" علی گوہر نے ایک لمبا سانس خارج کیا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"یہ تو ہوتا ہی ہے کوئی بھی مقابلہ بندہ اکیلے تو نہیں لڑ سکتا۔ ہو سکتا ہے ہمارے اور بھی سینکڑوں حریف نکل آئیں یہ تو اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات راستے میں ہی ہوگئی۔ وہاں جا کے بھی تو ہم نے ملنا ہی تھا۔" عقیل زاہد نے اس کے اس طرح ڈھیلا پڑنے کو جانے کیا سمجھا کہ اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سینکڑوں کی بات تو غلط ہے کیونکہ دہشت کے موضوع پر لکھنے والے بہت کم ہیں اور لفظوں میں خوف کی کیفیت پیدا کرنا تحریر کی مالا میں دہشت کے موتی پرونا ہر کسی کا کام نہیں ہوتا۔" گوہر علی نے ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے بچے اس دھرتی پر بہت سے نامور مصنف پڑے ہوئے ہیں۔ دعا کرو کہ "اے وحید" یا ایم اے راحت جیسے قلم کار وہاں نہ آئے ہوں۔ ورنہ ہم کو تو دروازے سے ہی انعام مل جائے گا کہ "You may go" عقیل زاہد نے ہنستے ہوئے گوہر علی کی حالت کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

ابھی ان کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کنڈیکٹر کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"بھائی صاحب! آپ کا اسٹاپ آ گیا ہے۔" انہوں نے اپنے بیگز اٹھائے اور بس سے اتر گئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا وہ ایک چوراہے پر کھڑے تھے۔ بس مڑ کر واپس جا چکی تھی۔

"یہاں تو چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی ہے، گرین ہل جانے کے لئے شاید ہی ہمیں کوئی گاڑی ملے۔" عقیل زاہد کی بات منہ میں ہی تھی کہ سامنے والی سڑک سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ تھوڑی دیر میں وہ گاڑی ان کے قریب آ رکی۔ یہ ایک ٹیکسی تھی۔

"کہاں جانا ہے بھائی؟" ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"گرین ہل۔" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا اور وہ اپنا بیگ اٹھا ہی رہے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

"عجیب پاگل شخص ہے۔" عقیل زاہد نے اپنا

بیگ دوبارہ سڑک پر رکھتے اور ٹیکسی کی ٹیل لائٹ کو دور ہوتے دیکھتے ہوئے بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور دیر نہیں تھی کہ ان کے دانت بھی بجنے لگتے۔ ٹیکسی چلے جانے کے بعد دو تین آٹو رکشے بھی ان کے پاس رکے مگر گرین ہل کا نام سنتے ہی ایسے غائب ہوتے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

سردی کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے دانت بجنا شروع ہوگئے تھے۔ وہ دونوں یہ سوچنے پر مجبور ہو چکے تھے کہ ان کے ساتھ کسی نے گھناؤنا مذاق کیا ہے مگر وہ اس موضوع پر ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے سکی محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اپنی بے وقوفی کا بہت شدت سے احساس ہو رہا تھا اور اس کوریئر بھیجنے والے نامعلوم شخص پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ ان کو اگر معلوم ہوتا کہ یہ ایک بے ہودہ مذاق کے علاوہ اور کچھ نہیں تو وہ کبھی نہ آتے۔ مگر اب واپسی بھی تب ہوتی اگر اس طرف کوئی آٹو رکشہ یا ٹیکسی آ جاتی۔ ابھی وہ اسی سوچ کے تانے بانے بننے میں الجھے ہوئے تھے کہ انہیں سڑک پر گھوڑے کے ٹاپوں کے پڑنے کی آواز سنائی دی۔ آواز ان کے پیچھے سے آ رہی تھی۔

اچانک دونوں غیر ارادی طور پر مڑے تو دور سے انہیں ایک تانگے کا سا ہیولہ نظر آیا جیسے جیسے وہ ہیولہ قریب آتا گیا واضح ہوتا گیا۔ وہ ایک کالے رنگ کی بگھی تھی جس کے آگے چار کالے رنگ کے گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ بگھی کے کوچوان نے کالی چادر سر سے پاؤں تک اوڑھی ہوئی تھی جس سے اس کا چہرہ بھی کافی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ بگھی کی طرف دیکھتے ہی نہ جانے دونوں کو ایسا کیا محسوس ہوا کہ ان پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ خوف کی شدید لہر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ یک لخت وہاں سے بھاگنے کی خواہش نے ان کے دل میں شدت سے سر ابھارا مگر دونوں کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔ شاید ان پر کوئی سحر کر دیا گیا تھا یا یہ پھر خوف کی ایک کیفیت تھی جسے سمجھنے سے دونوں قاصر تھے۔

"بیٹھو" کوچوان کی بھاری تحکمانہ آواز ابھری اور دونوں کسی معمول کی طرح بگھی کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھے۔ اندر کا ماحول بغیر کسی ہیٹر وغیرہ کے حیرت انگیز طور پر گرم تھا۔ جہاں دونوں نے سکون محسوس کیا۔ آہستہ آہستہ ان کے بکھرے حواس اعتدال پر آنا شروع ہوگئے۔ "یہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ ہم نے تو اس کو بتایا بھی نہیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔"

اچانک گوہر کو جیسے ہوش آیا عقیل زاہد نے بگھی میں موجود کوچوان کی طرف والی چھوٹی کھڑکی کھولی اور اونچی آواز میں بولا۔ "بھائی صاحب! ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہو؟" کوچوان نے ان کی طرف سر گھمایا اور چند ساعتوں کے بعد بولا۔ "اپنے آقا کے پاس۔" اور اتنا کہہ کر وہ پھر سے گھوڑوں پر چابک برسانے لگا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور پھر دوسرا سوال گوہر نے کیا۔ "تمہارا آقا کون ہے۔"

"وہی جس کے بلاوے پر تم یہاں آئے ہو۔" اب کی بار کوچوان نے بغیر پیچھے دیکھے جواب دیا۔ دونوں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور کھڑکی بند کر کے پھر سے بیٹھ گئے۔ "شاید کوریئر بھیجنے والے نے اس کو بھیجا ہوگا۔" گوہر نے اندازہ لگا لیا۔

"شاید نہیں یقیناً"..... عقیل نے ایک لمبا سانس خارج کرتے ہوئے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ پانچ سے دس منٹ تک ان کا یہ سفر جاری رہا۔ بگھی رکتے ہی انہوں نے بگھی کا دروازہ کھولا سرد ہوا کے جھونکے نے دونوں کا استقبال کیا اور وہ بگھی سے اتر آئے۔ تاحد نگاہ جھاڑیاں سی پھیلی ہوئی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکا دکا درخت لگے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک درخت کے ساتھ کوچوان نے بگھی باندھی اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے آگے چل پڑا۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر فیصلہ کن انداز میں کوچوان کے نقش قدم پر چل پڑے۔

تھوڑی دور تک چلنے کے بعد انہیں ایک کھنڈر نما عمارت کے آثار نظر آنے شروع ہوگئے۔ عجیب سا سناٹا

چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ پرندہ تو کیا کسی حشرات کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ سناٹے کو چیرتی صرف ان کے قدموں کی آواز ان کا دل دہلائے دے رہی تھی۔ کھنڈر کے قریب پہنچ کر ان کے قدم رک گئے۔ ایک جہازی سائز بند گیٹ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ کوچوان نے گیٹ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا اور گیٹ بغیر کسی آواز کے کھلتا چلا گیا۔ وہ دونوں وہاں رک گئے جیسے فیصلہ نہ کر پارہے ہوں کہ اندر جائیں یا نہ۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اپنے لفظوں سے لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے والوں کو ایک دن خود خوف کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''رک کیوں گئے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں میرا آقا بہت مہمان نواز ہے۔ تمہارے مقابلے کے بعد تمہیں حفاظت سے گھر پہنچا دیا جائے گا اور میں معذرت خواہ ہوں کہ میں وہاں دیر سے پہنچا۔ جس کے لئے تمہیں اتنی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔'' کوچوان نے انہیں باہر رکتے دیکھا تو معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

کوچوان کی باتوں سے ان کے دل کو ڈھارس پہنچی اور انہوں نے قدم اندر کی طرف بڑھا دیئے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک سرنگ نما راہداری شروع ہوگئی تھی جس کی دیواروں میں مشعال لگی ہوئی تھیں جو اس راہداری کو روشن کئے ہوئے تھیں۔ تھوڑی دور جا کے سرنگ کا اختتام ایک شاندار ہال پر ہو رہا تھا۔ باہر سے وہ عمارت جتنی بوسیدہ اور کھنڈر نما تھی۔ اندر سے اتنی ہی شاہانہ انداز میں سجی ہوئی تھی۔ چھت پر شاندار فانوس لگے ہوئے تھے جو کہ مغلیہ دور کی یاد دلاتے تھے۔ اس بڑے ہال میں لمبی چوڑی میز کے چاروں اطراف میں کرسیوں پر بیس مرد اور چار عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک ادھیڑ عمر اور باقی تینوں نوعمر لڑکیاں تھیں۔ سب کافی پرجوش نظر آرہے تھے۔ عقیل اور گوہر نے بھی دو کرسیاں سنبھالیں اور بیٹھ گئے۔ لمبے چوڑے ہال کے آٹھ دروازے تھے۔ جن میں سے ایک دروازہ کھلا اور پینتیس سال کا ایک نوجوان مگر کبڑا شخص ہال میں داخل ہوا۔ اس کے آتے ہی تمام لوگ چپ ہوگئے۔

''مجھے امید ہے تم سب کو یہاں آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔'' کبڑا ایک لمحے کو رکا اور ان سب پر طائرانہ نظر ڈال کر پھر سے گویا ہوا۔ ''تم سب کو کوریئر کے ذریعے پتہ چل گیا ہوگا کہ میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے۔ سب سے پہلے میں اپنا تعارف کرواتا ہوں میرا نام اسفند یار ہے۔ گاہے بگاہے تمہاری کہانیاں میری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ خوف کے موضوع پر میری دلچسپی ہی ہے کہ جس نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ میں نے تم لوگوں کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کا امتحان لینے کے لئے تم لوگوں کو یہاں بلایا ہے۔ تمہارے مقابلے کروائے جائیں گے اور ٹاپ اسٹوری کو نوے کروڑ انعام میں دیا جائے گا۔ آپ لوگوں کا جج میں خود ہوں گا۔ سب اپنی اپنی باری پر کہانی سنائیں گے جو ان کی اپنی تخلیق ہوگی نہ کہ چوری شدہ، کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔''

کبڑا اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک نوجوان ہاتھ اوپر کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے دانش، کوئی مسئلہ ہے کیا۔'' کبڑے نے کھڑے ہونے والے نوجوان سے پوچھا۔

''معذرت مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی شخص کی کہانی غیر معیاری یا چوری شدہ ہو تو آپ اسے سزا تو نہیں دیں گے۔ کیوں کہ میں نے اس قسم کی ایک کہانی ''بس آئینہ'' پڑھی ہے جس میں کہانی سننے والا سنانے والے کو سزائیں دیتا ہے۔''

دانش نے بات مکمل کی تو اسفند یار (کبڑے) کے منہ سے ایک بے ہنگم قہقہہ نکلا۔ ''میرے دوست میں تمہارا میزبان ہوں کوئی جلاد نہیں۔'' اسفند یار نے اپنی ہنسی بمشکل ضبط کی۔ ''اور میں کوئی روح نہیں نہ ہی اس فضول رائٹر ''قاسم رضا'' کی کہانی کوئی کردار۔ جس کو لکھنے کے لئے اور کوئی موضوع نہیں ملتا۔''

''پلیز ذرا اپنے الفاظ کنٹرول میں رکھیں۔'' ایک طرف بیٹھی ایک نوعمر لڑکی نے الجھتے ہوئے قدرے سخت

لہجے میں کہا۔ ''وہ میرا پسندیدہ رائٹر ہے آپ کو کوئی حق نہیں ہے اسے کچھ کہنے کا۔ اگر وہ ایک ہی موضوع پر لکھتا ہے تو اسے آپ نہ پڑھا کریں۔''

''ویلڈن! مس ثوبیہ! کیا گہری پسندیدگی ہے۔ تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر مگر میری مجبوری کہ مجھے سب کو پڑھنا پڑتا ہے۔ دنیائے ادب سے واقفیت رکھنے کے لئے۔'' کبڑے نے آخری جملہ بہت پراسرار انداز میں کہا۔

''اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف کل سے آپ کے مقابلے شروع ہوجائیں گے جیتنے والا اگلے راؤنڈ میں جبکہ ہارنے والا گیم سے باہر ہوگا۔ اگر ہارنے والا گھر جانا چاہے تو جاسکتا ہے۔ یا گیم کا ''دی اینڈ'' ہونے تک انتظار بھی کرسکتا ہے۔ شاید آپ میں سے کوئی مجھے بے وقوف خیال کرتا ہو کہ بغیر فائدہ کے میں کیسے کسی کو نوے کروڑ دے سکتا ہوں۔ مگر شوق انمول ہوتا ہے میری بچپن سے یہی خواہش رہی ہے کہ میں اسٹوری فیسٹیول منعقد کراؤں۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ اگر یہ کامیاب ہوا تو میں ہر سال یہ میلہ منعقد کرواؤں گا۔ میرے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ کیا آپ لوگ واقعی مجھے پاگل، بیوقوف یا دیوانہ شخص سمجھتے ہیں۔ مجھے کسی کی میرے متعلق رائے بری محسوس نہیں ہوگی، کھل کر جواب دیجئے بنا ہچکچائے۔'' کبڑے نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کی اور پھر ایک دم پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

''میں آپ کی کوششوں کی داد دیتا ہوں۔'' دانش نے تحسین بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم لوگ کافی تھکے ہوئے ہو، کھانے پینے اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر آرام کرلو۔ شہروز تم لوگوں کو تمہارے کمروں تک پہنچا دے گا۔ آخری جملہ کبڑے نے کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا اور کچھوے کی سی چال چلتا ہوا ہال کے کونے میں بنے ایک کمرے میں گم ہوگیا۔

اگلی صبح سب اکٹھے اسی ہال میں بیٹھے تھے۔ کبڑے نے باقاعدہ ان کے مقابلے فکس کئے۔ پہلا مقابلہ ایک عتیق نامی نوجوان اور عقیل زاہد کے درمیان تھا۔ باقی تمام قرع جیسے جیسے نکلے کبڑے نے ترتیب وار ایک بڑے سے رجسٹر پر لکھ لئے۔

عقیل اور عتیق کا ٹاس ہوا تو پہلا نمبر عقیل کو ملا۔ اس نے اپنی کہانی شروع کرنے سے پہلے گلا صاف کیا اور شروع ہوگیا۔ کہانی یوں تھی۔

وہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا تھا۔ نڈر ہونے کی وجہ سے قبرستان کا خوفناک سناٹا کبھی اس کے قدم نہیں روکتا تھا۔ وہ قبرستان سے ایسے گزرتا جیسے کسی پررونق شاہراہ سے گزر رہا ہو۔ قبروں کے کتبے پڑھتا، ان کے نام لے کر ان کو سلام کرتا اور پھر اپنی حرکت پر ہنستا وہ خراماں خراماں اس قبرستان کو پار کر جاتا۔ وہ ایک رپورٹر ہونے کی وجہ سے کسی مافوق الفطرت چیز پر مکمل یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ آج بھی یہ قبرستان والا شارٹ کٹ استعمال کر رہا تھا۔ مگر آج قبرستان میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ چوڑی پیشانی پر پسینے کے قطرے اسے اس کے خوف کا احساس دلا رہے تھے۔ مگر وہ رکا نہیں۔ اپنی اس عجیب کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ آدھا قبرستان عبور کرچکا تھا۔ کہیں کوئی بھی ایسی علامت نظر نہیں آتی تھی جسے دیکھ کر وہ اپنے ڈوبتے دل کی وجہ جان سکتا۔ مگر کچھ تو تھا جس کو اس کی چھٹی حس محسوس کر رہی تھی۔ قبرستان ختم ہونے میں چند گز کی دوری رہ گئی تھی کہ

اچانک اسے دل کو چیر دینے والی ایک چیخ سنائی دی۔ چیخ اس کے بائیں طرف سے سنائی دی تھی۔ وہ جیسے ہی بائیں طرف مڑا تو بدن پر لرزہ طاری کرنے والا ایک منظر اس کا منتظر تھا۔ ایک پکی قبر پھٹی پڑی تھی اور اس میں سے آگ کی ہلکی ہلکی لپٹیں باہر نکل رہی تھیں۔ ایسی آگ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ خون رنگ اور شعلے ایسے جیسے بڑے بڑے سانپ پھنکار رہے ہوں۔ وہ غیر ارادی طور پر آگ کی طرف بڑھنے لگا۔ قبر کے پاس پہنچتے ہی اس کی تجسس کی حس جاگ اٹھی اور وہ بنا سوچے سمجھے قبر کے اندر جھانکنے لگا۔ قبر کی گہرائی پاتال

WWW.AOURDUBOOKS.NET

کی گہرائیوں سے بھی زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی چیخ سنائی دی اس بار اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ ایک مادر زاد برہنہ انسان گہرائیوں میں سے جیسے اڑتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ پھر قبر کے دہانے سے دو فٹ اوپر آکر ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر چیختا ہوا قبر کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ قبر کا دہانہ تو عام قبروں جیسا تھا مگر اس کے اندر آگ کا ایک وسیع سمندر پھیلا ہوا تھا۔ جس میں سے شعلے اٹھتے تھے تو ساتھ ہی وہ آدمی بھی چیختا ہوا اوپر اٹھتا تھا۔ ابھی وہ یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ پھر سے چیخ سنائی دی اور جیسے ہی وہ شخص اوپر آیا۔

اچانک رپورٹر نے بے اختیارانہ ہاتھ بڑھا کر اسے بازو سے پکڑ لیا اور چاہتا تھا کہ اسے باہر کھینچ لے کہ اچانک اس شخص کا وزن بڑھ گیا۔ رپورٹر نے یہ محسوس کرتے ہی اسے چھوڑ دینا چاہا مگر اس عذاب میں مبتلا شخص نے اس کی کلائی پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے کس لیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ رپورٹر کے پاؤں زمین سے اکھڑے اور وہ قبر کی گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ خوف کی زیادتی نے اس سے اس کے ہوش وحواس چھین لئے۔ اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اسے جب ہوش آیا تو خود کو ایک سرخ زمین پر پایا۔ یہاں پر جابجا تھوہڑ کے پودے اگے ہوئے تھے۔ اور جگہ جگہ پانی کے تالاب نما گڑھے تھے۔ جن میں پانی کی جگہ خون اور پیپ کھول رہی تھی۔ اس جگہ پر اسے عجیب سی وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک بھیانک انکشاف ہوا۔ وہ کسی قیدی کی طرح بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ''لے چلو اسے داروغہ کے پاس اس نے جو گناہ کیا ہے اس کی سزا اسے داروغہ ہی دے گا۔'' اس کے پیچھے سے ایک کڑکتی آواز ابھری تو وہ اندر تک ہل گیا۔

جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کی روح فنا ہوگئی۔ اتنی ڈراؤنی شکل اور ایسے لمبے چوڑے جسم اس نے زندگی میں پہلی دفعہ دیکھے تھے۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے قبر والے آدمی کا بازو پکڑا تھا۔ اس احساس سے ہی اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا کہ نہ جانے اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ بدہیت مخلوق تعداد میں چار تھے۔ انہوں نے اس کو اٹھایا اور ایک طرف چل دیئے۔ سرخ زمین ایک جگہ سے ٹیلہ نما تھی۔ اس ٹیلے پر پہنچتے ہی دوسری طرف اسے ایک چار دیواری نظر آئی جو عجیب دھات سے بنی ہوئی تھی اور اس کی دیواریں تاحد نظر اطراف میں اور آسمان کی طرف پھیلی ہوئی تھیں غرضیکہ ان دیواروں کا کوئی آخری سرا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس چار دیواری میں ایک بہت بڑا دروازہ لگا ہوا تھا۔ جس کے باہر دو دربان مقرر تھے ان کی ہیئت بھی انہی لوگوں سے ملتی جلتی تھی جو اسے اٹھائے ایک طرف لئے جارہے تھے۔ چار دیواری کے سامنے کافی دور ایک بہت بڑا محل سا بنا ہوا تھا۔ وہ چاروں اسے اٹھائے اندر داخل ہوگئے۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے وہ اسے ایک دربار نما جگہ پر لے آئے۔ سامنے ایک بہت بڑا تخت لگا ہوا تھا۔ جس پر ان چاروں سے زیادہ خوفناک شخص براجمان تھا۔

''تو یہ ہے وہ شخص جس نے ہمارے کام میں مداخلت کی ہے۔'' تخت نشین کے منہ سے ایک کڑکتی آواز نکلی۔ ''کیا نام ہے تمہارا۔'' پھر سے سوال ہوا۔ رپورٹر نے تھوک سے گلا تر کیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

''کک.....کا.....کامران۔''

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ قدرت کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے۔ اس خطا پر تمہارا کیا حشر ہونے والا ہے جانتے ہو۔'' تخت نشین نے قدرے غصے میں پوچھا۔

''حق.....قدرت کے کام، میں سمجھا نہیں، میں کہاں ہوں؟'' کامران نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم اس وقت جہنم کی سرزمین پر ہو۔ میں جہنم کا داروغہ ہوں۔ جس شخص کو عذاب دیا جارہا تھا وہ ایک بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ خدا نے اسے قیامت

تک عذاب میں مبتلا رکھنے کا حکم دیا ہے مگر تم نے ہمارے کام میں ٹانگ اڑادی۔ بولو کیوں کیا تم نے ایسا۔'' داروغہ کی آواز آخری جملہ کہتے ہوئے اور بھی اونچی ہوگئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بجلیاں کڑک رہی ہوں۔ جب کامران نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو داروغہ بولا۔ ''لے جاؤ اس نابکار کو اور اس کی روح کو جہنم کی آگ میں ڈال دو۔''

''رک جاؤ!'' اچانک ہی یہ آواز سنتے ہی کامران کی طرف بڑھنے والے وہ چاروں شخص رک گئے اور آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک معصوم اور پاکیزہ صورت بیس سالہ نوجوان تھا جو صورت سے کوئی شہزادہ لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر سونے کا تاج تھا اور اس نے اپنا لباس پہن رکھا تھا کہ کامران نے کبھی زندگی میں نہ دیکھا تھا۔

اسے دیکھتے ہی داروغہ تخت سے اترا اور ایک سائیڈ پر تعظیم کے انداز میں کھڑا ہوگیا۔ ''اس شخص نے بے شک گناہ کیا ہے۔ مگر وہ اس سے انجانے میں ہوا اور جب تک اس کی عمر باقی ہے اسے دنیا میں چھوڑنا پڑے گا۔ ویسے بھی یہ ایک حساس دل نرم طبیعت کا مالک ہے۔ اس نے بے شک حقوق اللہ چھوڑ رکھے ہیں۔ مگر حقوق العباد کا اس نے ہر طرح سے خیال رکھا ہے۔ کسی پڑوسی کو تنگ نہیں کیا۔ کسی کے ساتھ فراڈ نہیں کیا اور نہ ہی اس نے اپنے بچوں کو کبھی حرام کا لقمہ کھلایا۔ اپنی کمائی میں سے اس نے ایک مخصوص حصہ غریبوں کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اگر اس سے کوئی رشتہ توڑتا ہے تو یہ بغیر مفاد کی طلب رکھے اس رشتہ کو جوڑتا ہے۔ پھر کون سا ایسا گناہ تم نے دیکھا کہ اسے دوزخ میں لے جارہے ہو۔'' ایک مفصل تقریر کے بعد نوجوان نے داروغہ کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھا۔

داروغہ پشیمان انداز میں نظریں نیچی کئے کھڑا رہا۔ جب خوبصورت نوجوان نے اسے خاموش دیکھا تو کامران کی طرف بڑھا۔ کامران کا ہاتھ پکڑتے ہی اس کی زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ اور اس کے قدم ہوا میں اٹھ گئے۔ کافی دیر اوپر اٹھنے کے بعد وہ ایک مانوس ماحول میں تھا۔ یہ قبرستان تھا اور اسی قبر کے پاس وہ دونوں کھڑے تے۔ مگر اب قبر صحیح سلامت تھی اور کوئی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ کامران حیرت زدہ سا اس ماحول کو دیکھے جارہا تھا۔ سب کچھ اسے ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا اس نے اپنی انگلی دانتوں میں دبا کر زور سے کاٹا تو تکلیف کا احساس ہوتے ہی اسے معلوم ہوگیا کہ یہ سب حقیقت ہے۔ خوب صورت نوجوان اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ''اب تم یہاں سے جاؤ اور آئندہ خدا کے کاموں میں دخل نہ دینا۔ خدا کے حکم پر آج تو میں نے تمہیں بچالیا مگر آئندہ مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔'' خوب صورت نوجوان اپنی بات مکمل کر کے اسے دیکھے جارہا تھا۔

''مگر تم کون ہو، اور یہ سب کیا تھا اس شخص کو کیوں عذاب دیا جارہا تھا۔''

حالات ٹھیک ہوتے ہی اس کی متجسس فطرت جاگ اٹھی۔

''تم یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو، بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہوا تھا اور حقوق العباد کے ساتھ حقوق اللہ بھی پورے کرو۔ نماز پڑھا کرو، روزے کا اہتمام خشوع وخضوع سے کیا کرو۔'' خوبصورت نوجوان نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے پتہ چل جائے کہ اس آدمی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تو میں ایک رپورٹ بناؤں گا اسے اخبار میں شائع کرواؤں گا۔ ہوسکتا ہے اس واقعہ کو جان کر اور بھی کئی لوگ اپنے آپ کو درست کرلیں۔'' کامران نے پرزور دلیل دی۔ ''ٹھیک ہے، اگر تم ضد کرتے ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ میں تمہارے کندھوں پر بیٹھے دونوں فرشتوں میں سے ایک ہوں مجھے تمہاری نیکیوں کا حساب لکھنے کے لئے اس بلند مرتبہ ذات نے مقرر کیا ہے۔ جس خدا نے یہ کائنات تخلیق کی تمہیں اور مجھے بنایا اسی نے تم انسانوں کے لئے دو راستے بھی بنادیئے۔ ایک راستے پر چل کر اس ذات کی قربت حاصل ہوتی ہے اور دوسرا راستہ تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ تم انسانوں کو ہم سے افضل اسی لئے کہا

www.paksociety.com

گیا ہے کہ عیش ونشاط کے راستے کو چننے کا اختیار ہوتے ہوئے بھی تم پرہیز گاری کا راستہ چنتے ہو۔ مگر انسانوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دنیا اور اس کے لطف بھرے لالچ کی خاطر اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کر لیتے ہیں۔ یہ انسان جو عذاب میں مبتلا تھا یہ بھی ''نفس عمارہ'' کی تسکین کے لئے خدا کے احکاموں کو بھول گیا اور شرک کر بیٹھا۔ اس شخص نے دنیاوی لذتوں کی خاطر خدا کی قربت کا راستہ چھوڑ کر تباہی و بربادی کا راستہ اختیار کیا۔

اس کا نام شاہد تھا۔ دس سال کی عمر میں ہی اس کی ذہانت کا لیول بہت ہی شاندار تھا۔ اس نے ایک غربت زدہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والد صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور اسے بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ بچپن میں تو وہ باپ کے ساتھ مسجد جاتا اور ان کی پیروی میں نماز ادا کرتا۔ مگر جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے دماغ میں باغیانہ خیالات کی یلغار ہونے لگی۔ اس کا باپ ''پانی پوری'' بیچتا تھا۔ اس کم آمدنی سے وہ گھر کا خرچ بھی چلاتا تھا۔ اور اس کی پڑھائی کا خرچ بھی ادا کرتا تھا۔ اکثر جب وہ اپنے کلاس فیلوز کو رنگ برنگی چمکتی گاڑیوں پر آتے دیکھتا تو اس کے باغیانہ خیالات اور پروان چڑھتے۔ ماں کی بات اسے یاد آتی تو وہ چڑ سا جاتا۔ اس کی ماں اسے کہا کرتی تھی۔ ''بیٹا ہر حال میں خدا کا شکر ادا کیا کرو۔ شکر کرنے سے اللہ زیادہ دیتا ہے۔ کچھ کھاؤ تب بھی شکر ادا کرو۔ کسی مصیبت سے بچ جاؤ تب بھی شکر ادا کرو۔'' وہ اسی امید پر ماں کے کہنے پر عمل کرتا کہ شاید اللہ دوسرے دن اس کی قسمت پلٹ دے۔ وہ سو کر اٹھے تو یہ ٹوٹا پھوٹا گھر ایک محل بن جائے۔ شاندار گاڑیاں اس کے محل کے باہر کھڑی ہوں اور وہ اکیلا ان کا مالک ہو۔ مگر اس کی یہ امید نا امید ہی رہی۔ آہستہ آہستہ اس نے شکر کرنا چھوڑ دیا۔ نمازیں تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا اس کی سوچ کے مطابق یہ (نعوذ باللہ) ایک فضول کام تھا۔

شیطان بھی ایسے لوگوں کی تاک میں رہتا ہے جو خدا سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اس ذات کو صرف ایک وہم خیال کرتے ہیں۔

انہی دنوں اس کے گھر کے سامنے والے گھر میں ایک پراسرار شخص آ کے رہنے لگا۔ وہ گھر کافی وسیع و عریض تھا اور شاہد کے گھر سے کئی گنا بڑا تھا۔ شاید شاہد کا خیال اس کی طرف نہ جاتا مگر چند پراسرار باتوں کی وجہ سے وہ اس شخص کی ٹوہ میں لگ گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ پہلے پہل تو وہ شخص موٹر سائیکل پر آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس سے ملنے ملانے والے لوگ لمبی لمبی گاڑیوں پر آتے تھے۔ شاہد اس کو اس لئے نظر انداز کر دیتا کہ ہو سکتا ہے یہ لوگ اس کے جاننے والے یا رشتہ دار ہوں جو کہ خود تو امیر ہیں مگر یہ بے چارہ ان سے غریب ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں وہ شخص ایک نئی ماڈل کرولا میں نظر آیا اور پھر دو ہفتوں کے بعد اس شخص کے پورچ میں لینڈ کروزر اور دو اور گاڑیوں کا اضافہ ہو گیا۔ جن کو وہ شخص خود استعمال کرتا تھا۔ اپنی چھت پر چائے پیتے ہوئے شاہد اسی شخص کے گھر میں جھانک رہا تھا کہ سامنے برآمدے سے وہ شخص نکلا اور شاہد کی طرف دیکھ کر اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ فاصلہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ بھی شاہد کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

شاہد نے حیرت سے پہلے پیچھے اور پھر دائیں بائیں دیکھا مگر وہاں ایسا کوئی نہیں تھا جس کو دیکھ کر وہ سمجھتا کہ سامنے گھر والے نے اسے اشارہ کیا ہے۔ پھر جیسے ہی اس نے سامنے دیکھا تو اس شخص نے شہادت کی انگلی اس کی طرف کی۔ شاہد نے اپنے ہاتھ کو موڑتے ہوئے چاروں انگلیاں سینے پر رکھ کر اس سے تصدیق چاہی تو اس شخص نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاہد سیڑھیوں سے بھاگتا ہوا اترا اور دروازہ کھولتے ہی سامنے گیٹ پر اس شخص کو اپنا منتظر پایا۔ اس شخص نے اسے آنے کا اشارہ کیا اور خود مڑ کر گیٹ کے پیچھے غائب ہو گیا۔ شاہد نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر وہ اس شخص کے گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ اس کا تباہی کے

راستے پر پہلا قدم تھا۔

وہ شخص اس کو لئے برآمدے سے گزرتا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں طرح طرح کی خوشبوئیں اور اگربتیوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ سامنے دیوار میں ایک بڑا سا چوکھٹا بنا ہوا تھا۔ اگربتیوں کے دھوئیں کا مخرج وہی تھا۔ اس چوکھٹے میں ایک بڑی سی مورتی ایستادہ تھی۔ اس پراسرار شخص نے پہلے مورتی کو سجدہ کیا اور پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہد حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

''شاہد آگے آؤ اور مورتی کو پرنام کرو۔'' پراسرار شخص نے بغیر مڑے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ شاہد نے کسی معمول کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی۔

پھر وہ دونوں چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ شاہد اس شخص کی امارت سے بے پناہ مرعوب ہو رہا تھا۔ اس شخص نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو شاہد صوفے پر بیٹھتے ہی جیسے اس میں دھنس سا گیا۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟'' شاہد نے حیرت و بے یقینی کی کیفیت سے باہر آتے ہی ہونٹوں پر مچلتا سوال داغ دیا۔

''میں تو تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں کس کسمپرسی کی حالت میں تم نے اب تک زندگی گزاری ہے اور انہی حالات سے تمہیں نکالنے کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔'' پراسرار اجنبی نے خاموش ہو کر اس کی حالت کا لطف اٹھایا۔ ایک مکروہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

''کیا واقعی؟ تم میری زندگی بدل دو گے۔ میں بھی اپنے دوستوں کی طرح زندگی کا لطف اٹھا سکوں گا۔'' شاہد نے خوشی سے چیختے ہوئے سوال کیا۔

''نہ نہ، میں نہیں، تم خود اپنی زندگی بدلو گے۔ تم نے سنا ہو گا کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔'' اجنبی نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''میرے پاس تو ایسا کچھ بھی نہیں جو میں تمہیں دے سکوں۔'' شاہد نے پرخیال انداز میں کہا۔

''میں تم سے کوئی چیز نہیں لوں گا بلکہ میں تمہیں اپنے مذہب میں شامل ہونے کی دعوت دوں گا۔ اگر تم نے یہ قبول کر لیا تو ہر طرح کا عیش و آرام تمہیں ملے گا۔ دوسری صورت میں تم اسی غربت کی چکی میں خود پستے رہو گے۔'' اجنبی نے دانہ پھینک دیا تھا اب صرف دیر تھی شاہد کے منہ مارنے کی۔

شاہد اپنے مستقبل کے سہانے خواب بننے میں مصروف ہو گیا۔

''اگر تمہیں منظور نہیں تو ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو اور اس بات کو بھول جانا۔''

اجنبی نے اسے خاموش ہوتے دیکھا تو جانے کیا سمجھا۔

''نہیں نہیں میں تمہاری پیشکش قبول کروں گا۔ ویسے بھی میرے مذہب نے مجھے کیا دیا ہے۔ صرف بھوک، لاچاری اور احساس کمتری، میں تو بہت پہلے کا اپنے مذہب کو خیر باد کہہ چکا ہوں۔ تم بتاؤ تمہارے مذہب کے لئے یعنی اس میں شامل ہونے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا۔'' شاہد نے تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھے! مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔ زیادہ مشکل نہیں۔ تم کو اس مورتی کو سجدہ کرنا ہو گا اور ہر اتوار کے دن اپنے گھر میں اس کی پوجا کرنی ہو گی۔ جس کا طریقہ میں تمہیں بتا دوں گا۔'' اجنبی نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر شاہد اس شخص کے رنگ میں رنگتا گیا۔ اس شخص کا نام نرائن تھا۔ اس نے شاہد کو بہت سے جنتر منتر سکھائے شاہد کو ایک علیحدہ گھر لے دیا۔ جس کے نیچے میں ایک تہہ خانہ تھا جس میں اس نے ہر طرح کی مورتیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس نے گھر میں ماں باپ کو بتایا تھا کہ اس کی ایک اچھی جگہ پر نوکری لگ گئی ہے۔ سارا دن وہ ادھر ادھر آوارہ گھومتا رہتا۔ کبھی کسی فحاشی کے اڈے پر، تو کوئی دن اس کا کسی شراب خانے میں گزرتا، رات ہوتے ہی وہ گھر آتا اور جب ماں باپ سو جاتے تو تہہ خانے میں اتر جاتا اور بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر

www.aiourdubooks.net

نرائن کے بتائے ہوئے اشلوک پڑھتا رہتا۔

اسی طرح کی ایک رات شاہد کی ماں کی کھٹکے سے آنکھ کھلی تو اس نے ساتھ سوئے ہوئے خاوند کو بھی جگادیا۔ اتفاقاً اس دن شاہد کے کمرے میں موجود تہہ خانہ کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کے ماں باپ جب اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس دروازے کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گئے۔ پھر سب سے پہلے شاہد کے باپ کو ہوش آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ زور زور سے اشلوک پڑھنے کی آوازیں ان کی سماعتوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ وہ دونوں تہہ خانے میں اترے ہی تھے کہ انہیں اپنی زندگی کی تلخ سچائی کا سامنا ہوا۔ ایک بڑا سا بت جس کے بہت سے ہاتھ تھے۔ ہر ہاتھ میں کوئی نہ کوئی اوزار تھا۔ کسی میں تلوار تو کسی ہاتھ میں ترشول اس بت کے سامنے اس کا بیٹا آنکھیں بند کئے سجدہ ریز تھا اور اس کے منہ سے اشلوک کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

''شاہد!'' شاہد کے باپ کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑی شاہد کی ماں بھی خوف سے کانپ رہی تھی۔

شاہد کے اشلوک بند ہوئے اور وہ کھڑا ہوگیا ان کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

''تو آخر آپ لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا۔''

''ہاں ہم تجھ بدبخت سے آج واقف ہو ہی گئے۔ نہ جانے میری تعلیم میں ایسی کون سی کمی رہ گئی تھی جو تو نے ہمیں یہ دن دکھایا۔'' ''چھی'' مجھے تو تجھے بیٹا کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ ہم دونوں گناہوں سے بھرے اس گھر سے جارہے ہیں۔'' اتنا کہہ کر شاہد کا باپ پلٹا۔

''رک جایئے ابو۔'' شاہد کی آواز پر وہ پلٹا تو شاہد بولا۔ ''میں نے یہ سب کچھ آپ کے سکھ کے لئے کیا ہے اور یقین جانئے جب سے میں نے وہ مذہب چھوڑ کر یہ سچا مذہب اختیار کیا ہے مجھ پر بھگوان کی کرپا ہوگئی ہے میری مانیں تو آپ بھی میرے بھگوان کو سجدہ.....'' شاہد کی بات منہ میں ہی تھی کہ تھپڑ کی آواز سے تہہ خانہ گونج اٹھا۔

''دور ہٹ جا ذلیل! اپنا ناپاک جسم مجھ سے دور لے جا۔ مجھے تیرے کفرانہ خیالات کا علم ہوتا تو پیدا ہوتے ہی تیرا گلہ گھونٹ دیتا۔ چل بلقیس۔'' شاہد کے باپ نے آخری الفاظ اپنی بیوی سے کہے اور جانے کے لئے پلٹ گیا۔ ابھی دونوں کے قدم تہہ خانے کی ابتدائی سیڑھیوں پر ہی تھے کہ تلوار کی چمک ایک پل کو ابھری اور دونوں کے سر کٹ کر سیڑھیوں سے لڑھکتے چلے گئے جبکہ دھڑ ایک دھماکے سے سائیڈ پر گر گئے۔ تہہ خانے کا فرش خون سے سرخ ہو چکا تھا اور شاہد کے والدین کے کٹے سروں کی آنکھوں میں ابھی تک حیرت بھری ہوئی تھی۔

''کیا غلط کیا تھا میں نے آپ دونوں کے لئے دولت کمائی اور آپ نے مجھے ہی غلط کہا یہی نہیں بلکہ مجھے تھپڑ بھی مار دیا۔'' شاہد خون آلود تلوار ہاتھ میں لئے ان کے اردگرد گھوم کر ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔

اچانک اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈر کر تہہ خانے کے اندھیرے کونے میں ہوگیا۔ سیڑھیوں سے اترنے والا نارائن تھا۔

شاہد بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ ''نارائن میں نے ایسا کچھ نہیں چاہا تھا۔ نہ جانے یہ سب کچھ کیسے ہوا۔'' نارائن نے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میرا یقین کرو میں نے جان بوجھ کر.....'' شاہد کی بات نارائن کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔

''تم نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا۔'' نارائن نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا اور تمہارے اس کام سے خوش ہو کر دیوتاؤں نے تمہیں وہ آئینہ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے جس کے حصول کے لئے بہت لوگ اپنی جان گنوا بیٹھے ہیں۔'' شاہد اس کا جواب سن کر پرسکون ہوگیا اور چند لمحے بعد پوچھا۔

''ایسا کیا ہے اس آئینے میں؟''

''وہ بہت بیش قیمت آئینہ ہے۔ بظاہر تو وہ ہاتھ

میں پکڑنے والا ایک عام سا آئینہ ہے مگر اس کی سطح پر ہاتھ رکھ کر اگر کوئی خواہش کی جائے تو وہ پلک جھپکتے پوری ہوجاتی ہے۔ ان لاشوں کو اسی تہہ خانے میں گاڑ دو اور میرے ساتھ آؤ۔'' نارائن اتنا کہہ کر تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔

شاہد نے اپنی ماں اور باپ کی لاشوں کو وہیں دفنایا اور تہہ خانے سے نکل کر نارائن کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ نارائن کے کہنے پر اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر اس کے حکم پر جب آنکھیں کھولیں تو وہ ایک پہاڑوں کی وادی میں موجود تھے۔ بلند و بالا پہاڑ ان کے چاروں اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

''یہاں سے تم اکیلے آگے جاؤ گے۔ وہ سامنے والا پہاڑ چڑھو گے تو تمہیں ایک شہر کے کھنڈرات نظر آئیں گے۔ ان کھنڈرات میں بہت سے گھر ہیں جو تباہ ہوچکے ہیں مگر ایک گھر ایسا ہے جو ابھی صحیح سلامت ہے۔ اس میں داخل ہوجانا۔ اس گھر کے کسی کمرے میں وہ آئینہ ہے۔ تم نے بغیر کسی چیز کے ہاتھ لگائے وہ آئینہ اٹھالینا ہے اور جلدی سے وہاں واپس آجانا ہے۔ یاد رہے اس آئینہ کو اس کے دستے کی طرف سے پکڑنا ہے۔ اس کی سطح پر تمہارا ہاتھ نہ لگے۔'' اتنا کہہ کر نارائن نے اسے الوداع کیا اور وہ اونچے پہاڑ کی طرف بڑھ گیا جس کے پیچھے اس کا مستقبل آئینہ کی شکل میں اس کا انتظار کررہا تھا۔

وہ ایک ڈھلوان نما پہاڑ تھا۔ اس کی چوٹی پر پہنچنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ دوسری طرف نارائن کے کہنے کے مطابق کھنڈرات موجود تھے۔ جو ایک ایسے شہر کی نشان دہی کررہے تھے جس پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ شاہد کو کافی تھکاوٹ محسوس ہورہی تھی اور پیاس کا بھی شدت سے احساس ہورہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھنڈر کی طرف بڑھا چلا جارہا تھا۔ آئینہ کے حصول کی آس اس کی قوت ارادی میں اضافہ کررہی تھی۔

پھر وہ کھنڈرات کے گرد گھومتا اس کے گھر کے پاس پہنچ گیا جس کی حالت دوسرے تمام گھروں سے علیحدہ تھی۔ وہ گھر اب بھی ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے ابھی ابھی تیار کیا ہو۔ شاہد نے گھر کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ توقع کے خلاف وہاں کا ماحول کافی فریش تھا۔ مگر گھر میں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صحن سے گزر کر وہ گھر کے اندرونی دروازے تک پہنچا مگر زور لگانے پر پتہ چلا کہ وہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ گرتا پڑتا وہ مکان کے سائیڈ پر آیا تو ایک کھڑکی اسے کھلی ہوئی ملی۔ اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی اور کھڑکی کا پٹ پکڑ کر اندر کود گیا۔ مگر اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ ڈر کر دیوار سے لگ گیا۔ اندر ایک لڑکی اور لڑکا لباس سے بے نیاز راز و نیاز میں گم تھے۔ مگر کافی دیر تک دیکھنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ حرکت نہیں کررہے۔ وہ اپنے آپ ہی ہنسنے لگا کہ بے جان مجسموں سے ڈر گیا ہے۔ ان کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا آئینہ بیڈ پر پڑا تھا۔ جس کے اوپر مرد کا ہاتھ تھا۔ وہ اس آئینہ کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھا تو اسے عجیب سا احساس ہوا۔ لڑکی اور لڑکے کی آنکھیں حرکت کررہی تھیں وہ دونوں اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہیجان خیز سانسوں کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ فطری حالت میں ایک دوسرے میں جذب تھے۔ شاہد نے ان کا بغور جائزہ لیا تو یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ دونوں زندہ تھے۔ مگر نہ جانے کیوں حرکت نہیں کررہے تھے۔

شاہد کو حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے اس نے ڈرتے ڈرتے آئینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یک لخت لڑکے کی نظریں ترچھی ہوکر اس پر جم گئیں۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ خشک ہوتے گلے سے اس نے کمرے میں نظر دوڑائی تو ایک سائیڈ پر فریج پڑا تھا۔ اس نے لپک کے فریج کا دروازہ کھولا۔ سامنے ہی گلاس پڑا تھا اس نے اٹھایا اور جلدی سے لبوں سے لگالیا۔ پہلا گھونٹ ہی اس کے سینے میں چبھتا ہوا اترا۔ پانی کا ذائقہ بہت تلخ ہورہا تھا۔ مگر اس کو پیاس اتنی لگی ہوئی تھی کہ بنا سوچے سمجھے وہ اسے غٹاغٹ پی گیا۔ پیاس

بھوک جاگ گئی اس نے فریج میں پڑے فروٹ میں سے دو سیب اٹھائے اور کچھ ہی دیر میں دونوں کھا گیا۔ خلاف توقع سیبوں کا ذائقہ بالکل فریش تھا۔

پیٹ بھرنے کے بعد اسے اپنے مقصد کا خیال آیا تو وہ اسی بیڈ کی طرف بڑھا۔ اب اسے ان مجسمہ نما انسانوں سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے آئینے کی دستی پر ہاتھ جمایا اور آہستہ سے اسے کھینچ لیا۔ لڑکی اور لڑکے کی نظروں میں تاسف ابھرا مگر شاہد نے خیال کو پس پشت ڈالا اور کھڑکی سے باہر کودا۔ دوڑتا ہوا وہ پہاڑ پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ نارائن وہیں کھڑا تھا۔ جیسے ہی وہ نارائن کے قریب گیا۔ نارائن دہشت زدہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا ہوا؟" شاہد نے حیرت سے اسے پیچھے ہٹتا دیکھا تو بولا۔

"نہیں بچو گے، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" نارائن اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

مگر اس کی بڑبڑاہٹ شاہد سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"کیا ہوگیا ہے کیوں مجھے بھی ڈرا رہے ہو۔ بات کیا ہے کچھ بتاؤ گے بھی۔" شاہد نے ہراسانہ انداز میں کہا۔

"منع کیا تھا تمہیں، منع کیا تھا نا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔" نارائن نے چیخ کر کہا وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

"میں نے تو کسی چیز کو بھی نہیں چھوا۔" شاہد نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"ہو ہی نہیں سکتا تمہارے ماتھے پر یہ پیپ بھرے دانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ تم نے میرے کہنے پر عمل نہیں کیا۔" نارائن کی بات سن کر شاہد کا ہاتھ بے اختیار اپنی پیشانی کی طرف بڑھ اور اسے اپنی انگلیوں پر چپ چپاہٹ کا احساس ہوا اس کے ماتھے پر بے شمار دانے نکل آئے تھے جن میں سے پیپ بہہ رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے، کیا یہ وہ سیب کھانے کی بدولت ہوا ہے۔" شاہد اپنی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"یہ سیبوں کی وجہ سے نہیں بلکہ پانی کے اس گلاس کی وجہ سے ہے جو اس لڑکی نے اپنی رقیب سے انتقام لینے کے لئے رکھا ہوا تھا مگر تم نے پی لیا۔" نارائن نے اسے ترس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون لڑکی، کون رقیب وہاں تو دو مجسموں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔" شاہد نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں واقعی کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر تم نے جو مجسمے دیکھے وہ مجسمے نہیں تھے دو زندہ انسان تھے ان سے بھی اس آئینے کی کہانی جڑی ہوئی تھی۔ ٹھہرو تمہیں ایسے پتہ نہیں چلے گا میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔

وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ دولت اس کے گھر کی باندی تھی۔ ہر آسائش اسے میسر تھی مگر بھگوان کے کام ہیں کہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کی رنگت توے کی طرح کالی تھی۔ اس کی نسبت بچپن سے ہی اپنے چچازاد عبید سے طے ہوگئی تھی مگر جیسے جیسے وہ جوانی کی طرف بڑھتے گئے۔ عبید اس سے اتنا ہی کترانے لگا جتنا وہ اس کے پاس جاتی۔ وہ اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔ مگر عبید اس کو منہ بھی نہیں لگاتا تھا۔

اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ وہ یونیورسٹی میں ایک مہوش نامی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے۔ مہوش بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ اس رات وہ لڑکی کرن پھوٹ پھوٹ کر روئی اور دل میں تہیہ کیا کہ وہ کسی بھی طرح عبید کو مہوش کے چنگل سے چھڑائے گی اور پھر اس نے کالے علم کے عاملوں کی طرف رجوع کیا۔ مگر کسی عامل سے اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ایک دن اسے اپنی نوکرانی سے پتہ چلا کہ شہر سے کافی دور جنگل میں ایک سنیاسی آیا ہوا ہے۔ اس کے پاس ایسی طاقت ہے کہ محبوب چند دنوں میں ہی آپ کے قدموں میں ہوگا۔ نوکرانی نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ سنیاسی اتنا پہنچا ہوا ہے کہ آپ کی کالی رنگت بھی چاند کی طرح گوری ہو جائے گی۔

یہ سب باتیں سن کر کرن اتنی بے تاب ہوئی کہ

فوراً میں اسی وقت نوکرانی کو ساتھ لیا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔

"تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا۔" کرن نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"کیونکہ میرے ہاں اولاد نہیں تھی میں بھی کسی کے کہنے پر وہاں گئی اس سنیاسی نے مجھے ایک دوا پلائی اور چند ماہ میں ہی میری گود ہری ہوگئی۔" نوکرانی نے جواب دیا۔

پھر باتوں ہی باتوں میں وہ جنگل کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ گاڑی سے اتری اور کرن کی پیروی میں جنگل کے اندر موجود ایک جھونپڑی میں پہنچ گئی۔

جھونپڑی میں اس وقت کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ اچانک ہی جھونپڑی کے وسط میں سے ایک شخص دروازہ کھول کر اوپر آ گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی تہہ خانے میں سے خوشبوئیں اور اگربتیوں کا دھواں بھی باہر نکلنے لگا۔ سنیاسی کی لمبی جٹائیں اس کے کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ اس کی حالت سے لگتا تھا کہ اسے نہائے ہوئے بھی کافی عرصہ ہوگیا ہے۔

"آؤ کرن آؤ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ تمہارے آنے کی خبر ہوئی تو ہم اپنی پوجا چھوڑ کر تمہارے استقبال کے لئے آ گئے۔" سادھو نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آ..... آپ کو م..... ہم میرا نام کیسے معلوم ہوا۔" کرن نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو تمہارے من میں چھپے ہر سوال کا پتہ ہے۔ یہی نہیں میں تمہاری خواہش کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔ بہت جلد تم اپنے کالے رنگ اور اپنی دشمن مہوش سے چھٹکارا حاصل کرلو گی۔" سادھو نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا واقعی؟" کرن نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے انداز میں پوچھا۔

"بالکل! آؤ میرے ساتھ اور لڑکی تم یہیں رکو جب تک ہم واپس نہیں آتے۔" سادھو نے آخری جملہ نوکرانی سے کہا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ کرن بھی اس کی پیروی میں اس کے پیچھے تہہ خانے میں اتر گئی۔ تہہ خانہ کیا تھا، رنگ برنگے بتوں کی آماجگاہ، پہلے تو کرن کے ضمیر نے اسے ملامت کی مگر سب کچھ پالینے کی خواہش نے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ سادھو نے اسے اپنے سامنے تہہ خانے کے فرش پر بیٹھایا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ایک پیالے میں کچھ سفوف اور پانی ملایا اور کرن سے پینے کو کہا۔ وہ بغیر تردد کیے سارا پیالہ غٹا غٹ چڑھا گئی۔ سفوف پیتے ہی اسے اپنا ذہن گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے سادھو کی ہوس بھری آنکھوں کی چمک بڑھتے دیکھی اور پھر وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگئی۔

جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اس کی عصمت اس کی حیا اس سے چھین لی گئی تھی۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ یہاں آئی تھی۔ اپنی بے بسی پر وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اچانک اس نے آہٹ سنی اور جیسے ہی سر اٹھایا تو اس کے سامنے ایک خوب صورت لڑکی کا چہرہ تھا۔ نین نقش ہو بہو اس جیسے تھے آنسو اس لڑکی کی آنکھوں سے چشمے کی طرح بہہ رہے تھے۔ اس کے حواس کچھ سمجھنے کے قابل ہوئے تو اسے علم ہوا کہ وہ لڑکی اور کوئی نہیں بلکہ اس کا اپنا عکس ہے جو سادھو کے ہاتھ میں پکڑے آئینے میں نظر آ رہا ہے۔

"رونے کی ضرورت نہیں، اب تو تم ان دیوتاؤں کی نظر میں اور بھی مقدس ہوگئی ہو اور ویسے بھی تم نے جو کھویا ہے اس کے بدلے تمہیں کافی زیادہ ملنے والا ہے۔ پکڑو یہ آئینہ اس آئینے کی سطح پر ہاتھ رکھ کر تم جو خواہش کرو گی وہ پوری ہو جائے گی۔" سادھو نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اور ایک بات اگر تم اس آئینے کو میرے خلاف استعمال کرنا چاہو گی تو نہ صرف تم سے تمہاری خوب صورتی چھن جائے گی بلکہ تمہارا محبوب بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے دور ہو جائے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

سادھو کی باتیں کرن کے جیسے دل میں اتر رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت دور ہو چکی تھی۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ توے کی طرح کالی رنگت جو لاکھوں دواؤں کے بعد بھی نارمل نہ ہوئی اپنی عزت کی بھینٹ دینے کے بدلے وہ دودھ سے بھی سفید ہو چکی تھی۔

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' کرن نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور چاہتی تھی کہ تہہ خانے سے باہر نکل جائے کہ سادھو کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''تم اپنی خوشی میں اسے بھولے جا رہی ہو۔'' سادھو نے آئینہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''جب بھی تمہیں کچھ مانگنا ہو اس آئینہ کی سطح پر ہاتھ رکھنا اور اپنی خواہش کا اظہار کر دینا۔'' کرن نے سادھو سے آئینہ لیا اور ایک بار پھر شکریہ ادا کرتی وہاں سے نکل آئی۔ گھر آ کر سب سے پہلے وہ عبید کو ملی وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مگر اپنے فیصلے سے وہ اب بھی دستبردار نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے سامنے دنیا کی حسین و جمیل لڑکی بھی آ جائے تو وہ صرف مہوش سے ہی شادی کرے گا۔

کرن اندر ہی اندر جلتی بھنتی گھر آ گئی۔ انتقام کی چنگاری اس کے دل میں جل اٹھی تھی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے اپنے بیڈ روم کو اندر سے بند کیا اور بیڈ پر دراز ہو کر بیگ میں سے وہ آئینہ نکالا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آئینہ کی سطح پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ مہوش کا خوب صورت چہرہ پیپ بھرے دانوں سے بھر جائے یہی نہیں بلکہ آہستہ آہستہ اس کے پورے جسم پر پھوڑے نکل آئیں وہ کوڑھ زدہ ہو جائے اور پھر دو ہفتوں میں ہی اس کی موت ہو جائے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو آئینے میں سے قوس قزح کی روشنیاں نکلیں اور پھر غائب ہو گئیں۔ کرن نے آئینے پر سے ہاتھ اٹھایا تو اس کی سطح پر ایک تحریر نظر آ رہی تھی۔

''مہوش چونکہ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہے اس لئے آئینے کے بیر اس کے قریب بھی نہیں جا سکتے یہ کام آئینے کے مالک کو خود کرنا پڑے گا۔ تمہارے دائیں ہاتھ پانی کا ایک گلاس پڑا ہے۔ کسی طریقے سے یہ گلاس اسے پلا دو تو تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔'' اتنا پڑھ کر کرن نے آئینہ تکیہ کے نیچے رکھا اور دائیں سائیڈ پر دیکھا۔ ٹیبل پر واقعی ایک گلاس پانی پڑا تھا۔ وہ خوشی سے مسرور ہو گئی۔ اب اس کی کامیابی یقینی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور بہت احتیاط سے ایک کونے میں پڑے فریج میں رکھ دیا۔ جس میں انواع و اقسام کے پھل پڑے تھے۔ کچھ دیر تک وہ ایک گھناؤنا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اس نے آئینہ دوبارہ تکیہ کے نیچے سے نکالا اور اس کی سطح پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں آج کا دن عبید کی بانہوں میں گزارنا چاہتی ہوں۔ اس کے ذہن میں صرف میں ہی رہوں کوئی مہوش نام کی لڑکی ہماری تنہائی میں مخل نہ ہو۔''

اتنا کہہ کر اس نے آئینہ سائیڈ پر رکھا اور ایک زہریلی مسکراہٹ سجائے آنے والے لمحات کو سوچ کر خوشی سے سرشار ہو گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ اس نے کمرے کی سائیڈ کھڑکی کھولی باہر دیکھا تو عبید تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اس کے اندر آنے پر اندر سے لاک کر دیا۔ عبید ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں چلتا ہوا بیڈ پر جا بیٹھا۔ کرن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا جلدی اس کا قرب پانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے تپتے ہونٹ عبید کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ پھر کب وہ لباس کی قید سے آزاد ہوئے کچھ پتہ نہیں تھا۔ جذبات کے سمندر میں دونوں غوطہ زن تھے۔ اسی مکروہ فعل کے دوران کرن نے ہیجان بھری آواز میں پوچھا۔ ''عبید کبھی مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے۔''

''کبھی نہیں مجھے تو یہ یقین نہیں آ رہا کہ میں اتنے دن تم سے دور کیسے رہا۔ جو لطف کے لمحات میں تمہارے سنگ گزار رہا ہوں۔ یہ میری زندگی کا بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔'' اتنا کہہ کر عبید نے اسے چوما اور اچانک ہی اس کا ہاتھ آئینے کی سطح پر پڑ گیا۔ نشاط کے آخری لمحوں میں عبید

نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''آہ تم کتنی پیاری ہو۔ کاش کے اس شہر میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو اور یہ کیف و نشاط کے لمحے یہیں ساکت ہو جائیں۔'' عبید کا اتنا کہنا تھا کہ ایسے لگا جیسے باہر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ دونوں اسی لمحہ بت بنے رہ گئے اور سارا شہر ویران ہو گیا۔''

اتنا کہہ کر نارائن نے چپ سادھ لی۔ وہ خاموشی سے شاہد کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو اس وقت اپنے منہ پر ہاتھ رکھے خوف بھرے انداز میں کچھ سوچ رہا تھا۔

''تو کیا وہ گلاس جو میں نے پانی سمجھ کر پیا اس دوا والا تھا۔ کیا میں دو ہفتوں میں مر جاؤں گا؟'' گھبراہٹ اس کے بشرے سے عیاں تھی۔

''ہاں۔'' نارائن نے مردہ لہجے میں صرف اتنا ہی کہا۔

اچانک شاہد کو آئینے کا خیال آیا تو امید بھری آواز میں بولا۔ ''کیا اس آئینے سے میں اپنی زندگی نہیں مانگ سکتا۔''

''جتنی تلخ حقیقت یہ ہے کہ دو ہفتوں میں تم تڑپ تڑپ کے مر جاؤ گے اتنا ہی کڑوا سچ یہ بھی ہے کہ اس آئینے سے جو کام ایک دفعہ لے لیا جائے وہ کبھی واپس نہیں پلٹتا۔ سنسکار کا نیم ہے کہ جو وقت گزر جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا'' نارائن نے گھمبیر آواز میں کہا۔

کچھ دیر توقف کے بعد شاہد نے اسے چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ؟''

اس کے اچانک سوال پر نارائن نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''اس واقعے سے پہلے اگر تم یہ سوال کرتے تو میں کبھی جواب نہ دیتا۔ مگر چونکہ اب تم مرنے والے ہو اس لئے بتائے دیتا ہوں۔ ''مجھے ان واقعات کا اس لئے پتہ ہے کہ کرن کو وہ آئینہ دینے والا سنیاسی بھی میں ہی ہوں۔ میں ہر دور میں ہر تاریخ میں موجود ہوں جو خدا سے منکر لوگوں کو بہکاتا ہوں ان کی چھوٹی چھوٹی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر ان کی روح اتنی پلید کر دیتا ہوں کہ وہ جہنم کی آگ میں جل جل کے بھی پاک نہیں ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہی ہے کہ خدا وہ ہے جسے تم نے جھٹلا دیا۔ قیامت تک میں آدم کی اولاد کو بہکاتا رہوں گا۔'' اسی وقت نارائن کی شکل بہت بھیانک ہو گئی اس کے سر کے بال سانپ بن کر ہوا میں کھڑے ہو گئے۔ شاہد نے وہ آئینہ ایک جھٹکے سے پتھر پر دے مارا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''یہاں تک کہہ کر فرشتہ خاموش ہو گیا۔

کامران نے اگر یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پر بھگتا نہ ہوتا تو وہ اسے الف لیلوی داستان سمجھتا۔ مگر اب اس نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو گا۔ اور ہمیشہ یہ بھی احتیاط کرے گا کہ وہ کسی کی دل آزاری کا باعث نہ بنے۔

☆.....☆.....☆

''ویلڈن مسٹر عقیل! تم نے جو اسٹوری سنائی شاید ہی تمہارا حریف تم سے جیت سکے۔ خوف کے ساتھ ساتھ تم نے اس میں ایسا سبق آموز نتیجہ دیا ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اپنے اعمال کا احتساب نہ کرے۔ بہت اچھے مسٹر عقیل! بہت خوب۔''

کبڑا اسفند یار اس کہانی کو سن کر جیسے بہت محظوظ ہوا تھا۔ ''اب رات ہونے والی ہے۔ تم اپنے اپنے کمروں میں آرام کرو۔ عتیق کی کہانی کل سنی جائے گی۔'' محفل برخواست ہوتے ہی سب کو بھوک کا احساس ہوا۔ اسفند یار بھی اس بات سے آگاہ تھا تبھی اس نے کہا ان کا کھانا ٹیبل پر لگوا دیا تھا۔ کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے، عقیل کا آج اکیلے میں جی گھبرا رہا تھا۔ ایک نامعلوم سی گھبراہٹ اس کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ اس کو اس وقت کسی شخص کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اسفند یار نے اسے بلکہ سب کو علیحدہ علیحدہ رہنے کا سختی سے حکم دیا تھا اور انہوں نے بلا چوں و چرا اس کی بات مان لی تھی۔ آدھی رات

www.KitaboSunnat.com

تک وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر جانے کب نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوئی اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ رات کا آخری پہر تھا جب اچانک کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں کھلتے ہی لاشعوری کیفیت میں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چھت والا پنکھا اپنی پوری رفتار سے گھوم رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ شعور کی دنیا میں واپس آ گیا۔ سردی کے موسم میں پنکھا کوئی بے وقوف ہی چلا سکتا تھا اور جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا سوتے وقت پنکھا بند تھا۔ اس نے پنکھے کا سوئچ اوپر کردیا۔ وہ واپس پلٹنے والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "رات کے اس وقت کون ہوسکتا ہے۔" عقیل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا دروازہ کھلتے ہی اسے حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ باہر کوئی نہ تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر راہداری میں دیکھا مگر نتیجہ صفر رہا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے مڑا اور بیڈ کی طرف بڑھا مگر اگلے ہی لمحے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس کا ذہن تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

"یہ عقیل کہاں رہ گیا؟" گوہر نے اونچی آواز میں پوچھا سب اس وقت اسی ہال میں ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ سب آ چکے تھے مگر عقیل ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر دانش اٹھا اور ہال کے مخصوص دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

"کمال ہے یار آج دوسرا دن ہے اور ابھی سے اتنی سستی نواب صاحب اپنی کہانی سنا کر ایسے گھوڑے بیچ کے سوئے ہیں کہ جیسے ان کی کہانی پر ہی مقابلہ ختم ہوگیا ہے۔" عتیق نے جھلائے انداز میں کہا۔

"لگتا ہے بے چارہ تھک گیا ہوگا۔ آج اسے آرام کرنے دینا چاہیے۔" ادھیڑ عمر عورت نے پہلی بار زبان کھولی۔

"نہیں شکیلہ بانو! کوئی رائٹر تو کیا کوئی بھی فنکار اپنے فن کے معاملے میں کبھی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا خاص طور پر جب......" اور پھر عتیق کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کیونکہ دانش بھاگتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" گوہر نے بھی گھبرائے انداز میں پوچھا۔

"عقیل اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اس کا سیل بھی اس کے بیڈ پر پڑا ہے۔" دانش نے ایسے کہا جیسے بہت بڑا انکشاف کیا ہو۔

"تو کیا ہوا ہوسکتا ہے وہ کہیں ادھر ادھر پھر رہا ہو یا باتھ روم میں ہو۔" گوہر نے ایسے انداز میں کہا جیسے دانش کی بیوقوفانہ بات پر اسے بہت برا لگا ہو۔

"میں نے اس کا سارا کمرہ چیک کیا ہے اور وہ بنا بتائے کیسے اور کہاں جاسکتا ہے۔" دانش کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ اسفند یار ہال میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم! معزز مہمانو آپ کا ایک ساتھی تو واپس چلا گیا کہ اسے بہت ضروری کام تھا۔ اب آپ کی رائے پر ہم اس کا نام اس مقابلے میں سے خارج کر دیتے ہیں اور اگر آپ کو یہ اچھا نہ لگے تو اسے برقرار رکھتے ہیں۔" اسفند یار نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔ مگر سب لوگوں کی خاموشی محسوس کر کے جب ان کے چہروں پر نظر ڈالی تو سب گومگو کی حالت میں اسے تکے جا رہے تھے۔

"کیا ہوا آپ لوگوں کو آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنی دور سے آنے اور اتنی اچھی اسٹوری سنانے کے بعد کوئی شخص اس طرح چلا جائے۔ "I can`t belive this" شکیلہ بانو نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"رائٹ آپ نے بالکل ٹھیک کہا اور وہ اپنا سیل بھی یہی بھول گیا۔" ثوبیہ نے شکیلہ کی بات آگے بڑھائی۔

"بھئی! یہ تو آپ لوگ اس سے پوچھے گا۔ مجھے تو اس نے رات کو ہی کہا کہ میں واپس جانا چاہتا ہوں میں

نے بہت روکا اسے مگر وہ ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بالآخر میں نے شہروز کو کہا کہ اسے بحفاظت بس اڈے پر پہنچا آؤ۔"

اسفند یار سچ کہہ رہا تھا، بہت بڑا ایکٹر تھا۔ تمام لوگوں نے اس کے لہجے اور آنکھوں سے جھلکتی سچائی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیا۔

"عتیق صاحب خوش ہو جایئے آپ کا حریف تو دم دبا کر بھاگ گیا۔" ایک نوجوان جو عتیق کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے اس بات کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اگر وہ یہاں رہتا بھی تو میری کہانی سننے کے بعد اسے جانا پڑتا۔ اچھا ہوا کہ چلا گیا۔ فضول میں ٹائم ضائع کرتا۔" عتیق نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تو برخوردار! اب تم کیا چاہتے ہو کہ تمہارے حریف کا نام لسٹ سے خارج کر دیا جائے یا اسے برقرار رکھا جائے۔" اسفند یار نے عتیق سے پوچھا۔

"جیسے آپ کی مرضی ویسے بھی یہ مقابلہ میں نے ہی جیتنا تھا۔" عتیق کی بات پوری ہوتے ہی ہال میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں سب کی متفقہ رائے سے آپ کو آگاہ کروں۔"

عتیق کے سامنے بیٹھے نوجوان نے ڈائریکٹ اسفند یار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بتاؤ تمہارے ذہنوں میں کیا ہے۔" اسفند یار نے نوجوان کو اجازت دی۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو شخص چلا گیا ہے اسے مقابلے سے خارج کریں۔ ویسے بھی اگر وہ جیت گیا تو اس کا انعام ہم کیسے دیں گے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں سلیم صاحب! کہ وہ شخص یعنی عقیل ہی جیتے گا۔ ہم بھی تو گھر سے اس فیسٹیول میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔" ایک چھوٹے قد کی لڑکی نے کڑھتے ہوئے کہا اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

"بیٹھ جاؤ سلمٰی! اور سلیم صاحب آپ بھی بیٹھیں" اسفند یار نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں عقیل کو اس ٹورنامنٹ سے خارج کرتا ہوں اور عتیق کا میچ دوبارہ فکس کرتے ہوئے اس کا حریف سلیم کو ٹھہراتا ہوں کیونکہ افراد کی گنتی طاق ہوتے ہوئے سلیم ابھی تک کسی سے اٹیچ نہیں ہے۔ کیا آپ سب کو یہ فیصلہ منظور ہے۔" اسفند یار نے تقریری انداز میں کہا۔

"بالکل مجھے قبول ہے۔" سلیم کے ساتھ ہی ہر فرد کے منہ سے یہی الفاظ نکلے۔ "تو پھر ہم اگلی کہانی عتیق سے سنتے ہیں جس کے بعد سلیم صاحب کا نمبر آئے گا۔" اسفند یار نے اپنا فیصلہ سنایا تو سب کے سر اثبات میں ہلنے لگے۔

عتیق اپنی کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے گویا ہوا۔

انٹرویو کال آتے ہی بخاری کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بہت دنوں بعد اسے کسی جاب اپلی کیشن کا جواب موصول ہوا تھا۔ بخاری کی زندگی کے اکیس سال بہت غربت اور تنگی میں گزرے تھے۔ وہ آٹھ سال کا تھا جب اس کا باپ فوت ہوگیا۔ ایک بڑا بھائی ریاض تھا جو خود ماں پر بوجھ تھا۔ اس کے اور ریاض کے درمیان پورے تیرہ سال کا فرق تھا۔ غربت انسان کو بہت سے تجربے سکھا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے بخاری بھی آٹھ سال کا ہونے کے باوجود بھی روپوں اور چیزوں کو بہت گہرائی سے پرکھنے لگا تھا۔ اس کا باپ ایک خاکروب تھا۔ بیماری بھی خدا کی دین ہے مگر وہ جس طرح کا کام کرتا تھا ایسے کاموں میں بیماریاں تو بندے کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔ بخاری دو سال کا تھا جب اس کا باپ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوا اور خون تھوک تھوک کے مر گیا۔ ریاض اس کا بڑا بھائی ماں باپ کے لاڈ میں ایسا بگڑا کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اوباش لوگوں کی محبت میں بیٹھنا شروع کردیا۔ باپ کے مرنے سے پہلے تو گھر کا خرچ آسانی سے چلتا رہا مگر اس کی موت کے بعد نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ریاض کو اس کی ماں نے پیار سے سمجھایا کہ بیٹا گھر کی طرف دھیان دے تیرے باپ کے مرنے کے بعد اب تو ہی ہمارا واحد سہارا ہے۔ ماں کی بات سن کر وہ بولا! "مجھے تو کوئی کام آتا نہیں میں کیا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گھر کا دھیان رکھوں۔"

"بیٹا جمعدار آیا تھا کہہ رہا تھا کہ تیرے باپ کی جگہ وہ تجھے ملازمت دے سکتا ہے۔ دیکھ جب تک بچہ چھوٹا ہوتا ہے اسے والدین کھلاتے ہیں اور جب بڑا ہوجائے تو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ والدین کا سہارا بنے۔" ماں کی بات سن کر وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"تم نے مجھے اتنا گیا گزرا سمجھا ہوا ہے کہ میں یہ کام کروں گا۔"

اس کے چیختے لہجے نے فاطمہ کو حیران کر دیا تھا۔ اس طرح تو اس نے کبھی بات نہیں کی تھی۔

"میں ہاتھ پیروں والا ہوں۔ کم از کم اتنا تو کما سکتا ہوں کہ خود کا پیٹ بھر لوں میرا گزارا ہو رہا ہے۔ تم دونوں اپنا بندوبست خود کر لو۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے بیٹا! تیرے بھائی کی تو ابھی عمر بھی اتنی نہیں کہ میں اسے کسی کام پر چھوڑ آؤں۔"

"تو کیا ہوا تمہارے ہاتھ پیر تو سلامت ہیں۔ خود نہیں کوئی کام کر سکتی۔ کرو کام اور اپنا بھی پیٹ پالو اور اس کا بھی۔" ریاض نے آخری الفاظ بخاری کو دیکھتے ہوئے ادا کیے۔ "شاباش، بیٹا شاباش! نہ جانے تیری پرورش میں ہم سے ایسی کیا کوتاہی ہوگئی کہ آج یہ دن دیکھنا پڑا۔ مجھے تیری شکل سے بھی گھن آرہی ہے نکل جا یہاں سے پہلے بڑوں کا ادب سیکھ پھر میرے گھر واپس آنا۔" فاطمہ کے صبر کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔

"یہ گھر تمہارا نہیں جو تم مجھے حکم دو گی اور میں نکل جاؤں گا۔ تم لوگ یہاں رہنا چاہتے ہو تو چپ چاپ رہو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور اگر مجھے نکالنے کی بات ہوئی تو میں تم پر کورٹ میں کیس کر دوں گا۔" ریاض کی بات فاطمہ کے دل پر بجلی بن کر گری۔ پھر اسی دن سے اس نے چپ سادھ لی۔ بخاری یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا اور اس کی حساس طبیعت نے اس کے دل میں اپنے بھائی کے لئے نفرت کا خانہ کھول دیا تھا۔

ایک دن فاطمہ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ ریاض ڈرگز بھی لیتا ہے۔ اولاد چاہے کیسی بھی ہو ماں اس کو موت کے منہ میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔ اسی وقت فاطمہ نے اس سے ہیروئن کا پیکٹ چھینا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

"یہ کیا زہر پینا شروع کر دیا ہے تو نے۔" فاطمہ نے روہانسی آواز میں پوچھا۔ پہلے تو ریاض چند لمحے ماں کو دیکھتا رہا پھر اچانک اس پر جھپٹ پڑا۔ بالوں سے پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ بے چاری کا سر چارپائی کے پائے پر پڑا۔ جس میں سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ ریاض نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لاتوں گھونسوں سے اس کا انجر پنجر ہلا دیا۔ بخاری دور کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماں سے بھی بہت پیار کرتا تھا جبکہ بھائی کی مار سے بھی ڈرتا تھا۔ فاطمہ بے ہوش ہو چکی تھی مگر ریاض اس کے بے ہوش وجود پر بھی لاتوں، ٹھڈوں کی برسات کر رہا تھا۔ جب وہ مار مار کر تھک گیا تو اپنا ہیروئن کا پیکٹ اٹھایا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ بخاری نے ساتھ والے پڑوسی کو بلا کے جیسے تیسے ماں کی مرہم پٹی کرائی۔ ریاض پورا ایک ہفتہ گھر سے غائب رہا۔ اسی بیچ بخاری نے ماں سے کہا۔ "امی ایک بات کہوں مانو گی۔"

"ہوں۔" فاطمہ کے ہاتھ مشین کی دستی پر پھرتی سے چل رہے تھے اور وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ اسی لئے اس نے بخاری کو مختصر سا جواب دیا۔

"امی آپ جمعدار سے کہیں کہ وہ ابو کی جگہ مجھے کام پر رکھ لے۔ آپ دن رات سلائی کرتی ہیں آخر آپ کو بھی نیند تو آتی ہوگی نا۔"

بخاری کے معصوم چہرے پر ماں نے ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی اسے اس پر ڈھیروں پیار آیا۔ اتنی کم عمر میں وہ اس کے منہ سے ایسی باتیں سن کر بہت حیرت زدہ ہوئی۔ اسے یکبارگی خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی اور رونا بھی آرہا تھا فاطمہ نے مشین پرے دھکیلی اور اسے گود میں اٹھا کر چومنا شروع کر دیا۔

"نہیں بیٹا میں تمہیں اتنی سی عمر میں کام پر نہیں لگاؤں گی۔ جب تک میں زندہ ہوں تم کو فکر کرنے کی

ضرورت نہیں اور رہی بات آرام کرنے کی تو اس عمر میں نیند آتی کہاں ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ آنکھ لگ جاتی ہے وہ ہی غنیمت ہے۔" وہ بخاری کو سینے میں بھینچے بولے جا رہی تھی۔

اگلے دن اس کی کمائی کا واحد سہارا وہ مشین بھی اس سے چھن گئی۔ تھکاوٹ سے چور جب اس نے سوٹ مکمل کر کے ذرا آنکھ لگائی تو کچھ ہی دیر میں ریاض گھر میں داخل ہوا۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہی اسے سامنے سلائی مشین نظر آئی جو اس نے اٹھائی اور گھر سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد فاطمہ کی آنکھ کھلی تو اسے بخاری سے پتہ چلا کہ ریاض مشین لے کر باہر چلا گیا ہے۔ فاطمہ ایک دم ڈھے سی گئی اس کی روزی روٹی کا وسیلہ وہ ایک مشین ہی تھی۔ کچھ دن بعد ہی فاقوں کی نوبت آ گئی۔

اسی دن جمعدار پھر گھر آ گیا اور فاطمہ سے کہا۔ "بہن اس نوکری پر تمہارے خاوند کے بعد تمہارے بیٹے کا حق بنتا ہے اور میں زیادہ دن تک اوپر کے دباؤ کو روک نہیں سکتا۔ اب اگر تم نے نہ کی تو مجبوراً مجھے اور بندہ لگانا پڑے گا۔"

"آپ مجھے لے جائیں میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" بخاری نے ماں کے بولنے سے پہلے ہی تیزی سے کہا۔

اور پھر ماں کے نہ نہ کرنے کے باوجود بخاری نے اتنی ضد کی کہ فاطمہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اسی دن سے بخاری نے کام شروع کر دیا۔ وہ صبح سویرے نماز پڑھ کر ڈیوٹی پر چلا جاتا۔ سارا دن ایک مخصوص علاقے میں جھاڑو دیتا اور شام کو گھر واپس آ جاتا۔ کچھ دنوں بعد اس نے شام میں اسکول جانا شروع کر دیا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے نئے گھر کے لئے کچھ رقم پس انداز کرنا شروع کر دی۔ چار سال تک اس کے پاس پچاس ہزار کی خطیر رقم جمع ہوگئی تھی۔ انہی دنوں ریاض پھر گھر میں داخل ہوا اور اس بار اس کا رویہ پہلے سے بہت بدلا ہوا تھا اس نے ماں سے معافی مانگی اور بھائی کو بھی بہت پیار کیا۔ فاطمہ سمجھ رہی تھی کہ ریاض شاید سدھر چکا ہے مگر اگلی رات ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی جب ریاض نے میٹھی میٹھی باتوں کے دوران ماں کو بتایا کہ "وہ بیرون ملک جانا چاہتا ہے اور اسے پچاس ہزار کی سخت ضرورت ہے۔"

"میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں اور میں تمہاری چاپلوسی کو اب سمجھی ہوں۔" فاطمہ نے اسے انگارہ برساتی آنکھوں سے دیکھا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے لاڈلے کے پاس تو اتنے پیسے ہوں گے ہی اتنے سال سے کام جو کر رہا ہے۔"

ریاض کا پرانا لہجہ لوٹ آیا۔ اسی بیچ بخاری بھی کمرے میں داخل ہوا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم یہ میٹھی میٹھی باتیں اپنی کسی غرض کے لئے کر رہے ہو مگر ماں کو خوش دیکھ کر میں بولا نہیں اور ہاں اب میں بچہ نہیں رہا جو تم ماں کو ہاتھ لگاؤ گے اور میں چپ رہوں گا۔" بخاری نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تیری یہ جرأت تالیاں صاف کرنے والے تو مجھے ہی دھمکی دے رہا ہے۔"

ریاض نے اچانک اپنے نیفے سے پسٹل نکال لیا۔ فاطمہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "مارو گولی میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں، مارو۔" بخاری نے سینہ تانے چیختے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں میں اسے ماروں گا۔" ریاض نے مکارانہ انداز میں کہا اور پسٹل کا رخ فاطمہ کی طرف موڑ دیا۔

"نہیں تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" ایک دم ہی بخاری نے تڑپ کر کہا اور دو قدم آگے بڑھا۔

"پیچھے ہٹو! میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں میرے ہاتھ سے مرو۔ جلدی جاؤ اور ساری رقم جو تم نے اب تک جمع کی ہے مجھے لا دو۔ جاؤ۔" ریاض نے آخری الفاظ چیخ کر کہے تھے۔ "جاتا ہوں۔ مگر تم ماں کو کچھ نہیں کرو گے۔" بخاری کمرے میں پڑی سیف کی طرف بڑھا۔

دم جیسے ہی آوازوں کا شور بڑھا جگ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ فرش پر پڑا پتلا سا قالین پانی سے گیلا ہوگیا۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگادی۔ پانچ منٹ کسی قیامت کی طرح گزر گئے۔ جب اس کے اوسان بحال ہوگئے تو اس نے اپنا دھیان کام کی طرف لگانے کی کوشش کی مگر ذہنی انتشار کی وجہ سے اس سے کام ٹھیک طرح سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ خوف کی آہنی بازو اس سے دور ہٹتے چلے گئے اور ان کی جگہ فطری تجسس نے اس کو اپنے شکنجے میں لینا شروع کردیا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ایک خطرناک فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا آفس اسٹور روم کے بالکل اوپر بنا ہوا تھا۔ اتنا تو اسے پتہ تھا کہ اسٹور روم کا دروازہ اس کے دفتر کے بیک سائیڈ پر بالکل نیچے ہے مگر چوکیدار سے اسے پتہ چلا تھا کہ وہ تہہ خانہ نما ہے۔ متعدد بار اس نے جہازوں کے بڑے بڑے پرزوں اور بڑے سائز کے کنٹینروں کو بیک سائیڈ پر کرین کے ذریعے لے جاتے دیکھا تھا۔ بائیں سائیڈ پر اسے سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آتیں اس نے اپنے آپ کو صرف آفس اور گھر تک محدود رکھا تھا مگر آج جب وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اسے پوری کھیتی کو دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی سیمنٹ انہی سیڑھیوں سے شروع ہوگیا تھا۔ ابھی اسٹور کا دروازہ دور تھا کہ اسے اپنے پیچھے چوکیدار کی آواز سنائی دی۔

''رکیے صاحب'' بخاری نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی اور واپس مڑتے ہی کہا۔ ''میں ذرا چہل قدمی کے لئے اس طرف آ گیا تھا طبیعت گھبرا رہی تھی۔''

''کہیں آپ اسٹور کی طرف تو......'' چوکیدار نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں، بالکل نہیں۔'' بخاری نے گڑبڑائے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے مگر میں آپ کو ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ اسٹور روم سے دور ہی رہیں۔ آپ ابھی نوجوان ہیں بہت سی زندگیاں شاید ابھی باقی ہوں مگر خدانخواستہ آپ......''

''شٹ اپ'' بخاری ایک دم چیخ پڑا اور چوکیدار کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

''اب تم مجھے سمجھاؤ گے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ جب میں نے کہہ دیا کہ میں چہل قدمی کر رہا تھا تو تم کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو۔'' بخاری کو ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔ چوکیدار ''سوری صاحب'' کہتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

بخاری نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس نے پکا تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اسٹور روم کا راستہ معلوم کر کے رہے گا خواہ اس کے لئے اسے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی حسب معمول ماں کو اپنے انتظار میں پایا۔ ''امی کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ سو جایا کریں میں دوسری چابی سے دروازہ کھول کر آ جایا کروں گا۔''

اس نے جاتے ہی ماں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

اسے خود پر بھی شرمندگی ہوتی تھی اور وہ ہر بار گھر ٹائم سے آنے کا فیصلہ کرتا تھا مگر کبھی کبھی کام کے دباؤ کی وجہ سے دیر ہو جاتی اور ماں کو اس کا انتظار کرنا پڑتا۔

''بیٹا مجھے تو پتہ ہے کہ جب تک تمہارا چہرہ نہ دیکھ لوں مجھے نیند نہیں آتی اور کتنے دنوں سے تم سے کہہ رہی ہو کہ شادی کے بارے میں سوچو مگر تم ہو کہ سنتے ہی نہیں، میرا کیا آج ہوں کل......'' بخاری نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسی باتیں نہ کیا کریں، خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اپنے پوتوں کے پوتوں کو بھی دیکھیں۔''

فاطمہ ہنس پڑی اور بولی۔ ''جھوٹی تسلی مت دو شادی تو کرتے نہیں اور پوتوں کے پوتوں کی بات کرتے ہو۔''

''شادی کروں گا مگر کوئی لڑکی ایسی ملے بھی جو

آپ کے ہینڈسم بیٹے کے معیار پر پوری اترے۔'' بخاری نے کپڑے چینج کیے ہاتھ منہ دھویا۔ فاطمہ نے کھانا لگادیا تھا بخاری نے کھانا کھایا اور پھر دونوں سونے کے لئے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☆......☆......☆

اگلے دن اس نے منصوبہ بنانا شروع کردیا کہ وہ اسٹور روم کا راز کس طرح کھول سکتا ہے۔ مگر سب سے بڑی مشکل چوکیدار تھا۔ اس نے سوچا کہ چند دن معمولات کے مطابق کام کرتا رہے گا اور جب چوکیدار مطمئن ہو جائے گا تو پھر وہ اپنا کام بہت احتیاط سے شروع کرے گا۔ مگر تقدیر کو شاید کچھ اور منظور تھا۔ وہ کام میں منہمک تھا کہ اسے اپنے روم کے دروازے کے آگے سے کسی کے گزرنے کا احساس ہوا۔ بھاری بوٹوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی ایسے لگتا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ بخاری اچانک اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ کوئی شخص تھا جو نیچے سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ بخاری تقریباً بھاگتا ہوا موڑ تک پہنچا اور اس شخص کی پشت پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ اور کوئی نہیں تھا بلکہ اس شپ کمپنی کا مالک جواد احمد تھا۔

بخاری اسے سینکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ ''باس اس طرف کیا کرنے جا رہے ہیں؟'' بخاری بڑبڑایا۔

جواد احمد اسٹور روم کے گیٹ پر جا چکے تھے۔ ان کا آدھا چہرہ بخاری کو نظر آ رہا تھا۔ اس نے ریسٹ واچ پر ٹائم دیکھا تو بارہ بج کر انچاس منٹ ہو رہے تھے گویا گیارہ منٹ میں وہ شور پھر سے شروع ہونے والا تھا۔ مگر جواد احمد کی وہاں موجودگی اچنبھے میں ڈال رہی تھی۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابیاں نکال لیں۔

بخاری غیر ارادی طور پر ان کے پاس چلا گیا اور اس پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔

جواد احمد اس وقت نیند میں تھے یعنی ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ تالا کھول رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ بخاری ان کو روکتا وہ لرزہ خیز چیخوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بخاری اتنا ہراساں ہوا کہ سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سیدھا چوکیدار کے پاس پہنچا مگر خلاف توقع چوکیدار گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی چوکیدار کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور لاشعوری طور پر اسے دیکھنے لگا۔ پھر جب اس کو تھوڑا ہوش آیا تو ''سوری صاحب'' کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''صاحب یقین جانئے میں ڈیوٹی پر کبھی نہیں سوتا مگر آج نہ جانے......''

چوکیدار اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب اس کی نظر بخاری کے چہرے پر پڑی جو پسینے سے تر ہو رہا تھا تو اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

بخاری کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ ڈرے ڈرے انداز میں بار بار تھوک نگلتے ہوئے پیچھے دیکھ رہا تھا۔

''صاحب خیریت تو ہے۔'' چوکیدار نے بھی اس کی دیکھا دیکھی اس کے پیچھے نظر ڈالتے ہوئے گھبرائے لہجے میں کہا۔

''و...... و...... وہ...... صص...... صاحب...... بب بڑے صاحب......'' بخاری نے انگلی کا اشارہ تہہ خانے کی طرف کیا اور اتنا ہی بول سکا۔ چوکیدار نے اپنے پاس پڑا تھرماس نما مگ اٹھایا اور گلاس میں پانی ڈال کر بخاری کو دیا۔ وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ آوازوں کا شور ختم ہو چکا تھا۔

''صاحب آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ بڑے صاحب تو رات آٹھ بجے ہی چلے گئے تھے۔ ارے یہ ان کی گاڑی پھر سے یہاں......''

چوکیدار نے ایک دم سائیڈ پر کھڑی لیموزین پر نظر پڑتے ہی چونکتے ہوئے کہا۔

''یہی تو کہہ رہا ہوں۔ باس رات کے اس وقت تہہ خانہ یعنی اسٹور روم میں جا رہے تھے اور ان کی حالت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔'' بخاری اپنے حواس پر کنٹرول کر چکا تھا۔

''اوہ میرے خدا کہیں انہیں کچھ ہو نہ جائے جلدی کرو، آؤ اکٹھے وہاں چلتے ہیں۔'' چوکیدار نے اپنی گن اٹھائی اور دونوں بھاگتے ہوئے بیسمنٹ کی

WWW.AOURDUBOOKS.NET

سیڑھیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ جیسے ہی وہ اسٹور کے قریب پہنچے تو جواد احمد کی فلک شگاف چیخ نے ان کا استقبال کیا۔ اسٹور روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ چابیاں تالے میں لگی ہوئی تھیں جبکہ اسٹور کے اندر کافی اندھیرا تھا۔ چوکیدار نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ جلائی۔ شیشم کی لکڑی کے تختوں سے بنی سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ چوکیدار نے پیچھے مڑ کر بخاری کو دیکھا جو سراسیمہ حالت میں کھڑا تھا۔

''اب سوچنے اور ڈرنے سے کچھ نہیں ہوگا ہمیں باس کو بچانا چاہئے نہ جانے انہیں کیا ہوا ہے۔'' چوکیدار یہ کہتا ہوا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ بخاری کی نظر تالے پر پڑی تو کسی خیال کے تحت اس نے تالے میں سے چابی نکالی اور اسے رنگ میں سے نکال کر جیب میں ڈال لیا، باقی چابیوں سمیت رنگ اس نے زمین پر پھینک دیا۔ اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ تہہ خانے میں روشنیوں کا سیلاب آ گیا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ تہہ خانہ بہت وسیع تھا۔ جتنے رقبے پر کمپنی بنی ہوئی تھی اس کے نیچے ایک بڑے ہال کی صورت میں یہ تہہ خانہ بنا ہوا تھا۔ جس میں جگہ جگہ بجری اور ہوائی جہازوں کے بڑے بڑے پرزے تیل کے ڈرم اور کنٹینر پڑے ہوئے تھے کچھ کباڑ ایسا تھا جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

پھر ایک طرف نظر پڑتے ہی وہ جیسے سکتے میں آ گیا۔ کمپنی کے مالک جواد احمد کی مسخ شدہ لاش ایک کنٹینر کے پاس پڑی تھی۔ چوکیدار بھی مین الیکٹرک بورڈ کے سوئچ کو پش کر کے وہ بھی بت بنا کھڑا تھا۔ لاش بالکل اس کے قریب پڑی تھی اور وہ یک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا۔

''کون ہے، یہاں باہر نکلو۔'' بخاری نے چیختے ہوئے کہا اور چوکیدار کو جیسے ہوش آ گیا۔ ''چپ کریں صاحب جلدی سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں جس طرح کی لاش کی حالت ہے کوئی انسان ایسا کر ہی نہیں سکتا۔'' چوکیدار نے بخاری کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں سخاوت! آج میں یہ معاملہ ختم کر کے ہی جاؤں گا۔ اسے میرے سامنے آنا پڑے گا جو ہمیں تنگ کررہا ہے۔'' بخاری نے چوکیدار سخاوت کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

''آپ پھر جیسے چاہیں کریں میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں جارہا ہوں۔'' چوکیدار نے اپنی ٹارچ اٹھائی اور بھاگتا ہوا تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ بخاری تمام خوف کو بالائے طاق رکھے اونچی آواز میں قاتل کو آوازیں لگاتا ادھر ادھر بھاگتا رہا، مگر وہاں کوئی ہوتا تو آتا۔ آخر تھک ہار کر وہ جواد احمد کی لاش کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ لاش کا چہرہ اور جسم کا گوشت مختلف جگہ سے نچا ہوا تھا۔ لاش کی حالت سے امید تو نہیں تھی کہ اس میں زندگی کی کوئی رمق ہو مگر بخاری نے پھر بھی اس کی نبض اور گردن پر ہاتھ رکھ کر چیک کیا۔ جواد احمد دنیا سے کوچ کر چکے تھے اور بخاری پچھتا رہا تھا کہ انہیں تہہ خانے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ ڈرا کیوں، انہیں روک کیوں نہ لیا۔ ابھی وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اسے تہہ خانے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے اطراف میں چاروں طرف نظر ڈالی مگر کوئی نظر نہ آیا۔ اس کی قوت سماعت کسی ذی نفس کے سانس لینے کی آواز سن رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی جان کنی کے عالم میں لمبے لمبے سانس لے رہا ہو۔'' سانس کی آواز کے ساتھ ہچکیوں سے مشابہ آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے والا بخاری نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ اب جو بخاری تھا وہ سرتاپا کانپ رہا تھا اور پسینے کے قطرے اس کے ماتھے اور کان کے پیچھے سے ہو کر گردن پر بہہ رہے تھے۔ اپنے دل کی دھک دھک اسے تہہ خانے کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ بخاری نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کوئی سحر سا تھا جس نے بخاری کے پاؤں جکڑ لئے۔ اس نے چلانا چاہا مگر خوف نے اس کی زبان تک سن کردی۔ اس کے دل کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ پورا جسم جیسے فالج زدہ

ہو گیا تھا صرف وہ سوچ سکتا تھا۔ اور پھر اس نے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ سنی۔

پیچھے جلتے انرجی سیورز کی روشنی میں اسے اپنے آگے ایک بھرا سایہ نظر آیا جو آہستہ آہستہ بڑھتا جارہا تھا۔ جو بھی تھا وہ اس کے پیچھے آ کر سر پر کھڑا ہو گیا۔ خوف کی شدید لہر بخاری کے سر سے پاؤں تک گزر گئی۔ وہ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس کا وجود اس بات سے انکار کررہا تھا۔ وہی لمبے لمبے سانس جو بخاری پہلے بھی سن چکا تھا۔ اب زیادہ قریب سے سنائی دینے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ سایہ جھکتا گیا اور پھر سائے کا سر اس کے سر کے قریب آ گیا۔ عجیب ناگوار سی بو اس کے سانسوں سے خارج ہورہی تھی۔ بخاری نے خوف کا صرف نام سنا تھا مگر آج اس کا رواں رواں اسی خوف کا شکار ہورہا تھا۔ کوئی سیال چیز اس کی گردن پر ٹپکی اور بہتی ہوئی سینے تک گئی پھر بنیان میں جذب ہو گئی۔ بخاری کا دل اس سے زیادہ برداشت نہ کر پایا اچانک ہی اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ ماؤف ہوتے ذہن سے اس نے سوچا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہے۔

جیسے تاریکی میں روشنی کا ایک نقطہ نمودار ہوتا ہے، ویسے ہی اس کے دماغ میں ایک چھوٹا سا نقطہ روشن ہوا اور پھر آہستہ آہستہ بڑا ہوتا چلا گیا۔ لاشعوری طور پر وہ چیخنے لگا مگر خود کو اسپتال کے بیڈ پر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ غیر ارادی طور پر وہ اپنے ہاتھوں اور جسم کو چھونے لگا۔ اس کے سامنے اس کی ماں کمپنی کے ورکر اور چوکیدار سخاوت کھڑا تھا۔ وہ خود کو زندہ اور ہلتا جلتا دیکھ کر کافی خوشی محسوس کررہا تھا۔ اس کی ماں بھی خدا کا شکر کررہی تھی۔

اچانک تمام ورکر ایک دم سائیڈ پر ہو گئے آنے والی ہستی کو دیکھ کر بخاری گنگ سا رہ گیا۔ خوب صورتی کا مرقع تھی وہ لڑکی۔ بخاری نے اگر حسن مکمل دیکھا تھا تو اس لڑکی میں، گول گول سیب کی طرح لال گالوں والی اس لڑکی کے ہونٹ پر موجود تل اس کے حسن کو آٹھ چاند لگائے ہوئے تھا۔ وہ اپنے لباس سے کسی امیر خاندان کی

طلباء کی جدید ڈکشنری

ڈیسک: لکڑی کا بنا ہوا ایک ایسا تکیہ جس پر عموماً طلبہ و طالبات سر رکھ کر اور گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔

چاک: طلبہ اس کو اپنے خیالات کے لئے استعمال کرتے ہیں، بعض اوقات اساتذہ کرام چاک سے سوئے ہوئے طلبہ کو جگانے کا کام لیتے ہیں بشرطیکہ ان کا نشانہ اچھا ہو۔

ڈسٹر: بوٹ اور سینڈل صاف کرنے کا کپڑا۔

گھنٹی: دنیا کی واحد بڑی طاقت جو اساتذہ کو کمرے سے باہر نکالتی ہے۔

آدھی چھٹی: اس وقفے میں رات دیکھی گئی فلم، اساتذہ کے موڈ اور ہیئر اسٹائل پر بحث ہوتی ہے۔

ہوم ورک: اس سے طلبا یہ پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا استاد بھی خلاصہ یا گائیڈ پڑھا ہوا ہے یا نہیں۔

(ہما۔ کراچی)

لڑکی لگتی تھی مگر اس کے چہرے پر اس وقت ملال برس رہا تھا۔ ''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔'' لڑکی کی آواز بھی اس کی طرح خوب صورت تھی۔

''مم..... میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔'' بخاری جو اسے گھورے جارہا تھا اس کے اچانک مخاطب کرنے پر سٹپٹا سا گیا۔

''میں اپنا تعارف بعد میں کرواؤں گی۔ آپ پہلے ٹھیک ہوں لیں آپ سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔'' لڑکی نے شاید اس کی حالت کو مدنظر رکھ کر زیادہ بات نہ کی اور پھولوں کا بکے پیچھے کھڑے ایک آدمی جو شاید اس کا ملازم تھا سے لیا اور بیڈ کے قریب رکھ کر واپس پلٹ

www.paksociety.com

گئی۔ مگر بخاری کو ایسے لگا جیسے وہ جاتے جاتے اس کا دل بھی ساتھ لے گئی ہو۔

دو دن بعد وہ اسپتال سے ڈسچارج ہوا اس کی ماں کو اصل حقیقت نہیں بتائی گئی تھی اسے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ بخاری کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ فیکٹری کے ورکرز سے اسے پتہ چلا تھا کہ سخاوت کے بتانے پر وہ صبح کے وقت تہہ خانے میں پہنچے تو جواد سیٹھ کی لاش کے پاس بخاری کو بے ہوش پایا اور وہ دونوں کو اٹھا کر باہر لے آئے مگر اس بات کو کمپنی کی بدنامی کے ڈر سے حادثے کا رنگ دے دیا گیا۔ جتنے ورکر آئے ہوئے تھے سب کو سختی سے تنبیہ کردی گئی کہ کوئی کسی قسم کی انوکھی بات یا تہہ خانے کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔ بخاری تقریباً چار پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا اور اب اس نے تہہ خانے کا راز جاننے سے توبہ کرلی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا جس نے اسے نئی زندگی دی تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ جتنا بھی کام کا بوجھ ہوگا وہ ایک بجنے سے پہلے ہی گھر چلا جایا کرے گا۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انسان کتنی ہی تدبیریں کرتا ہے مگر تقدیر کے آگے تدبیر کسی طفل مکتب کی طرح ہوتی ہے۔ تقدیر اپنا وار کرجاتی ہے اور تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ بخاری نے الارم ٹائم پیس میں بارہ بجنے کا الارم لگا کر تدبیر کی تھی مگر تقدیر اسے اس تہہ خانے کے راز سے واقف کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

صبح صبح جب وہ آکر اپنے آفس میں بیٹھا تو اسے باس کا بلاوا آگیا۔ وہ روم سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نیا باس کون ہوگا۔ شاید کمپنی کے ایم ڈی اکبر صاحب۔'' انہی سوچوں میں گھرا وہ باس کے آفس کے سامنے جا پہنچا۔ پہلی دستک پر ہی اسے اندر آنے کی پرمیشن دی گئی۔ آواز نسوانی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا ٹھٹک کر رک گیا۔ اسی دشمن جاں کی قاتل نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ محویت سے اسے دیکھے جارہا تھا۔ باس کے عالیشان آفس کی لمبی چوڑی میز کے پیچھے پڑی کرسی پر بیٹھی وہ بہت دل چسپی سے اس کی حالت سے محظوظ ہورہی تھی۔

''آر یو او کے مسٹر بخاری؟'' اس لڑکی کے اچانک پکارنے پر بخاری بوکھلا گیا۔

''نن...... نو میم...... یس میم...... یس میم۔'' بخاری کی بوکھلاہٹ عروج پر تھی۔ ''پلیز سٹ ہیئر'' لڑکی نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور بخاری عجلت میں ایسے ہوا کہ جیسے اس لڑکی کا حکم نہ ماننے پر اس کی روح قبض ہوجائے گی۔ اس نے کرسی سیدھی کی اور جیسے ہی بیٹھنے لگا اس کا سیدھا ہاتھ بوکھلاہٹ میں میز پر پڑے گلاس سے ٹکرایا، گلاس میں بھرا پانی ٹیبل پر پڑے شیشے پر کسی ندی کی صورت بہنے لگا۔ لڑکی نے جلدی سے ٹیبل پر پڑی فائل ایک سائیڈ پر کردی اور ٹیبل کی سائیڈ پر لگا بٹن پش کردیا۔ باہر گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور باہر کھڑے چپڑاسی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''آیا کو بلاؤ۔'' لڑکی نے سپاٹ لہجے میں چپڑاسی کو حکم دیا اور اپنی خشمگیں نظریں بخاری کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''سس...... سوری میم۔'' بخاری کے منہ سے اتنا ہی نکلا اور اس نے اپنی نظریں جھکا دیں وہ بہت شرمندگی محسوس کررہا تھا اتنا تو اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ حسین بلا اور کوئی نہیں جواد احمد کی اکلوتی بیٹی ہے جس کے حسن کے قصے وہ کئی ورکرز سے سن چکا تھا۔ مگر ملاقات اس حالت میں ہوگی وہ نہیں جانتا تھا۔ اب یہ نئی باس اس کے بارے میں پتہ نہیں کیا سوچے گی۔

کچھ ہی دیر میں آیا وہاں پہنچ گئی اس نے ٹیبل صاف کیا گلاس سیدھا کیا اور دوبارہ پانی سے بھر کر گلاس کو اس کے مخصوص کور سے ڈھک دیا۔

''میرا نام ہانیہ ہے اور میں جواد احمد یعنی آپ کے باس کی بیٹی ہوں آج سے کمپنی کا تمام چارج میں سنبھال لوں گی۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔'' ہانیہ نے آیا کے جانے کے بعد اس کے جھکے سر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا

تھا۔ لہجہ سپاٹ ہی تھا۔

''آ...... آئی ایم...... سوری میم...... آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' بخاری نے ایک دفعہ پھر سے سر اٹھایا مگر اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوبارہ پہلی پوزیشن میں آگیا۔

''مسٹر بخاری ریلیکس ہوکر بیٹھیں اتنی بڑی کمپنی کے ایمپلائی ہوکر آپ اس طرح نروس ہورہے ہیں۔'' ہانیہ نے ایک لمحہ کو اسے پہلو بدلتے دیکھا اور پھر گویا ہوئی۔ ''میں نے آپ کو اس لئے یہاں بلایا کہ سخاوت کے بیان کے مطابق پاپا کو آپ نے اسٹور روم میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور جب آپ دونوں وہاں پہنچے تو وہاں ان کی ڈیتھ ہوچکی تھی۔'' ہانیہ کی آواز ایک لمحے کو گھمبیر ہوئی مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''سخاوت کے کہنے کے مطابق وہ تو وہاں سے ڈر کر بھاگ آیا مگر آپ وہیں تھے۔ بتایئے آپ نے وہاں ایسا کیا دیکھا کہ آپ بے ہوش ہوگئے۔''

پھر بخاری نے تفصیل سے جو کچھ اس پر گزرا تھا بتادیا۔ مگر سر بدستور نیچے ہی تھا۔

''اچھا تو آپ کے کہنے کے مطابق وہاں آسیب جیسی کوئی چیز ہے۔ آئی کانٹ بی لیو دس۔'' ہانیہ نے بے یقینی سے کہا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں حقیقت یہی ہے میم۔ میں تو اس وقت کا تصور کرتے ہی کانپ جاتا ہوں جب میں نے اس تہہ خانے میں قدم رکھا تھا۔'' بخاری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین کیسے آئے مسٹر بخاری۔'' ہانیہ کی آواز میں جانے کیا تھا کہ بخاری کے سرتاپا سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ ''چوکیدار کے کہنے کے مطابق وہاں جو جاتا ہے زندہ واپس نہیں لوٹتا مگر آپ بخاری صاحب'' ہانیہ ایک لمحے کو رکی بخاری کو کچھ کچھ سمجھ آرہی تھی کہ اسے یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔ ''آپ نہ صرف وہاں پر صبح تک رہے بلکہ زندہ سلامت بھی واپس آئے۔ آپ کو آسیب نے کیوں نہیں کچھ کہا۔'' ہانیہ کی چبھتی نظریں بخاری کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''یہ تو اب وہ آسیب ہی بتا سکتا ہے کہ اس نے مجھے کیوں چھوڑا۔''

''ایک اچنبھے کی بات اور ہے مسٹر بخاری، پاپا ہمیشہ صبح کے وقت کمپنی میں آتے تھے اور وہ بھی چند منٹوں کے لئے مگر ایسی کیا مجبوری بنی کہ انہیں رات کے ایک بجے آنا پڑا۔'' ہانیہ کی نظریں ابھی تک بخاری کے جھکے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ''میم میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو خود حیران تھا کہ باس رات کے اس وقت کیا کررہے تھے۔'' بخاری نے تیزی سے کہا اور جیسے ہی چہرہ اوپر کیا اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے پھر سے سر جھکا لیا۔ نہ جانے ایسا کیا تھا کہ بخاری جب بھی اس حسن مجسم کو دیکھنے کی کوشش کرتا دل کی گدگدی شروع ہوجاتی اور وہ اپنے حواس چھوڑنے لگتا۔

''بہت شرمیلے ہیں آپ چہرہ اوپر کیجئے۔'' ہانیہ نے آخری فقرہ تحکمانہ لہجے میں کہا۔

بخاری نے جھٹ سے پہلے سر اٹھایا اور پھر اس کی حالت غیر ہونا شروع ہوگئی۔ اس کی قاتل نگاہوں سے بچنے کے لئے اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔

''یہاں وہاں کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں آپ سے مخاطب ہوں آپ کا دھیان میری طرف ہونا چاہئے۔'' ہانیہ نے اب کی بار زیادہ سختی سے کہا۔ بخاری کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کئے وہ حسن کی تپش سے پگھلا جارہا تھا مگر اس کی طرف دیکھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی کانوں کی لوئیں گرم ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر ہانیہ اس کی حالت سے محظوظ ہورہی تھی۔

''مسٹر بخاری آپ اتنا نروس کیوں ہورہے ہیں میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گی۔ مجھے باس نہیں دوست سمجھیں۔'' ہانیہ کو اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ ''آئندہ آپ کو نظروں میں نظر ڈال کر بات کرنا ہوگی۔

یہ پانی پیں اور جائیں آپ سے پھر بات کروں گی۔" ہانیہ نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ اپنی زندگی میں اسے بخاری جیسے شرمیلے نوجوان سے پہلی بار پالا پڑا تھا۔ پہلے تو اس نے بخاری کو تنگ کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس کی حالت دیکھ کر اسے ترس آ گیا تھا۔ بخاری نے بوکھلاہٹ میں گلاس اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس بار اس کا ہاتھ زوردار طریقے سے گلاس پر پڑا اور سارا پانی ہانیہ کے اوپر جا گرا۔

"سس..... سوری..... مم..... میم..... میں نے..... "جج..... جان بوجھ کے....."

"آپ جائیں اپنے روم میں۔" ہانیہ نے نرم لہجے میں کہا وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بخاری پھرتی سے اٹھا اور اتنی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا جیسے اسے ذرا سی دیر ہوگئی تو اسے پھانسی دے دی جائے گی۔

"رکو....." ہانیہ کی آواز پر اس کی سانس بھی رک گئی تھی مگر وہ مڑا نہیں۔ "آئندہ اگر ایسا کچھ ہوا تو تمہیں کہیں اور نوکری کرنی پڑے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔" ہانیہ نے اپنی آواز میں سختی کا عنصر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"یس میم۔" بخاری کے منہ سے اتنا ہی نکلا اور وہ دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے سائیڈ پر پڑے گلدان کو اس کی کہنی لگی اور وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔

"سس..... سوری....." بخاری نے نیچے بیٹھتے ہوئے بوکھلاہٹ میں گلدان کے ٹکڑے سمیٹنے کی کوشش کی۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔" ہانیہ کی چیختی ہوئی آواز سن کر بخاری نے نکلنے میں دیر نہیں لگائی اس کے جانے کے بعد ہانیہ اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر چند لمحے آنکھیں موندے رہی پھر اچانک اس کے حلق سے ایک مترنم قہقہہ بلند ہوا۔

"انٹرسٹنگ مین۔" ہانیہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور پھر سے سوچوں میں گم ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

بخاری شرمندگی کی وجہ سے اگلے دن کام پر نہیں گیا۔ دوسرے دن جب وہ اپنے آفس پہنچا تو اس کے سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ "آ بیل مجھے مار" کا ورد کرتا ہوا ہانیہ کے روم میں داخل ہوا۔ اب کی بار اس نے خود پر کافی کنٹرول کیا ہوا تھا۔ ہانیہ نے اسے بیٹھنے کو کہا اور وہ نہایت احتیاط سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"امید ہے اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی؟" ہانیہ نے نرم لہجے میں کہا۔

"جی میم۔" بخاری نے اس کی تنبیہ کے باوجود اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"میں نے آپ کو اس لئے یہاں بلایا ہے کہ میں آپ کے ساتھ خود اس تہہ خانے کا وزٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا!!!.....؟" بخاری تقریباً اچھل پڑا۔ "نہیں میم مجھے تو معاف ہی کیجئے میں وہاں دوبارہ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" بخاری کا چہرہ خوف سے زرد ہونے لگا۔

"یہ میرا حکم ہے۔" ہانیہ نے تحکمانہ آواز میں کہا۔

"اور جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو آپ کیوں ڈر رہے ہیں۔ میں لڑکی ہوتے ہوئے بھی نہیں ڈر رہی۔ بہت بزدل ہیں آپ۔" ہانیہ نے کچھ اس انداز میں کہا کہ بخاری نے تمام خوف و دہشت کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں چلیں۔"

"ابھی نہیں رات کے ایک بجے جب بقول تمہارے ان آسیب کی آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔" ہانیہ نے اسے اٹھتے دیکھا تو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک بجے کا سن کر بخاری کی حالت پتلی ہونے لگی۔

"کہیں آپ ڈر تو نہیں رہے۔" ہانیہ نے اس کی حالت دیکھ کر پوچھا۔

"نن..... نہیں..... نہیں۔ جب آپ نہیں ڈرتیں

تو میں کیوں ڈروں۔" بخاری نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں ملازمہ ٹی بیگ والے دو کپ ان کے سامنے رکھ کر باہر چلی گئی۔ ہانیہ کے کہنے پر بخاری نے کپ اٹھایا اور چائے پیتے ہوئے آنے والے خوفناک لمحات کا سامنا کرنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا بخاری اور ہانیہ اسٹور روم کے بڑے دروازے پر کھڑے تھے۔ بخاری اسے چابیاں لگاتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر کوئی چابی لگ کے نہیں دے رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اصل چابی تو اس کے پاس ہے۔ پہلے تو اس نے چپ رہنے کا سوچا کہ شاید چابی نہ لگنے سے وہ اپنا ارادہ بدل دے مگر پھر اس نے سوچا کہ آج ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے تو، اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور کوٹ کی ایک جیب سے اسے وہ چابی مل گئی۔ اس نے ہانیہ کو ایک طرف کرتے ہوئے تالے میں چابی لگائی اور کلک کی آواز سے تالا کھل گیا۔ ہانیہ نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "یہ چابی تمہارے پاس کیسے؟"

"پچھلی بار جب آپ کے ڈیڈی یہاں آئے تھے تو میں نے اس خیال سے چابی اڑا لی تھی کہ شاید پھر مجھے یہاں آنا پڑے۔ میں بھی اس تہہ خانے کا راز جاننے کے لئے بہت بے تاب تھا۔ مگر ڈیڈی کی موت کے بعد اس خیال کو دل سے نکال دیا۔" بخاری نے بھی سرگوشیانہ انداز میں کہا اور قفل کھول دیا۔ وہ اپنے ساتھ ٹارچ لانا نہ بھولا تھا۔ وہ دونوں ٹارچ کی روشنی میں اسٹور روم کی سیڑھیاں اترنے لگے۔

ادھر فاطمہ بخاری کا انتظار کر رہی تھی کہ بیٹھے بیٹھے اچانک جھپکی سی آ گئی۔ تھوڑی دیر کا خواب تھا مگر فاطمہ ایک چیخ مارتی ہوئی کرسی پر سیدھی ہو بیٹھی اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ بخاری کے بارے میں اس نے بہت برا خواب دیکھا تھا کچھ بھیانک سائے بخاری کے چاروں طرف گھیرا ڈالے کھڑے تھے ان میں سے ایک سایہ آگے بڑھا اور بخاری کو گردن سے پکڑ کر فضا میں بلند کر لیا۔ فاطمہ نے ایک پل کی بھی دیر نہ کی، سیف کھولی، ایک دراز میں رکھے نوٹوں کی گڈی اٹھائی اور اپنی چھڑی سنبھالتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئی۔ ان کا گھر روڈ کے بالکل قریب تھا جہاں رات دن ٹریفک چلتی رہتی تھی۔ اس نے ایک آٹو رکشہ کو ہاتھ دیا۔

"کہاں جانا ہے ماں جی۔" آٹو والے نے نیچے اتر کر سہارا دیتے ہوئے اس کو آٹو میں بیٹھایا۔

"فورتھ ایونیو شاہراہ قائداعظم شپ کمپنی کے گیٹ کے سامنے اتار دینا۔"

"ٹھیک ہے ماں جی۔" رکشے والے نے رکشہ شارٹ کیا اور منزل کی طرف گامزن ہوگیا۔

بخاری اور ہانیہ تہہ خانے میں اتر چکے تھے۔ بخاری نے مین سوئچ نیچے کیا تو تہہ خانہ روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔

"ایک بجنے میں تیس سیکنڈ رہ گئے ہیں تمہارے جھوٹ اور سچ کا ابھی پتہ چل جائے گا۔" ہانیہ نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔"

"ہاں اور اسی لئے میں تمہیں یہاں لے آئی ہوں۔ اگر ایک بجے تک تمہاری بات سچ نہ ہوئی تو یہ دیکھ رہے ہو۔" ہانیہ نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا پسٹل نکال لیا تھا۔ اس کا طرز تخاطب بھی بدل چکا تھا وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک درد بھری رونے کی آواز بلند ہوئی دونوں جیسے سکتے میں آ گئے اور پھر اس طرح کی بہت سی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ ان آوازوں میں اتنا درد تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ آہستہ آہستہ وہ آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کو لگ رہا تھا کہ اگر یہ آوازیں بند نہ ہوئیں تو ان کے دل کی دھڑکنیں ضرور بند ہو جائیں گی۔

بخاری تو اس ماحول سے پہلے بھی گزر چکا تھا اس کے باوجود وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہانیہ کی حالت اس سے زیادہ خراب تھی۔ اس کا سر جیسے سجدہ کی پوزیشن میں پڑا تھا اور اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسی ہوئی تھیں۔

اچانک بخاری کو اپنے پیچھے کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ پیچھے مڑتے ہی اس کی نظر ایک بڑے کنٹینر پر پڑی۔ جو گولائی میں تھا۔ ایسے کنٹینر عام طور پر پیٹرول کی ایک جگہ سے دوسری جگہ ترسیل کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ یا میونسپلٹی والے اور فائر بریگیڈ والے پانی کے ذخیرے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

ایسا لگتا تھا جیسے کنٹینر کے اندر کئی لوگ موجود ہیں جو آدھا دھکا کے ساتھ کنٹینر کو اندر سے پیٹ رہے ہوں۔ بخاری لاشعوری طور پر کنٹینر کی طرف دوڑا اس کی پچھلی سائیڈ پر ایک سیڑھی تھی جو کنٹینر کی چھت پر جا رہی تھی۔ بخاری سیڑھی پر قدم رکھتا ہوا چھت پر جا چڑھا۔ مگر کنٹینر کا دروازہ جو چھت پر ایک چوکھٹے کی صورت میں تھا پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔ اور ایک موٹا سا آدمی زور لگا کر اس میں سے نکل رہا تھا۔

اچانک شور تھم گیا۔ بخاری کی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا اٹھارہ انیس کے قریب ہیولے کنٹینر کی دیواروں سے نکل رہے تھے ان کے آر پار سب کچھ نظر آ رہا تھا مگر وہ ہوا کی طرح ادھر ادھر فضا میں چکرا رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر ان کے چہرے نظر آتے تھے۔ وہ سب نوجوان تھے۔

بخاری ابھی یہ سب دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے پچھلی بار کی طرح لمبے لمبے سانسوں کی آوازیں آنے لگ گئیں۔ جیسے کوئی شخص عالم نزع میں لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہو۔ اس نے گردن موڑ کر جب سامنے دیکھا تو وہی موٹا سا آدمی جو اب کنٹینر سے باہر نکل آیا تھا کھڑا تھا۔ اس کے تمام کپڑوں سے پیٹرول بہہ بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ وہ سارا کا سارا پیٹرول میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اسی طرح لال ہو رہی تھیں جیسے پیٹرول کی بنی ہوئی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ بخاری کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے سائے کو دیکھ کر بخاری سمجھ گیا کہ یہ وہی ہے جس کا سایہ پچھلی بار بے ہوش ہوتے ہوتے اس نے دیکھا تھا۔ وہ آج پھر انہی حالات سے دوچار تھا۔ پہلی بار تو خدا نے اسے بچا لیا مگر اب نہ جانے وہ آدمی اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ وہ آدمی اس کے سر پر آ کھڑا ہوا بخاری نے سیڑھی کو مضبوطی سے تامے ہوئے سر اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے پر پیٹرول کے چند چھینٹے پڑے۔ موٹے آدمی نے سر جھٹکا تھا اور اس کے بالوں سے پیٹرول کے قطرے ادھر ادھر گر رہے تھے۔ بخاری کا چہرہ دیکھتے ہی وہ پلٹا اور ایک چھلانگ لگا کر کنٹینر سے نیچے اتر گیا۔ اب وہ زمین پر کھڑا ہانیہ کو گھورے جا رہا تھا۔

''مار ڈالو ختم کر دو اسے'' بیک وقت کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہوا نما ہیولے چیخ چیخ کر پیٹرول میں سنے آدمی کو کہہ رہے تھے اور بے قراری میں ادھر سے ادھر چکرا رہے تھے۔ موٹے آدمی نے جیسے ہی اپنا پہلا قدم ہانیہ کی طرف بڑھایا، بخاری کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے سیڑھی پر قدم لگاتے ہوئے ایک لمبا جمپ لیا اور موٹے آدمی کے اوپر جا گرا۔ اس کے دونوں بازو موٹے کے گلے میں حمائل تھے۔ مگر اگلا لمحہ بخاری پر بہت بھاری پڑا جب موٹے نے کندھے کو ذرا سی جنبش دی تو بخاری اڑتا ہوا بحری جہاز کے ایک ڈھانچے پر جا پڑا۔ اس کے سر کے پیچھے کوئی چیز بڑی زور سے ٹکرائی تھی۔ بخاری نے اپنے چکراتے ذہن کو کنٹرول کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ موٹا آدمی خطرناک تیوروں سے آہستہ آہستہ ہانیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہانیہ اپنی جگہ خوف سے بت بنی ہوئی تھی۔ ہانیہ پر جیسے اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ خوف زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خطرناک آدمی کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور خوف سے اس کا منہ بھی کھلا ہوا تھا۔ بخاری نے سوچا کہ اگر اس وقت اس نے کچھ نہ کیا تو وہ ہانیہ کے ساتھ ساتھ اپنی جان بھی گنوا دے گا۔ اگر ہانیہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بخاری کب کا بھاگ گیا ہوتا۔ مگر یہ پیاری سی

لڑکی تو اس کی جان تھی۔ اسی لئے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج یا تو وہ دونوں اکٹھے یہاں سے نکلیں گے یا پھر دونوں اپنی جان دے دیں گے۔

وہ آدمی ہانیہ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اسی لمحے بخاری نے ایک لمبی جست لگائی اور اڑتا ہوا دونوں کے درمیان جا گرا۔ پھر وہ سیدھا ہوتے ہوئے دوزانو بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ جوڑ لئے۔

''خدا کے لئے اسے کچھ نہ کہو۔ میری جان لے لو مگر اس لڑکی کو چھوڑ دو۔'' بخاری تقریباً رو پڑا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ اس آدمی سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اس کی منت سماجت پر اتر آیا۔

موٹا آدمی سپاٹ چہرے سے دونوں کو تکے جا رہا تھا۔ ہانیہ بھی اس خوف کی کیفیت سے نکل آئی تی اور بخاری کا یہ روپ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''ختم کرو، دونوں کو ختم کر دو۔'' ہیولوں کی چیخ و پکار پھر سے شروع ہو گئی۔

''چپ کر جاؤ سب۔'' اچانک موٹے آدمی کی دھاڑتی ہوئی آواز سے تہہ خانے میں خاموشی چھا گئی۔ اب صرف بخاری اور ہانیہ کے دل کی دھڑکن یا اس موٹے کے لمبے لمبے سانس سنائی دے رہے تھے۔

''اس لڑکی کو تو میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا بخاری، اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو لوٹ جاؤ۔'' موٹے کی بات سن کر بخاری کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا۔

''تم میرا نام کیسے جانتے ہو اور کیوں اس معصوم لڑکی کو مارنے پر تلے ہوئے ہو۔''

''میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔'' موٹے کی آواز رک رک کے آ رہی تھی۔ جیسے وہ ایک جملہ کہہ کر سانس لینے کو رکا ہو۔ ''رہی اس لڑکی کو مارنے کی بات تو اس کی وجہ بتانے کا پابند نہیں ہوں میں۔ آخر بار کہہ رہا ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔ اس لڑکی کو تو ہر حال میں مرنا ہی ہے۔'' موٹے کا جملہ پورا ہوتے ہی ہانیہ رونے لگی۔

''اگر تم نے اس لڑکی کو مارنا ہی ہے تو پھر تمہیں پہلے مجھے مارنا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔'' بخاری کی بات کا موٹے پر کوئی اثر ہوا ہو یا نہ مگر ہانیہ کی ہچکیاں تھم گئی تھیں وہ حیران نظروں سے بخاری کو تکے جا رہی تھی۔ جو اس کے لئے موت کو گلے لگانے والا تھا۔

''مگر بخاری! یہ لڑکی چند لمحے پہلے تم پر پستول تانے ہوئے تھی۔ تم اسی کو بچاؤ گے۔''

موٹے کا چہرہ سپاٹ تھا مگر اس کی آواز سے تذبذب کا عنصر نمایاں تھا۔

''بے شک یہ مجھے مارنے والی تھی۔ مگر میں اس سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اپنی جان سے بھی زیادہ۔ بے شک اس کی شادی مجھ سے نہ ہو کیونکہ میں غریب ہوں مگر میں اس کو روزانہ ایک نظر دیکھ لوں گا میرے لئے یہ ہی کافی ہے۔ اگر تم نے اسے بلاوجہ مارنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آؤ پھر پہلے مجھے مارو۔'' بخاری نے اپنے دونوں بازو ہوا میں پھیلا دیئے تھے۔

''ٹھیک ہے اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو اس لئے تمہیں چھوڑ رہا تھا کہ شاید میرے کئے گئے گناہوں میں سے کچھ کم ہو سکیں۔'' اتنا کہہ کر موٹے آدمی نے بخاری کو گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی اور اس نے بخاری کے سر پر وار کیا۔ اس کا فولادی مکہ کھاتے ہی بخاری ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ اسی وقت تہہ خانے کی سیڑھیوں سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ موٹے نے بے ہوش بخاری کو ایک طرف اچھال دیا اب وہ ہانیہ کی طرف بڑھا۔ ہانیہ کبھی بخاری کی طرف اور کبھی موٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''تم نے بخاری کو مار دیا۔'' ہانیہ نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''نہیں اسے صرف بے ہوش کیا ہے مگر تمہیں ضرور ماروں گا۔'' موٹے نے مسکراتے ہوئے کہا اور جیسے ہی ہاتھ ہانیہ کی طرف بڑھایا گولی چلنے کی آواز آئی اور موٹے کے سینے کی طرف شگاف ہو گیا۔ مگر حیرانی کی

بات یہ تھی کہ موٹے کے چہرے پر ذرا بھی تکلیف کے آثار نہ تھے اس کا چہرہ پہلے کی طرح سپاٹ تھا اور اس کے زخم سے خون نکلنے کے بجائے پیٹرول آہستہ آہستہ باہر آرہا تھا۔ موٹے نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور جیسے ہی وہ مڑا سامنے کھڑی ہستی کو دیکھ کر پہلی بار اس کے سپاٹ چہرے پر حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات ظاہر ہوئے۔

چوکیدار سخاوت ہاتھ میں گن پکڑے فائر کی پوزیشن میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جبکہ جسم میں واضح لرزش نظر آرہی تھی مگر موٹے کی نظریں اس کے ساتھ کھڑی بوڑھی عورت پر ٹکی تھیں جس نے ہاتھ میں لاٹھی پکڑی ہوئی تھی جس کے سہارے وہ کھڑی تھی۔ موٹے کے جسم کے زخم سے بہتے پیٹرول کے ساتھ اس کے جسم کا حجم بھی گھٹتا جارہا تھا اور اس کے چہرے کے نقوش بھی پہلے ہوتے جارہے تھے۔

جب اس کے جسم سے پیٹرول کا اخراج بند ہوا تو فاطمہ کے چہرے پر شناسائی کی چمک ابھری۔ اس نے اپنا چشمہ آنکھوں پر درست کیا اور غور سے اسے دیکھا۔

''ریاض کیا یہ تم ہو۔'' فاطمہ کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ ادھر بخاری کو بھی ہوش آرہا تھا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھے کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔

''ہاں ماں میں تیرا گناہ گار بیٹا ریاض ہوں جو اب تک اپنے کیے گئے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔''

ریاض دوڑتا ہوا فاطمہ کی طرف بڑھا۔ مگر سخاوت کی گن سے نکلنے والی گولی نے اس کے سینے میں ایک اور سوراخ کردیا۔ فاطمہ ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئی مگر پھر اچانک ہی اس نے لاٹھی ایک طرف پھینکی اور دونوں ہاتھوں سے سخاوت کا چہرہ سرخ کرڈالا۔

بخاری اور ہانیہ بھی پریشانی سے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔

''چھوڑو ماں! میرے جیسے ماں کے نافرمان کا یہ ہی حشر ہونا چاہئے۔'' ریاض نے ماں کو بازو سے پکڑا اور اسے سخاوت سے دور لے گیا۔

فاطمہ نے اس کے جسم پر نظر ڈالی اور اپنے دوپٹے سے اس کا جسم صاف کرنے لگی۔ مگر جہاں سے وہ صاف کرتی اس کے جسم کے مساموں سے پھر سے پیٹرول کے قطرے نمودار رہے تھے۔

''میرا بچہ! کہاں تھا تو اب تک میں نے کتنی دعائیں کیں خدا سے کہ تجھے ایک بار مجھ سے ملادے تو نہیں جانتا۔ بخاری سے چھپ کر میں خدا کے حضور سجدے میں تیرے لوٹ آنے کی دعا کرتی تھی اور آج تو ملا بھی تو کس حال میں۔''

فاطمہ اسے گلے سے لگائے بلک بلک کررو رہی تھی۔

''آج مجھے معلوم ہوا کہ ماں واقعی اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہے۔ میں کتنا ناخلق ہوں اور میری ماں اتنا کچھ ہونے کے باوجود مجھے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔'' ریاض نے ماں کو زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے پیٹرول نما آنسو یا آنسو نما پیٹرول بہہ رہا تھا۔

''ارے تو میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔'' فاطمہ نے اسے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کیں اور پھر سے گویا ہوئی۔ ''میں نے تجھے نو ماہ پیٹ میں رکھا ہے اور جن تکلیفوں سے گزری مجھے اب بھی یاد ہیں۔ کسی ماں کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر اس پر ظلم کرے گا تو وہ اس کو مار نہیں دیتی نہ خود سے دور کرتی ہے۔''

''ماں مجھے معاف کردے۔ میں نے تم لوگوں پر بہت ظلم کیے ہیں۔ میں معافی کے لائق تو نہیں ہوں مگر سنا ہے کہ ماں اپنی اولاد کی بڑی سے بڑی خطا معاف کردیتی ہے۔'' ریاض گڑگڑاتا ہوا ماں کے قدموں میں گر پڑا۔

فاطمہ بھی نیچے بیٹھ گئی اور اس کا سر گود میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تجھے تیری ساری غلطیوں کو معاف کیا اور میری خدا سے دعا ہے کہ وہ بھی تجھے معاف کرے۔ میں تجھے دونوں جہاں میں بخشتی ہوں۔''

فاطمہ نے اس کا ماتھا چوما۔ ریاض کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر اچانک ہی اسے تشنج کے جھٹکے

لگنے شروع ہوگئے۔ اس کا جسم پھڑک رہا تھا۔ مگر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چسپاں ہوگئی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کا وجود ڈھیلا پڑگیا اور آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کی چھاپ سی لگ گئی تھی۔ فاطمہ اسے بانہوں میں بھینچے ہوئے تھی۔ مگر بخاری کو ماں کا یوں رونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اپنے پر کیے جانے والے ظلم اس کی ماں بھول سکتی تھی مگر بخاری نہیں۔ اس کے دل کے کسی کونے میں بخاری کے لئے جو نفرت تھی وہ اب بھی بے قرار تھی۔

اس نے ماں کے ہی کہنے پر ریاض کی لاش کو تہہ خانے سے باہر نکالا اور گھر لے گیا۔ ریاض کے مرتے ہی وہ ہیولے بھی غائب ہوگئے تھے۔ ہانیہ صبح ملنے کا کہہ کر گھر چلی گئی تھی۔ اس نے سخاوت کو سختی سے منع کردیا تھا کہ وہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ ریاض کو بخاری نے خود سپرد خاک کیا تھا۔ ایک لمحے کو اسے قبر میں ڈالتے بھائی کی محبت بیدار ہوئی تھی مگر پھر اس کے ظلم یاد کرکے اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ چند پڑوسیوں اور ہانیہ کے علاوہ کوئی تعزیت کرنے نہیں آیا تھا۔ کسی کو پتہ بھی تو نہیں تھا کہ جو مرا ہے وہ فاطمہ کا سگا بیٹا ہے۔ پرانے شہر میں ہوتے تو اور بات تھی۔

تین دن کے سوگ کے بعد بخاری پھر سے ڈیوٹی پر جانے لگا۔ پہلے دن ہی دوپہر کے وقت اسے ہانیہ نے اپنے آفس میں بلوالیا تھا۔

بخاری چیئر پر اپنی پرانی پوزیشن میں سر نیچے کیے بیٹھا تھا۔

''ہاں تو مسٹر بخاری کیا کیا بول رہے تھے میرے بارے میں تم، تہہ خانے میں اب میرے سامنے بول کے دکھاؤ۔'' ہانیہ نے کرخت آواز میں کہا۔ بخاری کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ سر نیچے کیے ہلکا ہلکا لرز رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آرہا تھا کہ اس نے بے وقوفوں کی طرح ہانیہ سے محبت کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر وہ اس خطرناک پچویشن میں ایسا نہ کہتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ ہانیہ کے سامنے بہت سُبکی محسوس کررہا تھا۔ اب نہ جانے اس کا کیا انجام ہونے والا تھا۔ جاب تو اسے کہیں بھی مل سکتی تھی مگر اس جیسی حسین باس نہیں۔ اور وہ اس سے دور ہونے کا تصور بھی کرتے ہوئے کانپ رہا تھا۔

''سس...... سوری...... میم۔'' بخاری کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

اتنے میں آفس کا دروازہ کھلا اور ملازمہ چائے رکھ کر باہر چلی گئی۔

''پیو'' ہانیہ نے جیسے حکم دیا۔ بخاری نے فوراً سے پہلے چائے اٹھائی اور اسی وقت اس کی نظر ہانیہ کے چہرے پر پڑی وہ اپنی قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے بغور دیکھ رہی تھی بخاری نے بوکھلائے ہوئے نظریں نیچی کیں اور اسی بوکھلاہٹ میں گرم گرم چائے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کپ سمیت پاؤں پر گری، وہ سسکاری لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہانیہ جو بہت محویت سے اسے دیکھے جارہی تھی اس کی اس حرکت پر ہانیہ کا فلک شگاف قہقہہ نکلا مگر زیادہ دیر وہ ہنس نہ سکی کیونکہ اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ بھی ہنستے ہنستے الٹا ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے تھوڑی سی چائے اس کے گھٹنے پر اور باقی فرش پر جاگری۔ اس کی بھی سسکاری نکلی۔ تھوڑی دیر وہ شلوار کو جھاڑتی رہی مگر پھر نہ رکنے والے قہقہے شروع ہوگئے۔ اب محویت سے دیکھنے کی باری بخاری کی تھی۔

ہنستے ہنستے جب ہانیہ کے پیٹ میں بل پڑنے لگے تو وہ بمشکل بولی۔ ''میں چینج کرکے آتی ہوں۔'' اور وہ ساتھ بنے واش روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوسرا ڈریس پہن کر آئی اور کرسی پر بیٹھتے ہی بولی۔

''مسٹر بخاری آپ اتنا بوکھلاتے کیوں ہیں؟''

اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ہنسی اب بھی ضبط کرنے کی کوشش میں ہے۔

بخاری نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اسے اپنی طرف محو دیکھ کر پھر نظریں جھکالیں۔

''اپنے بھائی ریاض کے سامنے تو بہت بڑی بڑی باتیں کررہے تھے کہ میں ہانیہ کو ایک نظر دیکھوں نہ تو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مرجاؤں۔'' ہانیہ نے تقریباً بخاری کی نقل اتاری۔

''مگر اب جناب کی آنکھ اٹھ ہی نہیں رہی۔ مسٹر بخاری آپ نے مجھے پرپوز کرکے بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' ہانیہ کی آواز یک دم اونچی ہوگئی۔ ''اور اس غلطی کی سزا بھی تمہیں بہت جلد ملے گی۔'' ہانیہ کی آواز سرد ہوگئی تھی۔ بخاری کا حلق خشک ہورہا تھا۔

''مجھے معاف کردیں آئندہ میں ایسا کچھ نہیں کہوں گا۔'' بخاری نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کہتے ہو سوری کبھی کہتے ہو معاف کردو۔ ان لفظوں کے علاوہ تمہیں کوئی بات آتی ہے کہ نہیں۔ تمہاری سزا میں نے سوچ لی ہے۔'' ہانیہ کی آواز میں ایک دم غصہ عود کر آیا۔

''تمہاری سزا یہ ہے کہ جس لڑکی سے نظر ملاتے ہو تم بوکھلا جاتے ہو۔ اب ساری زندگی اسی لڑکی کی نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں اور شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' ''ول یو میری می؟'' ہانیہ نے آخری جملہ مسکراتے ہوئے نرم انداز میں کہے۔

''اوہ ریئلی'' بخاری نے خوشی سے چہکتے ہوئے سر اٹھایا اور اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کردیں۔ جیسے اس کے چہرے پر جھوٹ سچ کرکھوج رہا ہو۔

''سو سیڈ۔'' ہانیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنی ٹیبل پر ٹکاتے تاسف بھرے انداز میں سر ہلانے لگی۔

''کیا ہوا میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا۔'' بخاری نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''نہیں ہابا! جس چیز کو تم میں دیکھ کر میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا۔ تمہیں پرپوز کرتے ہی تم میں سے وہ چیز غائب ہوگئی۔'' ہانیہ نے دکھ بھری آواز میں اکیٹنگ کی۔

''کون سی چیز۔'' بخاری نے تیزی سے پوچھا اور اپنے پر سے غائب ہونے والی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تمہاری بوکھلاہٹ۔'' ہانیہ نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ اور بخاری کا قہقہہ نکل گیا۔

''اب پاگلوں کی طرح ہنسنا چھوڑو اور تمام ورکرز کے لئے مٹھائی کا آرڈر کرو آج شام ہماری شادی ہے۔'' ہانیہ نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ بخاری کو تو جیسے پر لگ گئے۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔

''ابھی گیا میم۔'' وہ کہتے ہوئے عجلت میں اٹھا اور تیزی سے اس کی کہنی ٹیبل کے کنارے پڑے ٹیبل لیمپ کو لگی اور لیمپ زمین بوس ہوگیا۔ بخاری سر کھجاتے ہوئے ڈرے ڈرے انداز میں ہانیہ کو دیکھنے لگا۔ جو اسے کھا جانے والے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک پیٹ پر ہاتھ رکھے وہ دہری ہوتی چلی گئی اس کے بلند قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ بخاری سر پر ہاتھ پھیرتا مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

بخاری حجلۂ عروسی میں ہانیہ کے سامنے بیٹھا اسے تکے جارہا تھا۔ وہ اس وقت جنت سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ وہ چند منٹ بے خود ہوکر اسے تکتا رہا اور پھر بولا۔

''ایک بات تو بتاؤ ہانیہ۔''

''ہوں۔'' ہانیہ کے منہ سے صرف ہوں کی آواز نکلی۔

''کیا تم سچ مچ میری بوکھلاہٹ کی وجہ سے مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہوئی ہو۔''

''نہیں۔ تمہاری بوکھلاہٹ بھی مجھے اچھی لگی تھی مگر میں تم پر اس وقت فدا ہوئی تھی جب تم اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر مجھے بچانے کے لئے رکے تھے۔'' ہانیہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''میں اپنے بھائی کا احسان مند ہوں جس کی وجہ سے تم مجھے ملی، ورنہ پتہ نہیں تم جیسی خوب صورت لڑکی کس کا نصیب ہوتی۔'' بخاری کی بات منہ میں ہی تھی کہ کمرے میں دھواں سا اٹھا اور ایک شبیہ اختیار کرنے لگا۔

(فروری کے شمارے میں ایم اے راحت کی نئی قسط وار کہانی ''دشمن روحیں'' ضرور پڑھیں)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET